مجموعہ تحقیقات علمیہ

کلیہ جامعہ عثمانیہ

مجریہ
محمد عبد الرحمن خان
عبد الحق
سید عبد اللطیف

جلد دوم

من جانب
مجلس تحقیقات علمیہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن
سنہ ۱۹۳۴ ع

فہرست مضامین

(۱) پیش نامہ منجانب صدر کلیہ (الف)

(۲) فہرست ارکان مجلس تحقیقات کلیہ (ج)

(۳) سیف الدولہ حمدانی ۱

از محمد جمیل الرحمن مددگار پروفیسر تاریخ

(۴) اردو مرثیوں کے ابتدائی گہوارے ۴۹

از سید محی الدین قادری مددگار پروفیسر اردو

(۵) خبر رویتہ الہلال ۷۶

از محمد عبد القدیر صدیقی صدر شعبۂ دینیات

(۶) ہندوستان میں مغلوں کا قانونی نظم و نسق ۸۴

از ابن حسن مددگار پروفیسر تاریخ

(۷) اردو شاعری میں ایہام گوئی ۱۰۹

از عبد الحق صدر شعبۂ اردو

مجلس تحقیقات علمیہ (ریسرچ بورڈ) کلیہ جامعہ عثمانیہ

صدر نشین

پرنسپل محمد عبدالرحمن خان بی، اے (مدراس) اے، ار، سی یس-بی، یس سی (لندن)
ایف، ار، اے، یس

متعمد اعزازی

پروفیسر سید عبداللطیف۔ پی ایچ، ڈی (لندن)

اراکین

پروفیسر قاضی محمد حسین یم، اے۔ ال ال، بی (کیمبرج) بار، اٹ، لا
,, مرزا حسین علی خان بی، اے (اکسن) بار، اٹ، لا
,, مولوی عبدالحق بی، اے
,, هارون خان شروانی یم، اے (اکسن) بار، اٹ، لا
,, رائے کشن چند یم، اے (کیمبرج)
,, مظفر الدین قریشی یم، اے (پنجاب) پی ایچ، ڈی (برلن)
,, محمد عبدالقدیر صدیقی مولوی فاضل
,, حسین علی مرزا بار، اٹ، لا
,, محمد نظام الدین پی ایچ، ڈی (کیمبرج)
,, عبدالحق بی، لٹ، ڈی، فل (اکسن)
,, وحید الرحمن بی یس، سی (کلکته)
,, خلیفه عبدالحکیم یم، اے (پنجاب) پی ایچ، ڈی (هیڈل برگ)
,, سید حسین یم، یس سی (علیگ) پی ایچ، ڈی (لندن)
,, میر سیادت علی خان یم، اے۔ ال، ال، بی (عثمانیه) بی،سی، ال، بار، اٹ، لا۔ ڈی فل (اکسن)

پروفیسر آر سبا راؤ

،، ٹی۔ آر۔ راما راؤ بی، اے (مدراس)

،، سید جعفر حسن پی ایچ، ڈی (ہیڈل برگ)

،، سی، ین جوشی یم، اے (بمبئی)

،، میر ولی الدین یم۔ اے (علیگ) پی ایچ۔ ڈی (لندن) بار۔ اٹ۔ لا

،، یوسف حسن خان ڈی لٹ (پیرس)

،، سید محمد علی خان بی۔ اے (عثمانیہ) اے۔ ار۔ سی۔ یس۔ بی۔ ایس۔ سی (لندن)

،، محمد رضی الدین صدیقی۔ یم۔ اے (کیمبرج) پی ایچ۔ ڈی (لائپ زگ)

،، قاری سید کلیم اللہ حسینی۔ یم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ) پی ایچ۔ ڈی (لندن)

،، ظہیر الدین احمد ڈاکٹر ز ڈیپلوما (قاہرہ)

،، سید غلام محی الدین۔ یم۔ اے (عثمانیہ) پی ایچ۔ ڈی (لندن)

،، ابن حسن۔ یم۔ اے (الہ آباد) پی۔ ایچ ڈی (لندن)

،، محمد سعید الدین۔ بی۔ یس سی (بمبئی) یم۔ اے (اڈنبرا)

،، بی۔ کے داس۔ ڈی۔ یس سی (لندن)

مطبوعہ یقین پریس گنشمہ روڈ حیدرآباد دکن
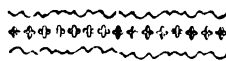
سیف الدولہ حمدانی

از

جناب محمد جمیل الرحمن صاحب۔ ایم اے۔ پروفیسر۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ

کان بنو حمدان ملوکا و امراء اوجههم للصباحة والسنتهم للفصاحة و ایدیهم للسماحة و عقولهم للرجاحة ؛ و سیف الدولة مشهور بسیادتهم ، و واسطة قلادتهم ؛ و کان رضی الله عنه و ارضاه و جعل الجنة ماواه : غرة الزمان وعماد الاسلام ، و من به سداد الثغور و سداد الامور ؛ وکانت وقائعه فی عصاة العرب یکفف باسها و تفل انیابها وتذل صعابها و تکفی الرعیة سوء آدابها ؛ وغزواته تدرك من طاغیة الناس و تحسم شر النار و تحس فی الاسلام الآثار ؛ و حضرته مقصد الوفود و مطلع الجود ؛ و قبلة الآمال و محط الرحال ، و موسم الادباء و حلبة الشعراء [۱] ۔

(۱)

خلفاء عباسیہ ایرانیوں ، خصوصاً خراسانیوں کو اپنا سب سے بڑا مددگار سمجھتے تھے ، اور شروع سے ہی ان کی حکمت عملی یہ رہی تھی کہ جہاں تک ہو سکے عربوں کو بے دخل کرکے ایرانیوں کو دربار میں ، اور دوسری ملازمتوں میں زیادہ جگہ دی جائے ۔ مگر عربوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہی قوم جسے چند سال قبل وہ اس قدر ذلیل و خوار سمجھتے تھے ، اب ان پر حاوی ہو جائے اور وہ اپنی برتری قائم رکھنے کی کوئی کوشش نہ کریں ۔ یہی وجہ تھی کہ شروع سے ہی بنی عباس کا دربار عربوں اور ایرانیوں کی سیاسی جنگ کا اکھاڑا بن گیا تھا ۔ مگر عربوں کی کوششیں بارآور نہ ہوئیں ۔

---

[۱] ثعالبی : یتیمۃ الدہر ۔ مطبوعہ دمشق ۔ ج ا ۔ ص ۹ ۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں عجمی اثرات حد کو پہنچ گئے تھے ، اور برامکہ نہ صرف دربار خلافت بلکہ خود خلیفہ پر بھی حاوی ہوگئے تھے - اب عربوں کی طرف سے اس خاندان وزارت کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں - عرب اتنے کامیاب ضرور ہوئے کہ سنہ ۱۸۷ (سنہ ۸۰۲) میں برامکہ بالکل تباہ کردئے گئے - مگر یہ کامیابی محض وقتی ثابت ہوئی - ہارون الرشید کی وفات کے بعد جب امین و مامون میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ایرانیوں کے جوڑ توڑ کا عرب مقابلہ نہ کرسکے - امین کا قتل اور مامون کی خلافت درحقیقت عربوں کی آخری شکست تھی - اس کے بعد عرب سیاسیات سے تقریباً بالکل کنارہ کش ہوگئے ، اور ایرانیوں کے لئے میدان صاف ہوگیا - اب عجمیت نے اپنا رنگ جمایا ، اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلیفہ مامون کے عہد میں ہی طاہریہ خراسان میں تقریباً خود مختار ہوچکے تھے -

مامون کے جانشین ، معتصم ، کو ایرانیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خطرہ کا احساس ہوا - اس وقت دوبارہ عربوں کو ایرانیوں کا مد مقابل بنانا امکان سے باہر تھا - اس لئے معتصم نے وسط ایشیا کے ترکوں کی فوج بھرتی کرنی شروع کی ، اور یہ چاہا کہ اس نئی فوج کو طرح طرح کی مراعات دے کر بالکل اپنا کر لے ، تاکہ آنے والے خلفاء ان پر پورا بھروسہ کرسکیں ، اور ان کے ذریعہ سے ایرانیوں کا زور حتی الامکان توڑا جاسکے - مگر یہی مراعات خلفاء کے لئے زہر ثابت ہوئیں - ترکی فوج رفتہ رفتہ خود سر ہوتی گئی - آخر خلیفہ متوکل کو قتل کرکے یہی ترک ، جن پر معتصم کو اتنا بھروسہ تھا ، خلافت پر پوری طرح حاوی ہوگئے اور خلفاء ان کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن گئے -

ایک طرف تو دربار خلافت ترکوں کے قبضہ میں تھا ، اور ترک امراء خلیفہ کو بنا اور بگاڑ سکتے تھے ، دوسری طرف ایرانی برابر اپنے کام میں مشغول تھے - جابجا ان کے حکمراں خاندان قائم ہوتے جارہے تھے ، جو اپنے آپ کو خلیفہ کا مطیع اور نائب ظاہر کرتے تھے ، مگر درحقیقت بالکل خود مختار تھے - ترکوں میں بظاہر سلطنت قائم کرنے کی صلاحیت نہ تھی ، مگر باوجود اس کے وہ بھی بعض علاقوں پر قابض تھے - دربار خلافت تو بالکل انہیں لوگوں کے قبضے میں تھا ، جہاں اپنی سازشوں سے یہ برابر خلیفہ کے اقتدار کو نقصان پہنچا رہے تھے -

تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں خلافت کے مشرقی علاقوں کی یہ حالت تھی کہ طاہریہ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے ، اور بالآخر سنہ ۲۵۹ (سنہ ۸۷۲) میں صفاریہ کے ہاتھوں برباد ہوئے ۔ مگر صفاریہ بھی زیادہ مدت تک باقی نہ رہے ، اور سنہ ۲۸۷ (سنہ ۹۰۰) میں سامانیوں نے عمرو بن لیث کو شکست دے کر صفاریہ کا خاتمہ کر دیا ۔ اب آل سامان مشرق میں سب سے بڑی سلطنت کے مالک تھے ، جس کے حدود ماوراءالنہر سے گذر کر ایران کے ایک بڑے حصے تک پہنچ گئے تھے ۔ صرف عراق خلفاء کے قبضے میں رہ گیا تھا اور خلفیہ پر ترک حاوی تھے ۔ مصر ایک ترک امیر ، احمد بن طولون ، کے قبضے میں تھا ۔ مگر طولونیہ کا اقتدار بھی نقش بر آب ثابت ہوا ، اور سنہ ۳۲۳ (۹۳۴) میں اخشیدی ان کے جانشین ہوئے ۔

جب سیاسی حالات ایسے ہوں تو ظاہر ہے کہ ہر منچلا شخص ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے ، اور اگر کامیاب ہوجائے تو ایک مستقل سلطنت قائم کرلیتا ہے ، جو اس کے جانشینوں کی قابلیت اور حالات وقت کے لحاظ سے زیادہ یا تھوڑی مدت تک باقی رہتی ہے ، اور پھر اس کا نشان صفحہ عالم سے مٹ جاتا ہے ۔ اسی قسم کا ایک شخص حمدان بن حمدون ہے ۔ اس کا تعلق عربوں کے عظیم الشان قبیلہ تغلب سے تھا ۔ اس کی نقل و حرکت کا ابتدائی میدان موصل اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ہے ، اور موصل ہی اس کی اولاد کی حکومت کا صدر مقام قرار پایا ۔ بنی عباس کے عہد انحطاط میں جتنے خودمختار یا نیم مختار حکمران خاندان انشاء میں ظاہر ہوئے ان میں اگر صرف عربوں کو لیا جائے ، تو سب سے زیادہ مقتدر بنی حمدان تھے ، اور انہیں اپنے عرب ہونے پر فخر تھا ۔

حمدان بن حمدون کے ابتدائی حالات تفصیل سے نہیں ملتے ۔ سب سے پہلے اس کا نام سنہ ۲۷۲ (سنہ ۸۸۵) میں سنا جاتا ہے ۔ یہ خلیفہ معتمد کا آخری عہد تھا ، اور اس زمانے میں ہارون الشاری نامی ایک خارجی موصل کے گرد و نواح میں اپنی فوج لئے گشت لگا رہا تھا ۔ حمدان بن حمدون اس کے ساتھ تھا ۔ ان دونوں نے انجام کار موصل پر قبضہ کرلیا ، مگر بنی شیبان کے مقابلہ میں شکست کھائی ، اور شہر خالی کرنا پڑا ۔ اس کے سات سال بعد سنہ ۲۷۹ (سنہ ۸۹۲) میں ہم حمدان اور ہارون خارجی کو موصل کے مطوعہ کے ساتھ بنی شیبان کے خلاف برسر پیکار پاتے ہیں جس میں آخر ان حلیفوں

کو شکست ہوئی ، اور وہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگے ۔ اسی سال معتمد کے انتقال پر اس کا بھتیجا معتضد خلیفہ ہوا ، جسے بجا طور پر بنی عباس کا دوسرا بانی کہا جاتا ہے ۔

معتضد نے خلیفہ ہوتے ہی کوشش کی کہ خلافت کو مفسدوں اور باغیوں سے پاک کر دے ۔ سنہ ۲۸۱ (سنہ ۸۹۴) میں اس نے موصل کا رخ کیا ۔ اس کا اصلی مقصد قلعہ ماردین کی فتح تھا ، جس پر حمدان بن حمدون قابض تھا ۔ حمدان نے خلیفہ کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ دیکھی ۔ وہ خود تو بھاگ گیا ، مگر قلعہ اپنے بیٹے حسین کے سپرد کر گیا ۔ حسین نے بہت جلد اسے معتضد کے حوالہ کر دیا ۔ اس کامیابی کے بعد خلیفہ نے حمدان کا تعقب کیا ، اور آخر اسے گرفتار کر لیا ۔ خلیفہ نے اس کا قصور معاف کر دیا ۔ مگر سنہ ۲۸۲ (سنہ ۸۹۵) میں حمدان نے دوبارہ اطاعت سے انحراف کیا ۔ خلیفہ کی فوج نے اس پر چڑھائی کی ۔ حسین نے اس مرتبہ پھر دیر زعفران خلیفہ کے حوالے کر کے خلاصی حاصل کی ۔ اب حمدان کی تلاش ہوی ، اور آخر وہ گرفتار ہوا ۔ اسے سنہ ۲۸۳ (سنہ ۸۹۶) تک قید رکھا گیا ، اور پھر معاف کر دیا گیا ۔ سنہ ۲۸۳ (سنہ ۸۹۶) میں هارون قتل ہوا ، اور حمدان کو بے ضرر سمجھ کر آزاد کر دیا گیا ۔

•

سنہ ۲۸۹ (۹۰۱) میں خلیفہ معتضد نے انتقال کیا ۔ تاریخ سنہ ۲۹۳ (۹۰۱) تک بنی حمدان کے متعلق بالکل خاموش ہے ۔ سنہ ۲۹۳ میں خلیفہ معتضد کے بیٹے اور جانشین مکتفی نے ابوالھیجا عبداللہ بن حمدان کو موصل اور اس کے اعمال کا حاکم مقرر کیا ۔ سنہ ۲۹۴ (سنہ ۹۰۶) میں اس نے خلیفہ کی فوج کی مدد سے موصل کے کردوں کو شکست دے کر اس علاقے میں پورا امن قائم کیا ۔ یہ گویا بنی حمدان کے عروج کا آغاز تھا ۔ سنہ ۲۹۵ (۹۰۷) خلیفہ مکتفی کا انتقال ہوا ، اور مقتدر اس کا جانشین بنا ۔ مگر مقتدر کی جانشینی بغداد میں ایک انقلاب کا پیش خیمہ تھی ۔ دربار خلافت کے چند امراء عبداللہ بن معتز کے ہمدرد تھے ، اور مقتدر کی جگہ اسے خلیفہ بنانا چاہتے ۔ حسین بن حمدان انھیں لوگوں میں شامل تھا ۔ بغداد میں شورش ہوئی ، اور عبداللہ بن معتز کو خلیفہ بنادیا گیا ۔ مگر آخر یہ انقلاب ناکام رہا ۔ صرف ایک دن کی خلافت کے بعد عبداللہ معزول ہوا ، اور مقتدر کو دوبارہ خلیفہ بنادیا گیا ۔ حسین راتوں رات بغداد سے بھاگا ۔ مقتدر نے اس کے تعقب میں فوجیں بھیجیں ۔ آخر وہ اپنے بھائی ، ابوالھیجا عبداللہ ، کی مدد سے گرفتار ہوا ۔ مگر ایک دوسرے بھائی ، ابراھیم ، کی سفارش ، پر نہ صرف اس کی خطا معاف ہوئی ، بلکہ اسے قم اور کاشان

کا والی مقرر کیا گیا۔ سنہ ۲۹۷ (سنہ ۹۰۹) میں حسین نے لیث بن علی بن لیث الصفار کی بغاوت فرو کرنے میں مونس المظفر کو مدد دی۔ سنہ ۳۰۱ (سنہ ۹۱۳) میں ابو الهیجا کو موصل کے معزول کیا گیا۔ اب اس نے بغاوت کی۔ مگر جب مونس المظفر کا سامنا ہوا تو فوراً اطاعت قبول کر کے بغداد حاضر ہوگیا۔ خلیفہ نے خلعت بخش کر اس کی عزت افزائی کی اور سنہ ۳۰۲ (سنہ ۹۱۴) میں اسے دوبارہ موصل کا حاکم مقرر کر دیا۔ سنہ ۳۰۳ (سنہ ۹۱۵) میں وزیر، علی بن عیسٰے، نے حسین بن حمدان سے حساب کا مطالبہ کیا۔ اس پر اس نے فوراً بغاوت کر دی، مگر شکست کھا کر گرفتار ہوا، اور بغداد میں قید کیا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مقتدر نے ابو الهیجا اور اس کے دوسرے بھائیوں کو بھی قید کر دیا۔ مگر دو برس بعد پھر ان سب کو رہا کر دیا گیا۔ سنہ ۳۰۶ (سنہ ۹۱۸) میں حسین کو فوج دے کر یوسف ابن ابی الساج کے خلاف بھیجا گیا۔ معرکہ میں حسین کام آیا۔ سنہ ۳۰۸ (سنہ ۹۲۰) میں ابو الهیجا اور اس کے دو بھائیوں ابو العلاء اور ابو السرایا کی پھر عزت افزائی ہوئی، اور ابو الهیجا کو موصل کا والی مقرر کیا گیا۔ سنہ ۳۱۴ (سنہ ۹۲۶) میں کردوں نے اس کے خلاف بغاوت کی، مگر کامیاب نہ ہوے۔ اسی سال ابو الهیجا کے اقتدار میں اور اضافہ ہوا، اور موصل کا خراج اور ضیاع بھی اسی کی نگرانی میں دے دیے گئے۔ اس کے ایک سال بعد ابو الهیجا نے مونس المظفر کو قرامطہ کے فساد کے انسداد میں مدد دی۔

سنہ ۳۱۷ (سنہ ۹۲۹) میں بغداد پھر ایک انقلاب کا میدان بنا۔ مقتدر دوسری مرتبہ معزول کیا گیا، اور اس کا بھائی قاہر اس کا جانشین ہوا۔ ابو الهیجا بھی اس شورش میں شریک تھا، اور مقتدر کے تمام گزشتہ احسانات کو فراموش کر کے قاہر کا ہمدرد بن گیا تھا۔ یہ انقلاب بھی پہلے کی طرح ناکام رہا، اور مقتدر چند روز کے بعد پھر خلیفہ ہوگیا۔ اسی شورش میں ابو الهیجا قتل ہوا۔ مگر موت سے پہلے وہ موصل میں اپنی حکومت اتنی مستحکم کر چکا تھا کہ اس کی موت کا کوئی برا اثر اس کے خاندان پر نہیں پڑا۔ مقتدر نے اس کے بیٹے حسن کو، جو تاریخ میں ناصر الدولہ کے نام سے مشہور ہے، ابو الهیجا کے تمام علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا۔ سنہ ۳۱۸ (سنہ ۹۳۰) میں حسن کی جگہ اس کے چچا سعید اور نصر موصل کے حاکم بنائے گئے، اور حسن کو دیار ربیعہ، نصیبین، سنجار، خابور، رأس عین، اور دیار بکر میں سے میافارقین اور ارزن کا والی مقرر کیا گیا۔

سنہ ۳۲۱ (سنہ۹۳۳) میں مشرق میں ایک نیا حکمران خاندان ظاہر ہوا - یہ دیلم کے رہنے والے بنی بویہ تھے - انہوں نے نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کی، اور صرف تیرہ برس کے مختصر زمانہ میں ان کے سلطان معزالدولہ بن بویہ نے بغداد پر قبضہ کر کے خلیفہ مستکفی پر قابو حاصل کر لیا -

اس اثناء میں خلیفہ مقتدر اپنے سپہ سالار مونس المظفر کے خلاف لڑتا ہوا سنہ ۳۲۰ (سنہ۹۳۳) میں قتل ہوا - مقتدر بنی عباس کا آخری خلیفہ تھا جس کے عہد میں خود مختاری کے آثار پائے جاتے تھے، جو وزراء مقرر کرتا تھا، اور جس کا دربار گذشتہ خلفاء کی طرح پرشکوہ ہوتا تھا - اس کے بعد قاہر، راضی، اور متقی نہایت کمزور خلیفہ تھے، اور ان کا دربار تین ترک امراء محمد بن رائق، بریدی اور بجکم کے فساد وعناد کا میدان تھا - یہ فساد اس وقت ختم ہوا جب سنہ۳۳۳ (سنہ۹۴۴) میں معزالدولہ بن بویہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا - ان درباری جھگڑوں میں ابوالھیجا کے بیٹوں ابومحمدحسن الملقب بہ ناصرالدولہ اور ابوالحسن علی الملقب بہ سیف الدولہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا اور یہیں سے ان کی شہرت شروع ہوئی -[۱]

(۲)

ابوالھیجا عبداللہ بن حمدان کا دوسرا بیٹا علی، اتوار کے دن ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۳۰۳ (جون (سنہ ۹۱۶) کو یا ایک روایت کے مطابق سنہ ۳۰۱ ھجری [۲] میں بمقام موصل پیدا ہوا - اس وقت ابوالھیجا موصل کا حاکم تھا - علی کی زندگی کے ابتدائی حالات بالکل معلوم نہیں، اور نہ اس کا علم ہے کہ اس نے کس عمر میں سیاسی اور فوجی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا - بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں وہ اپنے بھائی حسن کے احکام کی تعمیل کرتا تھا - سب سے پہلے اس کا نام سنہ ۳۲۴ (سنہ ۹۳۶) کے آخر میں سننے میں آتا ہے - اس سال اسے دمستق [۳] کے خلاف بھیجا گیا تھا، جو ایک یونانی فوج لئے آمد اور سمیساط پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا - علی کو دمستق کے

---

[۱] بنی حمدان کے ابتدائی حالات ابن اثیر - ج ۷، ۸ سے ماخوذ ہیں - [۲] ابن خلکان - ج ۱ - ص ۳۶۶ - ابن تغری بردی - ج ۲ - ص ۱۹۷ - [۳] Domesticus - ایشیاء میں بازنطینی سپہ سالار کا لقب تھا -

مقابلے میں چند لڑائیاں پیش آئیں جن میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو کیونکہ انجام کار دمستق نے سمیساط پر قبضہ کر لیا تھا [۱]۔

بہرکیف سنہ۳۲۴ (سنہ۹۳۶) سے سنہ۳۳۳ (سنہ۹۴۴) تک جب علی نے شام کا علاقہ فتح کیا، اس کی زندگی زیادہ تر، اپنے بھائی حسن کو مدد دینے میں گزری۔ حسن دربار خلافت کے تمام جھگڑوں اور سازشوں میں شریک تھا، اور آسے اکثر علی کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ پھر بھی سنہ۳۲۹ (سنہ ۹۴۰) تک علی کا نام تاریخ میں نہیں آتا۔ ۲۲۔ یا ۲۳۔ رجب سنہ ۳۲۹ کو ترک امیر، بجکم، جو خلافت پر اتنا حاوی ہو گیا تھا کہ اسی کے حکم سے متقی کو خلافت نصیب ہوئی تھی۔ [۲] بصرہ کے قریب شکار کھیلتا ہوا ایک کرد کے ہاتھوں قتل ہوا [۳]۔ لیکن اس کے بعد بریدی نے بغداد پر قبضہ کر کے وہاں وہ مظالم کئے کہ خدا کی پناہ۔ آخر خلیفہ متقی اپنے دو بیٹوں اور ایک امیر، محمد بن رائق، کو لے کر بغداد سے نکلا۔ خلیفہ نے حسن کو مدد کے لئے لکھا، اور حسن نے اپنے بھائی علی کو خلیفہ کے پاس بھیجا [۴]۔ ان دونوں کی ملاقات تکریت میں ہوئی، اور اب خلیفہ کے قافلے نے موصل کا رخ کیا۔ ادھر جب حسن کو ان کے موصل کی طرف بڑھنے کا حال معلوم ہوا تو وہ وہاں سے نکل کر معلثایا چلا گیا، اور جب تک ابن رائق نے امان کا پورا عہد و پیمان نہ کر لیا واپس نہ آیا۔ اس پر بھی اس نے یہ احتیاط کی کہ موصل کے قریب دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر ٹھہر گیا۔ ۲۰ رجب سنہ ۳۳۰ کو خلیفہ متقی کا بیٹا، امیر ابو منصور، اور ابن رائق، حسن سے ملنے کے لئے آئے۔ جب واپس جانے لگے تو ابو منصور تو سوار ہو گیا۔ مگر حسن نے ابن رائق کو روکنا چاہا۔ ابن رائق نے عذر کیا۔ اور کسی اور دن آنے کا وعدہ کیا۔ باتوں کے دوران میں ابن رائق کا ایک پیر رکاب میں تھا۔ حسن نے زیادہ اصرار کیا اور اس کی آستین پکڑ کر کھینچی۔

---

[۱] ابن تغری بردی۔ ج ۲۔ ص ۲۷۸ — [۲] ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۲۹ —
[۳] ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۔ ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۲۹ — [۴] یہ ابن اثیر (ج ۸۔ ص ۱۳۵) کا بیان ہے۔ ابن مسکویہ (ج ۲۔ ص ۲۷) لکھتا ہے کہ ابن رائق نے حسن سے مدد مانگی تھی، اور اس نے علی کو بھیجا تھا۔

ابن رائق کا پیر پھسلا۔ گھوڑا بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ابن رائق وھیں گر گیا۔ حسن نے اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ جنہوں نے موقع پر پہنچ کر ابن رائق کا کام تمام کر دیا۔[۱]۔

ابن رائق کے قتل نے حسن کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ خلیفہ متقی نے خوش ہو کر یکم شعبان سنہ ۳۳۰ (سنہ ۹۴۰) کو ابو محمد حسن کو ناصر الدولہ کا، اور اس کے بھائی ابو الحسن علی کو سیف الدولہ کا خطاب دے کر ناصر الدولہ کو امیر الامراء بنادیا[۲]۔ دوسری طرف اخشید،[۳] حاکم مصر، دمشق پہنچا۔ شام کا علاقہ ابن رائق کے قبضے میں تھا، اور اس کی طرف سے محمد بن یزداد وھاں کا حاکم تھا[۴]۔ مگر محمد نے اپنی بہتری اس میں دیکھی کہ دمشق اخشید کے حوالے کر دے۔ اس طرح شام اخشید کے قبضے میں آ گیا[۵]۔ یہی اخشید شام میں سیف الدولہ کا مد مقابل تھا۔

ناصر الدولہ کی کامیابی کی خبر سن کر، بریدی بغداد سے بھاگا۔ ادھر خلیفہ متقی ناصر الدولہ، سیف الدولہ اور فوج کو ھمراہ لے کر بغداد پہنچا ھی تھا کہ معلوم ھوا کہ بریدی نے واسط سے پھر بغداد کا رخ کیا ھے[۶]۔ بریدی کے متعلق اھل بغداد کا تجربہ اس قدر تلخ تھا کہ وہ اس خبر سے سخت گھبرائے۔ خلیفہ نے بنظر حفاظت اپنے حرم کو سر من رائے بھیج دیا، اور خود ناصر الدولہ کے پاس چلا گیا[۷]۔ سیف الدولہ کی سرکردگی میں ایک فوج بریدی کے مقابلے کے لئے بھیجی گئی۔ مدائن سے دو فرسخ کے فاصلہ پر کیل میں فریقین کا مقابلہ سنہ ۳۳۰ (سنہ ۹۴۰) میں ذی القعدہ کی آخری تاریخ کو ھوا۔ جنگ چار روز تک جاری رھی۔ آخر سیف الدولہ نے شکست کھائی اور مدائن میں پناہ لی۔ یہاں ناصر الدولہ بھی موجود تھا۔ اس نے تازہ دم فوج دے کر سیف الدولہ کو دوبارہ بھیجا۔

---

[۱] ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۳۵ — [۲] ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۲۸۔ ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۳۵ — [۳] ابوبکر محمد بن ابی محمد طغج بن جف، حاکم مصر، جسے خلیفہ راضی نے اخشید، یعنی ملک الملوک کا خطاب دیا تھا۔ ابن خلکان۔ ج ۲۔ ص ۴۱، الخ —

[۴] یہ ابن اثیر (ج ۸۔ ص ۱۳۵) کا بیان ھے۔ لیکن زبدۃ الحلب (ص ۷۰) میں ھے کہ محمد بن یزداد حلب کا حاکم تھا نہ کہ دمشق کا۔ [۵] ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۳۵ —

[۶] ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۲۹ — [۷] ایضاً۔ ابن اثیر نے اس کا ذکر نہیں کیا —

اس مرتبہ بریدی کو شکست ہوئی، اور اس کے سر بر آوردہ آدمی گرفتار ہوئے۔ مگر سیف الدولہ کی فوج بھی اسقدر مجروح تھی کہ بریدی کا تعقب نہ کرسکی، اور وہ واسط واپس چلا گیا [۱]۔ چند روز آرام لینے کے بعد سیف الدولہ نے بریدی کا تعقب کرنا چاہا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ بصرہ میں ھے۔ اس لئے سیف الدولہ واسط میں ھی ٹھہر گیا۔

سیف الدولہ کا ارادہ واسط میں قیام کرنے کا نہ تھا، بلکہ وہ بریدی کے تعقب میں بصرہ جانا چاھتا تھا، اور ناصرالدولہ کے پاس سے مالی امداد کا منتظر تھا۔ اس میں دیر ہوئی، اور اس کے نتائج سیف الدولہ کے لئے برے نکلے۔ ترک سپاہیوں کو جب رقم نہ ملی تو ناراض ہوگئے۔ دو ترک امیر، توزون اور خجخج، جو پہلے بریدی کے ساتھ تھے، اور اب بنی حمدان سے مل گئے تھے، انہوں نے علانیہ مخالفت شروع کی اور سیف الدولہ سے گستاخی سے پیش آئے۔ ابن اثیر اور ابن مسکویہ دونوں نے بیان کیا ھے کہ سیف الدولہ ترک امیرون اور سپاہیوں کے سامنے عراق کی مذمت کیا کرتا تھا، اور چاھتا تھا کہ یہ لوگ اسے شام کے فتح کرنے میں مدد دیں [۲]۔ مگر ترک اس پر راضی نہ ہوئے، اور جب سیف الدولہ رقم کے متعلق ان کے مطالبات پورے نہ کرسکا تو سلخ شعبان سنہ ۳۳۱ (سنہ ۹۴۱) کو رات کے وقت اچانک اس پر ٹوٹ پڑے۔ اب سیف الدولہ نے واسط سے بھاگ کر بغداد میں پناہ لی۔ ترکوں نے اس کی چھاؤنی کو جلا ڈالا اور جو رقم انہیں مل سکی لوٹ لی۔ ان واقعات سے ناصرالدولہ اتنا گھبرایا کہ وہ سیف الدولہ کو ساتھ لے کر بغداد سے موصل چلا آیا۔

سیف الدولہ کے واسط سے جانے کے بعد توزون اور خجخج میں بگاڑ ہوا۔ سیف الدولہ نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا، اور پھر بغداد آیا۔ یہاں سے اس نے توزون سے لڑنے کے لئے خلیفہ متقی سے

---

[۱] ابن مسکویہ ج ۲۔ ص ۲۹۔ ابن مسکویہ (ج ۲۔ ص ۲۸) کا بیان ھے کہ یہ موقع تھا کہ جب خلیفہ متقی نے علی کو سیف الدولہ کا خطاب دیا ھے۔ ابن رائق کے قتل پر حسن کو ناصر الدولہ کا خطاب دیا گیا تھا، اور علی کو صرف خلعت عطا کی گئی تھی۔ [۲] ابن مسکویہ ج ۲۔ ص ۳۰۔ ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۶۰۔

ایک بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ مگر قبل اسکے کہ اس امر کا فیصلہ ہو سکے توزون بغداد کے قریب پہنچ گیا، اور سیف الدولہ نے وہاں سے بھاگ جانے میں اپنی بہتری سمجھی۔ توزون کے لئے اب میدان صاف تھا۔ وہ بغداد میں داخل ہوا، اور خلیفہ متقی نے اسے امیر الامراء بنا دیا۔ مگر نئے امیر الامراء اور خلیفہ میں بہت جلد نا چاقی ہو گئی۔

سیف الدولہ توزون کے ڈر سے بغداد سے بھاگ کر سیدھا موصل پہنچا۔ اور سنہ ۳۳۲ (سنہ ۹۴۳) میں آس نے پھر بغداد کا رخ کیا۔ اس وقت توزون واسط میں تھا۔ اس نے تھوڑی سی فوج وہاں چھوڑی اور خود بغداد پہنچ کر باب شماسیہ پر خیمہ زن ہوا۔ ادھر ناصرالدولہ دریائے دجلہ کے راستے تکریت آیا، اور خلیفہ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ سیف الدولہ اور توزون کا مقابلہ تکریت سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ہوا۔ سیف الدولہ نے شکست کھائی۔ دوسری جنگ بغداد اور تکریت کے درمیان حربہ میں ہوئی، اور سیف الدولہ کو پھر شکست ہوئی۔ اب اسے موصل میں بھی پناہ نہ ملی۔ وہ ناصر الدولہ، متقی اور تمام خدم وحشم کے ساتھ نصیبین چلا گیا، اور توزون موصل پر قابض ہو گیا۔ خلیفہ اپنے حرم کو لے کر نصیبین سے رقہ پہنچا، جہاں سیف الدولہ اس سے آملا۔ اب توزون اور خلیفہ میں خط وکتابت شروع ہوئی: آخر یہ قرار پایا کہ موصل کا علاقہ تین سال کے لئے ناصرالدولہ کے حوالے کر دیا جائے، اور ناصرالدولہ ہر سال (۳۰۰۰۰۰) درہم توزون کو ادا کرے۔ موصل پر دوبارہ بنی حمدان کا قبضہ ہو گیا، اور خلیفہ انہیں کے ساتھ رہا۔ مگر چندھی روز میں بنی حمدان خلیفہ کی مہمانی سے اکتا گئے۔ متقی نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کوئی اور جائے پناہ تلاش کرے۔ آخر توزون کے وعدوں سے دھوکے میں آکر وہ بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ۲۵ یا ۲۶ محرم سنہ ۳۳۳ (سنہ ۹۴۴) کو وہ ھیت پہنچا، جہاں توزون نے نہایت عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا، مگر پھر اسے اندھا کر کے خلافت سے الگ کر دیا۔ توزون ھی کے حکم سے معتضد کا بیٹا مستکفی باللہ خلیفہ بنایا گیا۔

مستکفی کی خلافت کو ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ سلطان معزالدولہ بن بویہ نے بغداد پر قبضہ کر کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب نہ سازشیں رھیں، نہ مختلف امراء کی خانہ جنگیاں، اور بنی حمدان کو بغداد میں اقتدار حاصل کرنے کی جو توقعات تھیں وہ سب خاک میں مل گئیں۔

(۳)

ابن اثیر کے حوالے سے ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ابن رائق کے قتل کے بعد اخشید، حاکم مصر، نے سنہ ۳۳۰ (سنہ ۹۴۱) میں دمشق پر قبضہ کرلیا تھا، اور شام کا علاقہ، جس پر اس سے قبل اخشید متعدد حملے کر چکا تھا، اس کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ ادھر سنہ ۳۳۲ (سنہ ۹۴۴) تک سیف الدولہ کی حیثیت خلیفہ کے ایک ملازم اور ناصرالدولہ کے ماتحت کی سی تھی۔ اس سال سیف الدولہ نے گذشتہ خدمات کے صلے میں اپنے بھائی سے مطالبہ کیا کہ اسے کسی صوبے کا حاکم بنا دیا جائے۔ اس کا جواب ناصرالدولہ نے یہ دیا کہ ''شام تمہارے سامنے ہے، اور وہاں تمہاری مزاحمت کرنیوالا کوئی نہیں'' [۱]۔

وقت اور موقع بھی مناسب تھا، کیونکہ ابن رائق کے قتل اور اخشید کے قبضے کے بعد شام میں امن و امان کی صورت اب تک پیدا نہ ہوئی تھی [۲] سنہ ۳۳۳ (سنہ ۹۴۴) اخشید رقہ سے حلب آیا اور حلب سے مصر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ابوالفتح عثمان بن سعید الکلابی کو حلب کا حاکم مقرر کیا۔ بنی کلاب کو اس وجہ سے ابوالفتح سے حسد پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اسے نقصان پہنچانے کی غرض سے سیف الدولہ کو حلب آنے کی دعوت دی [۳]۔ سیف الدولہ کی نظر پہلے ہی سے شام پر تھی؛

---

[۱] زبدۃ الحلب ص ۱۰۵۔ [۲] فریٹاگ (ص ۱۷۸) نے لکھا ہے کہ ناصرالدولہ نے یہ الفاظ سنہ ۳۳۰ (سنہ ۹۴۱) میں اس وقت کہے تھے جب ابن رائق کے قتل کے بعد وہ امیرالامراء مقرر ہوا تھا، اور اپنے اختیار سے وہ اس قسم کے تقررات کر سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ سیف الدولہ نے ترکوں سے شام کے متعلق ساز باز کی تھی۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اول تو صراحت کے ساتھ سیف الدولہ کو شام کا حاکم نہیں مقرر کیا گیا، بلکہ اس کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شام کی حالت ایسی ہے کہ اس پر قبضہ کرلینا آسان بات ہے۔ اس کے علاوہ ہم بیان کرچکے ہیں سنہ ۳۳ میں سیف الدولہ نے واسط میں ترکوں سے شام کے متعلق گفتگو کی تھی، مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ سنہ ۳۳۰ سے سنہ ۳۳۳ تک سیف الدولہ خاموش بیٹھا رہا ہو، بلکہ قیاس غالب یہی ہے کہ وہ سنہ ۳۳۳ میں سب سے پہلے شام کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ [۳] زبدۃ الحلب ص ۱۰۷۔ حلب کا شہر ایک میدان میں واقع ہے، جو پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس میدان کو نہر قویق سیراب کرتی تھی، اور اسی دریا کے جانبین کنارے پر حلب آباد ہے۔ دیکھو صدرالدین ص ۴۱۔

مگر اسے معلوم تھا کہ منظم اور ترتیب یافتہ فوج کی مدد کے بغیر اس پر قبضہ کرنا ناممکن ھے، خصوصاً اس وجہ سے جب کہ شام اخشید کی فتح کے بعد سلطنت مصر کا ایک حصہ بن چکا تھا، اور اس پر حملہ کرنا اخشید سے جنگ مول لینا تھا ـ

اس واقعہ کی تفصیل یہ ھے کہ ابن رائق کے قتل کے بعد امیرالامراء ھونے کی حیثیت سے ناصرالدولہ دیار مصر اور شام کا مالک تھا؛ اور اس نے علی بن خلف کو ان پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ابن رائق کی طرف سے محمد بن علی بن مقاتل حلب کا حاکم تھا۔ علی بن خلف نے اسے شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سنہ ۳۳۱ (سنہ ۹۴۲) نے اپنے آپ کو اخشید کے سپرد کر دیا، اور اس کا وزیر مقرر ھوا. اب مونس المظفر کا مولے یانس [۱]، جو یانس المونسی کے نام سے مشہور ھے، حلب میں رہ گیا، لیکن اس نے بھی اخشید کی اطاعت قبول کر لی، اور اس کا نام خطبوں میں پڑھوا یا ـ

توزون اور ناصرالدولہ میں جو معاھدہ ھوا تھا اس کے مطابق شام ناصرالدولہ کے حصے میں آیا تھا۔ اس نے سنہ ۳۳۲ (سنہ ۹۴۳) میں ابن رائق کے پرانے وزیر محمد بن علی بن مقاتل کو اس شرط پر حلب کا حاکم مقرر کیا کہ جب کبھی ناصرالدولہ حلب آئے تو ابن مقاتل (۵۰۰۰۰) دینار بطور نذرانہ پیش کرے۔ لیکن یہ نیا حاکم، جو موصل سے متعدد امراء کو ساتھ لے کر روانہ ھوا تھا، ابھی اپنے مستقر بھی نہیں پہنچا تھا کہ موصل میں سیف الدولہ اور اس کے چچا زاد بھائی حسین بن سعید بن حمدان میں جھگڑا ھوا۔ ناصرالدولہ نے اس خاندانی فساد کو اس طرح فرو کیا کہ حسین بن سعید کو حلب دے دیا، اور وعدہ کیا کہ شام کا جو علاقہ وہ فتح کریگا وہ اسی کو دے دیا جائیگا۔ حسین اپنے صوبے کا جائزہ لینے کے لئے رجب سنہ ۳۳۳ (مارچ سنہ ۹۴۴) کو موصل سے روانہ ھوا۔ اس نے ابن مقاتل کی مدد سے یانس اور احمد بن عباس الکلابی کو نہ صرف حلب سے نکال دیا، بلکہ معرۃ النعمان، اور اس سے آگے حمص

---

[۱] اغلب یہ ھے کہ یانس یونانی غلام تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مونس المظفر کی خدمت میں رھنے کے بعد اسے آزادی مل گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ یانس المونسی کہلاتا تھا ـ

تک ان کا تعقب کیا۔ حمص میں اسحاق بن کیغلغ حاکم تھا۔ اس نے بھی شہر خالی کر دیا۔ اس فتح کے بعد خانہ بدوش عرب قبائل نے حسین کی اطاعت قبول کر لی، اور ماہ رجب میں ھی وہ حلب میں داخل ھوا۔ لیکن ذی الحجہ میں اسے اس وجہ سے شہر خالی کرنا پڑا کہ اخشید مصر کی فوجیں لئے حلب کی طرف بڑھ رہا تھا، اور حسین میں اس کے مقابلے کی ھمت نہ تھی۔ حسین حلب سے رقہ چلا گیا۔ سیف الدولہ یہاں پہلے سے موجود تھا، کیونکہ ناصر الدولہ سے اس وقت اس کی ان بن تھی، اور خلیفہ نے اسے رقہ میں روک رکھا تھا۔ حسین کے فرار کے بعد ابن مقاتل، جو حلب میں اس کے ساتھ تھا، چند روز روپوش رھا، اور پھر اس نے اپنے آپ کو اخشید کے حوالے کر دیا۔ اخشید اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا، اور اسے صاحب الخراج اور مصر کی جاگیروں کا منتظم مقرر کر دیا۔

حلب سے بھاگ کر حسین رقہ آیا تو خلیفہ کے حکم سے اسے شہر میں داخل ھونے سے روک دیا گیا، اور وہ حران ھوتا ھوا موصل چلا گیا۔ آخر سیف الدولہ اور حسین میں صلح ھوگئی۔ آدھر اخشید رقہ میں خلیفہ کی خدمت میں باریاب ھوا، اور خلیفہ نے اسے اور اس کے بیٹے انوجور کو تیس برس کے لئے مصر و شام بخش دیا۔ مصر واپس ھونے سے پہلے اخشید نے ابوالفتح عثمان بن سعید الکلابی کو حلب کا حاکم مقرر کیا۔ یہی شخص ھے جس کے زمانہ میں اھل حلب نے سیف الدولہ کو وھاں آنے کی دعوت دی تھی۔

سیف الدولہ نے فوج جمع کر کے حلب کا رخ کیا۔ ایک تو سیف الدولہ کو اس کا علم تھا کہ ابوالفتح اپنے اھل قبیلہ کی مخالفت سے واقف ھوتے ھوئے اس کا مقابلہ نہ کریگا، اور دوسری طرف ابوالفتح جانتا تھا کہ وہ بلا مدد غیرے سیف الدولہ سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ اس لئے جب سیف الدولہ حلب کی طرف چلا تو خود ابوالفتح اس کے استقبال کے لئے نکلا، اور دریائے فرات کے کنارے دونوں کی ملاقات ھوئی۔ سیف الدولہ نے اس کی اتنی عزت افزائی کی کہ اسے اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھا لیا راستہ میں برسبیل گفتگو سیف الدولہ اس سے ان قریوں کے نام دریافت کرتا تھا، جس میں سے وہ گزرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ علاقہ فایا [۱] کے گاؤں ابرم میں سے گزرے۔ سیف الدولہ نے گاؤں کا نام پوچھا،

---

[۱] فایا منبج اور حلب کے درمیان ایک وسیع علاقہ کا نام تھا، اور منبج کا شہر اسی علاقہ میں واقع تھا۔ یہ علاقہ ان دونوں شہروں کے جنوب میں وادیٔ بطنان کے قریب ھے۔

اور ابو الفتح نام نے بتا دیا۔ یہ سمجھ کر کہ ابو الفتح اس کے سوالات سے تنگ آگیا ہے، سیف الدولہ اس کے بعد خاموش ہو گیا [۱]۔ ابو الفتح اس خاموشی کے معنے سمجھ گیا، اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ واقعی اس گاؤں کا نام ابرم ہی ہے۔ سیف الدولہ اس کی فہم و فراست سے ایسا حیران ہوا کہ حلب پہنچ کر اسے اپنے ساتھ تخت پر جگہ دی۔ وہ پیر کے دن ۸ ربیع الاول سنہ ۳۳۳ (۹) اکتوبر سنہ ۹۴۴) کو حلب میں داخل ہو گا [۲]۔

حلب آکر سیف الدولہ نے پہلا کام یہ کیا کہ قاضی احمد بن محمد بن ماثل کو معزول کر کے ابو حصین علی بن عبد الملک بن بدر بن ہیثم الرقی کو اس کی جگہ مقرر کیا۔ نئے قاضی نے سیف الدولہ کی خدمت اس تندہی سے کی کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کر لیتا [۳]۔ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سیف الدولہ نے اس خلاف قانون کارروائی سے چشم پوشی کی؛ اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اسے رقم کی سخت ضرورت تھی، اور وہ اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ابھی سیف الدولہ فتح حلب سے پوری طرح فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ دمستق نے اس کی پریشانی اور حلب کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر اسلامی سرحد پر حملہ کیا؛ بغراس اور مرعش پر ٹوٹ پڑا،

---

[۱] عربی میں ابوام کے معنے تنگ آجانے کے ہیں۔ اسی لئے سیف الدولہ نے ابو الفتح کی زبان سے یہ الفاظ سن کر خیال کیا تھا کہ ابو الفتح سوالات کا جواب دیتے دیتے اکتا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ لفظ علم ہے فعل نہیں۔ [۲] فریٹاگ۔ ص ۱۸۰۔ زبدۃ الحلب ص ۴۸ - ۵۲۔ ابو الفداء (ج ۲ - ص ۹۳) اور ابن اثیر (ج ۸ - ص ۱۶۰) نے ابو الفتح کا ذکر نہیں کیا، بلکہ لکھا ہے کہ صرف یانس المونسی اس وقت حلب میں تھا، اور اسی سے سیف الدولہ نے شہر فتح کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حلب کی فتح کے بعد سیف الدولہ نے حمص پر حملہ کیا تھا، اور اخشید کی فوج کو شکست دے کر اس پر قابض ہو گیا تھا، مگر دمشق فتح کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ابن تغری بردی (ج ۲ - ص ۳۰۷) نے بھی ابو الفتح کا ذکر نہیں کیا، اور یانس المونسی ہی کو حلب کا حاکم بتایا ہے۔ [۳] زبدۃ الحلب ص ۵۲۔

اور تمام علاقے کو خوب دل کھول کر تاخت و تاراج کیا [۱]۔ سیف الدولہ نے ان حملوں کا بدلہ لینا ضروری سمجھا۔ وہ یونانیوں کے علاقے میں داخل ہوا، اور دمشق کے حملے کا بدلہ اس طرح لیا کہ صفصاف پر تاخت کی، جو مصیصہ کی سرحد پر واقع ہے۔ وہ عرنسوس تک پہنچا، اور سالم و غانم واپس آیا۔ لیکن وہ اس فتح سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ کیونکہ اسی وقت اسے معلوم ہوا کہ اخشید کی فوج، یانس اور کافور کی سرکردگی میں، اس کے مقابلے کے لئے آرہی ہے۔ یونانی مہم کے مال غنیمت کو ساتھ لئے ہوئے وہ پلٹا اور رستن [۲] کے مقام پر دشمن کا مقابلہ کیا۔ کافور اس کے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لاسکا۔ شکست خوردہ فوج رستن کے قریب نہر العاصی [۳] کے پل کی طرف بھاگی، اور سپاہیوں کی بڑی تعداد دریا میں کود پڑی۔ سیف الدولہ نے حکم دیا کہ یہ لوگ قتل نہ کئے جائیں، کیونکہ اس نے کہا کہ ''مال غنیمت تمہارا ہے، اور لوگوں کی جانیں میری''۔ چار ہزار قیدی، جن میں بعض امراء بھی شامل تھے، سیف الدولہ کے ہاتھ آئے [۴] کافور کی پوری چھاؤنی بھی فاتحین کے قبضے میں آگئی۔ کافور، براہ حمص، دمشق پہنچا، اور اخشید کو اپنی شکست کی اطلاع دی۔ سیف الدولہ نے تمام قیدی رہا کردئے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ یہ لوگ اس کے اتنے احسان مند ہوئے کہ اسے ان کی طرف سے بالکل اطمینان ہو گیا۔

---

[۱] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۳۰۷۔ مگر زبدۃ الحلب (ص ۵۲) کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقدام سیف الدولہ کی طرف سے ہوا تھا۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ سیف الدولہ جسے حلب میں اب تک استحکام حاصل نہیں ہوا تھا، اس طرح اقدام کا خیال بھی کرتا۔ ابن اثیر (ج ۸۔ ص ۱۶۰) اور ابوالفدا (ج ۲ ص ۹۳) نے بیان کیا ہے کہ جنگ یونان ہی کی طرف سے شروع ہوئی تھی، بلکہ ان کی فوجیں حلب کے قریب تک پہنچ گئیں تھیں۔ سیف الدولہ کی فوج کشی محض دفاعی تھی۔ بغراس اور مرعش دو سرحدی قلعے ہیں۔ دیکھو یاقوت، اور لی اسٹرینج۔ [۲] رستن حماۃ اور حمص کے درمیان نہر العاصی کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے، دیکھو یاقوت لفظ الرستن۔ [۳] Orontes۔ اسے المیماس، المیاس، المقلوب اور الارنت یا الارند بھی کہتے ہیں۔ لی اسٹرینج ص ۶۱۔

[۴] فریٹاگ۔ ج ۱۱۔ ص ۱۸۱۔ مگر یافعی (ج ۲۔ ص ۳۱۲) اور ذہبی (ج ۱۔ ص ۱۶۲) نے قیدیوں کی تعداد صرف ایک ہزار بتائی ہے۔

اس فتح کے بعد سیف الدولہ دمشق گیا، اور رمضان سنہ ۳۳۳ (اپریل مئی سنہ ۹۴۵) میں شہر میں داخل ہوا۔ یہاں اسے اخشید کا ایک خط ملا، جس میں صلح کی درخواست تھی، اور یہ استدعا کی گئی تھی کہ سیف الدولہ اب تک جو علاقہ فتح کر چکا ہے اس پر قانع ہو جائے۔ مگر اس نے اس پر توجہ نہ کی، اور خانہ بدوش عرب قبائل کی گوش مالی کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس مہم سے جب وہ دمشق واپس ہوا ہے تو وہاں* کے باشندوں نے اسے شہر میں داخل ہونے سے روکا۔ اخشید کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ رملہ سے اس کے مقابلہ کے لئے چلا۔ ادھر اخشید طبریہ پہنچا، اور ادھر سیف الدولہ مقابلہ کئے بغیر حلب واپس آ گیا، کیونکہ اس کی فوج کا بڑا حصہ اخشید سے مل گیا تھا۔ اخشید نے اس کا تعقب کیا، اور معرۃ النعمان کا محاصرہ کر لیا۔ اس اثناء میں سیف الدولہ نے نئی فوج مرتب کر لی، اور ماہ شوال میں قنسرین کے علاقہ میں اخشید کا مقابلہ کیا [۱]۔

اخشید نے پہلے نیزہ برداروں کو جنگ کے لئے بھیجا، اور خود (۱۰۰۰۰) سپاہیوں کے ساتھ فوج کے عقب میں رہا۔ یہ دس ہزار سپاہی خاص طور پر تربیت یافتہ تھے، اور بہادری اور ثابت قدمی کی وجہ سے صابریہ کہلاتے تھے۔ اخشید کا خیال تھا کہ پہلے حملے کے بعد جب سیف الدولہ کی فوج میں ابتری پھیل جائیگی تو وہ بذات خود صابریہ کو لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑیگا، اور اس کا خاتمہ کر دیگا۔ ایسا ہی ہوا سیف الدولہ نے یہ سوچ کر اخشید بھی حملہ آور فوج میں موجود ہے، نہایت تندھی سے حملہ کیا۔ اخشید کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، اور عین اس وقت جب سیف الدولہ کو فتح کا یقین ہو چکا تھا، اخشید نے صابریہ کو لے کر یورش کی، اور سیف الدولہ کی فوج کو منتشر کر دیا۔ من جملہ اور مقتولوں کے اس جنگ میں معاذ بن سعید قتل ہوا، جس سے اخشید نے وعدہ کیا تھا کہ اسے معرۃ النعمان کا حاکم بنا دیا جائیگا۔

---

[۱] ابو الفدا (ج ۲ - ص ۹۳) لکھتا ہے کہ سیف الدولہ نے دمشق کا محاصرہ کیا تھا، مگر اخشید کی آمد کی خبر سن کر محاصرہ اٹھا لیا۔ اس کے بعد فریقین قنسرین میں ٹھہرے رہے، مگر جنگ نہیں ہوئی۔ سیف الدولہ الجزیرہ چلا گیا، اور اخشید دمشق کو واپس ہوا۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد سیف الدولہ حلب آ گیا۔ مگر جو شکست سیف الدولہ کو ہوئی اسے دیکھتے ہوئے ابو الفداء کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

معاد سیف الدولہ کو گرفتار کرنے کی کوشش میں آگے بڑھا، مگر اس کے گرز کی ایک چوٹ سے جان بر نہ ہوسکا۔ سیف الدولہ کی پوری چھاؤنی، مع اسلحہ کے، فاتحین کے قبضے میں آئی۔ یہ شکست اس قدر فیصلہ کن تھی کہ گو اخشید نے اس کا تعقب نہیں کیا، لیکن سیف الدولہ میدان جنگ سے الجزیرہ کی طرف بھاگا اور رقہ میں پناہ گزیں ہوا [۱]۔

اخشید اب حلب میں داخل ہوا۔ یہاں کے باشندوں نے سیف الدولہ کے فراریوں کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ مگر فاتح سپاہیوں نے شہر اور آس کے گرد و نواح کے علاقے کو بالکل لوٹ لیا، اور باشندوں کے ساتھ بری طرح پیش آئے۔ حلب کے باہر بے شمار بلند اور خوبصورت درخت تھے، جن کی تعریف اکثر شعراء نے کی ہے۔ یہ درخت بھی ان سپاہیوں نے کاٹ ڈالے، اور اہل حلب پر اس وجہ سے سختیاں کیں کہ انہوں نے سیف الدولہ کا ساتھ دیا تھا۔ خود اخشید کا یہ حال تھا کہ وہ غالباً اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا تھا، اور چاہتا تھا کہ کسی طرح صلح کر کے اپنے بیٹے کے لئے پر امن سلطنت چھوڑ جائے۔ ورنہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ عین فتح و ظفر کے وقت اس نے سیف الدولہ سے صلح کے لئے کیوں سلسلہ جنبانی کی اور دمشق کے بدلے میں حلب، حمص، اور انطاکیہ دینے کے علاوہ سالانہ ایک معتدبہ رقم ادا کرنے پر کیوں راضی ہوگیا۔ آخر ماہ ربیع الاول سنہ ۳۳۴ (اکتوبر۔ نومبر سنہ ۹۴۵) میں حسن بن طاہر علوی کی وساطت سے دونوں میں عہد نامہ ہوا، اور صلح کی مزید توثیق کی غرض سے سیف الدولہ نے اخشید کے بھائی عبید اللہ بن طغج کی بیٹی سے شادی کرلی۔ اس کے بعد سیف الدولہ دوبارہ حلب میں داخل ہوا۔

اس سال کے ماہ ذی الحجہ، یا بقول بعض محرم سنہ ۳۳۵ (جولائی اگست سنہ ۹۴۵) میں اخشید نے دمشق میں انتقال کیا۔ اس کا کم سن بیٹا انوجور اس کا جانشین ہوا۔ اور مدت العمر اپنے اتابک کافور کا دست نگر رہا۔ بر سر اقتدار ہوتے ہی کافور مصر کی فوج لے کر ایک باغی مغربی کے خلاف روانہ ہوگیا؛ نہ صرف یہ بلکہ اس نے دمشق سے بھی فوجیں واپس بلالیں۔ سیف الدولہ نے معاہدہ کو بالائے طاق رکھا، اور موقع سے فائدہ اٹھا کر شام بلکہ مصر پر بھی قبضہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ دمشق کا حاکم یانس

---

[۱] زبدۃ الحلب۔ ص ۵۳۔

آس سے مل گیا ، اور سیف الدولہ نے وہاں اپنی فوجیں مقرر کر دیں [۱] ۔ وہ خود بھی دمشق چلا گیا ۔ یہاں کے قیام کے دوران میں آس کی والدہ نعم بھی اس کے پاس آ گئی ۔ ایك دن وہ شریف العقیقی کے ساتھ غوطۂ دمشق میں سے گذر رہا تھا تو باتوں باتوں میں آس نے شریف سے کہا کہ یہ سر زمین جب تك ایك شخص کے قبضہ میں نہیں آئیگی آس وقت تك اس کی اصلاح نہ ہوگی ۔ عقیقی نے کہا کہ اس کے مالك تو بہت سے ھیں ۔ سیف الدولہ نے جواب دیا کہ قوانین سلطنت کے مطابق انہیں الگ کیا جاسکتا ھے ۔ شریف العقیقی نے اھل دمشق کو سیف الدولہ کے حقیقی منصوبوں سے مطلع کردیا ۔ لوگ چوکنے ہوگئے ، اور کافور کی مدد کے طالب ھوئے [۲] ۔ وہ مغربی کی بغاوت فرو کر چکا تھا ، اور اب آس نے فوراً انوجور کو ساتھ لیکر شام کا رخ کیا ۔ لجون [۳] کے مقام پر سیف الدولہ اور کافور کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں ۔ باوجود اس کے کہ مصری فوج اس کے سامنے تھی ، سیف الدولہ چند روز وہاں بیکار پڑا رہا ، اور اس کے سپاھی خوراك اور علوفہ کی تلاش میں منتشر ہوگئے ۔ دشمن کو جب اس غفلت کی خبر ہوئی ، تو اس نے اپنی فوج مرتب کرکے اخشید کے بھائی ، ابوالمظفر حسن بن طغج کو اس کا افسر مقرر کیا ۔ سیف الدولہ نے دوسری غلطی یہ کی کہ دشمن کی خبریں معلوم کرنے کے لئے جاسوس مقرر نہیں کئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیف الدولہ کو دشمن کی آمد کی خبر آس وقت ہوئی جب فوج سر پر پہنچ چکی تھی ۔ بہر کیف وہ مقابلے کے لئے تیار ھو گیا ۔ لیکن اس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں ۔ اس کی فوج کا ایك حصہ کام آیا ، ایك حصہ گرفتار ہوا ، خود سیف الدولہ جان بچا کر دمشق بھاگا ۔ یہ واقعہ جمادی الثانی سنہ ۳۳۵ (سنہ ۹۴۶ کا ختم یا سنہ ۹۴۷ کا آغاز) میں پیش آیا ۔ سیف الدولہ نے دمشق میں داخل ہونے کی ھمت نہ کی ، بلکہ اپنی والدہ اور

---

[۱] ابن اثیر (ج۸ ۔ ص ۱۶۸) لکھتا ھے کہ اس سال یعنی سنہ ۳۳۵ (سنہ ۹۴۷) میں نصر الثملی ، امیر الثغور ، کی معرفت سیف الدولہ نے مسلمان قیدیوں کا تبادلہ کیا ، اور بہتوں کا زر فدیہ ادا کیا ۔ (۲۴۸۰) مسلمان مرد و عورت اس طرح یونانیوں کی قید سے رہا ہوئے ۔ یونانیوں نے (۲۳۰) قیدی خود چھوڑ دئے ، کیونکہ ان کے پاس قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ۔ [۲] ابوالفداء ۔ ج ۲ ۔ ص ۹۵ ۔ [۳] لجون ، اردن کے علاقہ کا ایك شہر تھا ، اور طبریہ سے بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا ۔ دیکھو یاقوت لفظ اللجون ۔

دوسرے عزیزوں کو ساتھ لے کر، جو وھاں موجود تھے، مع تمام مال و اسباب کے حمص بھاگا: اھل شہر، چونکہ اس وقت تک حلبون کے واقعہ سے بے خبر تھے، اس لئے انہوں نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ حمص میں پہنچ کر سیف الدولہ نے بدوی قبائل، عقیل، نمیر، کلب اور کلاب کے لوگوں سے اتنی بڑی فوج جمع کی کہ اس سے قبل کبھی نہ کی تھی۔ اب حمص اور دمشق کی فوجیں مرج عذرا کے مقام پر جو غوطۂ دمشق میں واقع ھے، دوبارہ مقابل ھوئیں۔ شروع میں جنگ کا فیصلہ سیف الدولہ کے حق میں ھوتا معلوم ھوتا تھا، مگر انجام کار مصری فوج کو فتح ھوئی۔ سیف الدولہ اپنی تمام چھاونی اور مال و اسباب کو کھو کر بھاگا، اس کے سپاھی گرد و نواح کے علاقے میں منتشر ھو گئے اور اکثر مر گئے۔ بذات خود سیف الدولہ پہلے حلب کی طرف بھاگا، مگر جب یہاں بھی پناہ کی صورت نہ دیکھی تو رقہ چلا گیا۔ یانس نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور انطاکیہ روانہ ھو گیا۔ ماہ ذی الحجہ سنہ ۳۳۵ (جون جولائی سنہ ۹۴۷) میں انوجور حلب میں داخل ھوا۔ وھاں سے اس نے یانس کے پاس انطاکیہ آدمی بھیجے۔ ان کی وساطت سے آخر یانس اور انوجور میں اس شرط پر صلح ھوئی کہ انطاکیہ، جسے سیف الدولہ چھوڑ چکا تھا، یانس کو دے دیا جائے۔ یانس نے بطور یرغمال اپنا بیٹا انوجور کے پاس بھیج دیا۔ اس صلح کی تکمیل کے بعد کافور اور انوجور جنوب کی طرف روانہ ھو گئے [۱] ۔

ایک اور روائت کے مطابق مصریوں کے چلے جانے کے بعد سیف الدولہ حلب ھی میں رھا۔ یانس اور ابن ابی الساج کے حرس نے بغاوت کی، اور اس کو گرفتار کرنا چاھا۔ ان سے بچ کر سیف الدولہ مع اپنے خدم و حشم اور فوج کے بھاگا، اور حلب یانس کے قبضے میں آ گیا۔ لیکن ایک مہینہ بعد یانس کو شہر خالی کرنا پڑا۔ ماہ ربیع الاول سنہ ۳۳۶ (اکتوبر نومبر سنہ ۹۴۷) میں ایک رات سیف الدولہ اچانک حلب پہنچا، یانس اس کی آمد سے بالکل بے خبر تھا، اس نے فوراً شہر خالی کر دیا، اور انوجور کے پاس جانے کے ارادہ سے سرمین [۲] چلا گیا۔ سیف الدولہ کی فوج نے ابراھیم بن البرید کی ماتحتی میں، جو اس سے

---

[۱] زبدة الحلب۔ ص ۵۰۔ ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۳۱۶، ۳۱۷ ۔ [۲] سرمین اعمال حلب کا ایک شہر ھے۔ زمانہ مابعد میں یہاں اسماعیلی آباد ھو گئے تھے۔ یاقوت۔ لفظ سرمین ۔

قبل ناصر الدولہ کا ملازم تہا اور سنہ ۳۳۰ میں سیف الدولہ کے پاس آ گیا تہا، یانس کا تعقب کیا۔ مگر ابراهیم داذیخ [۱] سے آگے نہ بڑہ سکا، اور اپنے اهل و عیال کو وهیں چہوڑ کر اپنے بہائی کے پاس میا فارقین میں پناہ گزیں هوا [۲]۔

اس واقعہ کے بعد سیف الدولہ اور انوجور میں پرانی شرائط پر هی ایك عہد نامہ هوا [۳] اب سیف الدولہ کو حلب کی طرف سے اطمینان هو گیا۔ [۴] اس نے گہڑ دوڑ کے میدان کے قریب اپنے لئے ایك میدان بنوایا، [۵] اور اپنے چچازاد بہائی ابوفراس حارث بن سعید کو منبج اور اس شہر سے متعلقہ علاقوں کا حاکم مقرر کیا۔ اس طرح تین مرتبہ حلب کو کہونے کے بعد آخر سنہ ۳۳۶ (سنہ ۹۴۷) میں یہ شہر مستقل طور پر اس کے قبضے میں آیا۔ بنی تغلب کا پہلا شخص تہا جو بلا شرکت غیرے یہاں کا بادشاہ هوا۔ اس نے اپنے وزیر ابواسحاق محمد القراریطی کو معزول کر کے ابوعبداللہ محمد الموصلی کو اس کی جگہ مقرر کیا [۶]۔

---

[۱] ذاذیخ سرمین کے قریب ایك گاؤں ھے۔ یاقوت لفظ ذاذیخ۔

[۲] زبدۃ الحلب۔ ص ۵۵، ۵۶۔ [۳] جب سیف الدولہ نے اخشید سے حلب فتح کیا ھے تو اسے صوبۂ جزیرہ کا، جس میں عین زربہ، طرسوس اور مصیصہ شامل تہے، حاکم مقرر کیا گیا تہا، اور اس شرط پر خراج معاف کیا گیا تہا کہ وہ یونانیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں اور اسلامی سرحد کی حفاظت کریگا۔ اس سے معلوم هوتا ھے کہ گو سیف الدولہ نے یونانیوں کے مقابلے میں اب تك کوئی بڑا کام نہیں کیا تہا، لیکن لوگوں کو اس پر بہروسہ ضرور تہا۔ ابن تغری بردی نے بیان کیا ھے کہ سنہ ۳۳۵ (سنہ ۹۴۶) میں اهل طرسوس نے شہر سیف الدولہ کے حوالے کر دیا تہا۔ اس کے صلے میں سیف الدولہ نے وهاں کے سربرآوردہ لوگوں کو خلعتیں اور رقمیں عطا کی تہیں، اور (۸۰۰۰۰) دینار قیدیوں کے زرفدیہ کے لئے دئے تہے۔ ج ۲۔ ص ۳۱۸۔

[۴] زبدۃ الحلب ص ۵۶۔ [۵] حلبہ کے قریب محل کی تعمیر کے ساتھ سیف الدولہ نے دریائے قویق سے ایك نہر نکالی تہی، جو خناقیہ سے گزر کر محل میں داخل هوتی تہی، اور فیض کے مقام پر محل سے باهر نکل جاتی تہی۔ الطباخ۔ ج ۱۔ ص ۲۵۶۔ [۶] ابن اثیر۔ ج ۸۔ ص ۱۶۸۔

(۴)

اسلامی ممالک کی سرحد شام و فلسطین کی حدود پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے مسلمانوں نے ایشاء کوچک پر قبضہ کرنے کی کبھی مسلسل کوشش نہیں کی تھی، اور یہ ملک، حسب سابق، یونانی سلطنت قسطنطنیہ کا ایک صوبہ تھا۔ یونانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کی خانہ جنگی یا نفاق سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے تھے، اور ہر وقت اسلامی سرحد پر ان کی یورشوں کا خطرہ رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ارمینیا کو انہوں نے میدان جنگ بنا رکھا تھا۔ اگر خود ان کی سلطنت کمزوری یا ابتری کی وجہ سے حملے کا انتظام نہ کر سکتی تو اھل ارمینیہ کو ابھارتے، اور وھاں بغاوت برپا کرا دیتے، جس سے مسلمانوں کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔ یہی وجہ ھے کہ بنی امیہ کے عہد میں یہاں کے حاکم بالعموم تجربہ کار سپہ سالار ھوا کرتے تھے، کیونکہ یہاں تدبر و سیاست کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی کہ فوجی قابلیت اور جفاکشی کی۔ ارمینیہ سے قطع نظر، بنی امیہ نے مسلمانوں کی اس سرحد کو محفوظ رکھنے کی یہ ترکیب کی تھی کہ وہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں ایشاء کوچک پر حملے کرتے تھے۔ یہ مہمیں صائفہ کہلاتی تھیں۔ بنی امیہ کے خاتمہ تک یہ قاعدہ جاری رھا۔ سنہ ۱۳۲ (سنہ ۷۴۹) میں بنی عباس نے بنی امیہ کی جگہ لی، تو پورا استحکام حاصل کرنے کے بعد سنہ ۱۳۹ (سنہ ۷۵۶) میں انہوں نے اس طریقہ کو از سر نو زندہ کیا، اور برابر ہر سال ایشیاء کوچک پر فوج کشی کرتے رھے۔ خلیفہ ھارون الرشید کا عہد صائفہ کے لئے خاص طور پر مشہور ھے۔ آس نے بذات خود ان جنگوں میں حصہ لیا، اور سرحد کو مستحکم کرنے کے لئے ایک نیا فوجی صوبہ بنایا جو عواصم کہلاتا ھے۔ طرسوس اس کا صدر مقام تھا۔ اسے نہایت مستحکم طور پر قلعبند کیا گیا تھا، اور اس کے نواح میں قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا گیا تھا۔ خلیفہ مامون نے اپنے باپ کے کام کو جاری رکھا۔ وہ بھی بذات خود ان جنگوں میں شرکت کرتا تھا، اور قلعوں کی تعمیر آس کے عہد میں بھی جاری رھی تھی۔ یہیں سرحد پر، جب کہ وہ طرسوس کے قریب طیانہ یا طوانہ کا قلعہ تعمیر کرانے میں مصروف تھا، آس نے سنہ ۲۱۸ (سنہ ۸۳۳) میں انتقال کیا۔

خلافت عباسیہ کے انحطاط کے زمانہ میں صائفہ میں پہلے کی سی باقاعدگی نہ رھی تھی۔ اب تک قاعدہ یہ تھا کہ ان مہموں کا تعلق براہ راست مرکز خلافت سے ھوا کرتا تھا؛ اور اگر خلیفہ

بذات خود آس میں حصہ نہ لے تو بھی تمام کام آسی کی نگرانی میں عمل میں آتا تھا۔ اب خلفاء کمزور ھوگئے تھے، ترک امراء ان پر حاوی تھے، اور ان کے پاس فوج تھی نہ دولت کہ ان مہموں کا انتظام کرسکیں، خود امراء اپنے اپنے منصوبوں میں مشغول تھے۔ سازشیں اور خانہ جنگیاں انہیں اتنی مہلت نہ دیتی تھیں کہ اس طرف متوجہ ہوں۔ اب طریقہ یہ ھوگیا تھا کہ جو امیر شام و فلسطین کا حاکم ھوتا وھی ان مہموں کی نگرانی کرتا۔ مگر ان حاکموں کی حالت خود اس قدر مخدوش تھی کہ انہیں خبر نہ تھی کہ کل پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آئیگا، اور وہ اپنی جگہ پر قائم رھینگے یا کسی سازش یا خانہ جنگی کا شکار ھو جائینگے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی وہ سرحد کی حفاظت کی طرف بالکل توجہ نہ کرسکتے تھے۔

ایسی حالات میں دشمن کا شیر ھو جانا یقینی تھا۔ قسطنطنیہ کی سلطنت بوسیدہ ضرور تھی، اور دارالسلطنت میں آئے دن کشت وخون اور انقلابوں کی وجہ سے مرکزی حکومت برابر کمزور ھوتی جارھی تھی۔ قیصر اکثر و بیشتر، نالائق، عیش پسند اور ھر لحاظ سے بدترین قسم کے لوگ تھے۔ عوام کی حالت روز بروز خراب ھوتی جا رھی تھی۔ نظم و نسق ابتر تھا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اسلامی سرحد پر ان کی تاخت و تاراج جاری تھی، اور چونکہ اب سرحد کی حفاظت کا کما حقہ انتظام نہ تھا، اس لئے انہیں ھمیشہ کامیابی ھوتی تھی۔ ھم لکھہ چکے ھیں کہ حلب کی مخدوش حالت اور سیف الدولہ کی مشغولیت سے انہوں نے فائدہ آٹھا کر اسلامی سرحد پر حملہ کیا تھا، اور سیف الدولہ کو دوسرے کام چھوڑ کر اس کا جواب دینا پڑا تھا۔

سنہ ۳۳٦ (سنہ ۹٤۷) میں جب حلب اور آس کے اعمال مستقلاً سیف الدولہ کے قبضے میں آگئے تو وہ بھی یہ کرسکتا تھا کہ ھم عصر امراء کی طرح خانہ جنگیوں میں حصہ لیتا، اور اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر سرحد کے مالک ھونے کی وجہ سے اب آس کا فرض یہ تھا کہ آسے محفوظ رکھے، اور حتی الامکان یونانیوں کے حملے کو روکتا رھے، تاکہ خود آسے اور عام مسلمانوں کو ان دیرینہ دشمنوں کی طرف سے اطمینان ھو جائے۔ اب اس نے ھر طرف سے کنارہ کشی ھو کر یہ فرض ادا کرنا اپنا سب سے بڑا کام سمجھا۔ آئندہ زندگی میں شائد ھی کوئی سال ایسا گذرا ھو جس میں آس نے بذات خود یا اپنے سپہ سالاروں کے ذریعہ سے یونانی

علاقہ پر فوج کشی نہ کی ہو ، یا ان کی دست درازیوں کو نہ روکا ہو ۔ اس نے یہ فرض کس طرح ادا کیا ، اور کہاں تک کامیاب رہا ، اس کا اندازہ آئندہ اوراق پڑھنے سے ہوگا ۔

سنہ ۳۳٦ (سنہ ۹۴۷) میں سیف الدولہ قلعہ برزویہ کے محاصرہ کے قصد سے روانہ ہوا ۔ یہ قلعہ عوام میں برزیہ کہلاتا تھا ، اور شام کے ساحل پر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا ۔ اس کے گرد چاروں طرف گہری وادیاں تھیں ، اور قلعہ کی فصیل (۵۰۷) درعہ اونچی تھی اہل فرنگ میں یہ قلعہ ناممکن التسخیر سمجھا جاتا تھا [۱] ، اور اس وقت یونانیوں کے زیر سیادت ابو تغلب کرد کے قبضے میں تھا ۔ سیف الدولہ اس قلعہ کی فتح سے ایک طرف تو یونانیوں کو مرعوب کرنا چاہتا تھا ، اور دوسری طرف اس کا مقصد مسلمانوں کی تالیف قلوب تھا ۔ سیف الدولہ کے محاصرہ کے دوران میں دمستق لیو ، بظاہر اس خیال سے کہ سیف الدولہ برزویہ کا محاصرہ اٹھالے ، الحدث کی طرف بڑھا ۔ لیکن چونکہ سیف الدولہ قسم کہا چکا تھا کہ برزویہ کو فتح کئے بغیر واپس نہ ہوگا ، اس لئے اس نے اہل حدث کی کوئی مدد نہ کی ۔ اسے یونانیوں نے فتح کرلیا ، اور چونکہ لیو جانتا تھا کہ وہ اس پر مستقل طور پر قابض نہیں رہ سکتا ، اس لئے اس نے فصیل شہر مسمار کرادی ۔ سیف الدولہ آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ، اور برزویہ کی فتح کے بعد وہ جمادی الثانی سنہ ۳۳۷ (ختم سنہ ۹۴۸ یا آغاز سنہ ۹۴۹) میں وہ انطاکیہ آیا ، جہاں متنبی نے اپنا وہ قصیدہ اس کے سامنے پیش کیا جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

وفاء کما کالربع اشجاہ طاسمہ — بان تسعدا والدمع اشفاہ ساجمہ

سیف الدولہ ابھی انطاکیہ ھی میں تھا کہ اسے اپنی والدہ کی موت کی خبر ملی ۔ اس کے والدہ نے سنہ ۳۳۷(سنہ ۹۴۸) میں میافارقین میں انتقال کیا، اور وھیں دفن ہوئی ۔ متنبی نے اس کا ایک مرثیہ کہا جو اس طرح شروع ہوتا ہے [۲] ۔

---

[۱] یاقوت ۔ لفظ برزویہ ۔ [۲] دیکھو ۔ Saifuddulah مصنفہ صدر الدین ۔ ص ۵۵ ۔ اور اس صفحہ کا حاشیہ (۱) ۔

نعد المشرفیة والعوالی   وتقتلنا المنون بلا قتال

حلب واپس آ کر سب سے پہلے اس نے اپنے چچازاد بھائی، ابو وائل تغلب بن داؤد کو، جو اس کی طرف سے حمص کا حاکم تھا، آزادی دلائی۔ ابو وائل نے شورہ پشت عربوں کے خلاف فوج کشی کی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں بنی کلب کے ایک شخص المبرقع نے نبوت کا دعوے کیا، اور طے اور کلب کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہوگئے۔ اس شخص نے ایک جنگ میں ابو وائل کو گرفتار کرلیا، اور بہت سے گھوڑے اور کثیر رقم بطور فدیہ طلب کیا۔ سیف الدولہ نے منظور کرلیا۔ مگر جب المبرقع فدیہ کا انتظار کر رہا تھا تو سیف الدولہ اچانک اس پر حملہ آور ہوا اور اسے قتل کر کے ابو وائل کو آزاد کرالیا [۱]۔ اس کے بعد سیف الدولہ کو معلوم ہوا کہ یونانی اب مرعش [۲] پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس

---

[۱] جمال الدین ابوالحسن علی نے سنہ ۳۳۶ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ، اس سال سیف الدولہ نے الهادی نام ایک قرمطی کو گرفتار کر کے ابو وائل کو آزاد کرایا،،۔ اس کی تفصیل وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ: ابو وائل تغلب بن داؤد بن حمدان اپنے چچازاد بھائی کی طرف سے حمص کا حاکم تھا۔ اس نے ان عربوں کے خلاف فوج کشی کی جو الحدث میں قلعبند ہوگئے تھے اور ہر سمت میں تباہی و بربادی پھیلا رہے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک قرمطی صاحب الخال طے اور کلب کے بہت سے آدمیوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ اس میں اور ابو وائل میں جنگ ہوئی، اور ۱۱ شعبان کو اس نے ابو وائل کو گرفتار کرلیا۔ جب سیف الدولہ کو حلب میں یہ معلوم ہوا تو وہ وہاں سے چلا، اور شہر سے (۳۶) میل کے فاصلے پر معرۃالنعمان میں خیمہ زن ہوا۔ پھر تین دن حمص میں رہا، اور چوتھے دن صبح ہوتے ہوتے دریائے امہین؟ کے کنارے کے گاؤں میں قرمطی پر جا پڑا، اور اس کی فوج کو شکست دی۔ اس معرکے میں قرمطی کام آیا۔ حدث کے گاؤں کو سیف الدولہ نے یہ سزا دی کہ اسے مسمار کرادیا، اور وہاں کے باشندوں پر (۵۰۰۰) دینار جرمانہ کیا۔ یہ مہم صرف نو دن میں انجام کو پہنچی۔

سنہ ۳۳۷ میں سیف الدولہ نے برزیہ فتح کیا، جو چوروں اور رہزنوں کا ملجاء و ماوے بنا ہوا تھا۔ یہ مقام قنسرین اور حمص کے علاقہ میں ہے،،۔ دیکھو فریٹاگ۔ ص ۱۸۶، ۱۸۷ ۔

[۲] مرعش کا شہر شام اور یونانی سرحد پر واقع تھا۔ اسے پہلے خلیفہ مروان ثانی اموی نے بسایا، اور ہارون الرشید نے دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس کی دو فصیلیں تھیں، شہر کے بیچوں بیچ ایک قلعہ تھا جو مروان ثانی کے نام پر مروانیہ کہلاتا تھا، اور باہر ایک بستی تھی جو ہارونیہ کہلاتی تھی دیکھو یاقوت لفظ مرعش۔

نے محمد بن ناصر الدولہ کو بطور نائب حلب میں چھوڑا ، اور اهل مرعش کی مدد کے لئے روانہ هوگیا ، لیکن یونانیوں کے مقابلے میں شکست کھائی ، اور میافارقین واپس آ گیا [۱] یونانیوں نے مرعش پر قبضہ کر لیا ، اور طرسوس پر یورشیں شروع کیں ۔

ابھی سیف الدولہ حلب واپس نہیں آیا تھا کہ دمستق لیو نے بوقاس کے قلعہ پر فوج کشی کی ۔ محمد بن ناصر الدولہ نے بذات خود قلعے والوں کو مدد پہنچانی چاهی ، لیکن (۴۰۰) مقتولین اور بہت سے قیدیوں کا نقصان برداشت کر کے شکست کھائی ۔ اسی سال سیف الدولہ کے چہار سالہ بیٹے ابو الهیجا عبداللہ نے میافارقین میں انتقال کیا ۔ [۲] ماہ ربیع الاول میں یونانیوں نے کیلیکیا کا شہر فتح کیا ، اور یہاں کے باشندوں کو جان و مال کی امان دی ۔ فصیل شہر مسمار کرنے کے بعد یونانیوں نے شہر خالی کر دیا ۔

(۵)

ان متواتر ناکامیوں سے شکستہ دل هونے کے بجائے ، سیف الدولہ نے یونانیوں سے بدلہ لینے کی اور بھی زیادہ تندهی سے کوشش کی ۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر یونانی کہیں دوسری جگہ برسر پیکار هوں تو اسلامی سرحد پر انہیں شکست دینا زیادہ آسان هوگا ۔ اس نے ایك عظیم الشان فوج تیار کی اور ربیع الاول سنہ ۳۳۹ (اگسٹ ستمبر سنہ ۹۵۰) میں یونانی علاقہ کی طرف روانہ هوگیا ۔ [۳] طرسوس کے چار هزار سپاهی قاضی ابو حصین کی سرکردگی میں اس کے ساتھ تھے ۔ سب سے پہلے وہ قیصر یہ گیا ، اور پھر یونانی علاقہ میں داخل هوا ۔ بہت سے

---

[۱] یافعی ۔ ج ۲ ۔ ص ۳۲۴ ۔ [۲] حفاظت کے خیال سے سیف الدولہ کے اهل و عیال میافارقین میں رها کرتے تھے ۔ فریٹاگ ص ۱۸۷ ۔ [۳] اس مہم میں سیف الدولہ کی شکست کا ذکر سب کرتے هیں ۔ مثلاً ابن اثیر ج ۸ ۔ ص ۱۷ ابو الفداء ج ۲ ۔ ص ۹۸ ۔ یافعی ج ۲ ۔ ص ۳۲۹ ۔ مگر ان میں سے کسی نے واقعہ کو تفصیل سے بیان نہیں کیا ۔ تفصیل کے لئے دیکھو فریٹاگ ۔ ص ۱۸۷ ۔ الخ ۔ اس کے برعکس تغری بردی نے بیان کیا هے (ج ۲ ۔ ص ۳۲۹) کہ سیف الدولہ کو اس فوج کشی میں کامل فتح هوئی تھی ۔ وہ اپنے بیان کو ان الفاظ پر ختم کرتا هے :۔ وکانت غزوۃ مشهورۃ وغنم المسلمون مالا یوصف وبقو فی الغزوۃ اشهرا ۔

قلعے اس نے فتح کئے ، بے شمار قیدی اس کے ہاتھ آئے ، اور یونانیوں کی کثیر تعداد کام آئی۔ چونکہ یونانیوں نے اس کی کا حقہ مزاحمت نہیں کی تھی ، اور اسے اب تک برابر کامیابی ہو رہی تھی ، اس لئے وہ یونانی علاقے کے اندرونی حصہ میں داخل ہوا ، جو سمندر کے گرد واقع ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ملطیہ کے نواح میں خرشنہ پہنچا ، اور آخر صارخہ تک آیا ، جو قسطنطنیہ سے صرف تین دن کی مسافت پر ہے۔ وہ اس مقام کا محاصرہ کئے ہوا تھا کہ دمستق لیو نے اس کے مقدمۃ الجیش پر چھاپا مارا ، مگر ایسی شکست کھائی کہ بمشکل مسلمانوں کے ہاتھ سے بچ کر بھاگا اور ایک قلعہ میں پناہ گزین ہوا۔ دوسری تازہ دم فوج تیار کر کے اس نے دوبارہ سیف الدولہ کا مقابلہ کرنے کی ہمت کی ، اور پھر پہلے کی طرح شکست فاش کھائی ، اور اپنے بطریقوں کو میدان میں چھوڑ کر بھاگا ، جنہیں سیف الدولہ نے گرفتار کر لیا۔ مہینوں تک فاتح ان علاقوں میں گشت لگاتے رہے ، اور بے حساب مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔

اب دمستق کو اندازہ ہوا کہ وہ کھلے میدان میں سیف الدولہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ سیف الدولہ پر ایسی جگہ حملہ کیا جائے کہ ہر صورت میں جنگی لحاظ سے یونانیوں کو اس پر فوقیت رہے۔ چنانچہ اس نے ایک تنگ درہ پر قبضہ کر لیا۔ واپسی میں سیف الدولہ کو اسی درہ میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ دمستق نے خفیہ طور سے پہاڑوں پر اپنی فوج پھیلا دی ، اور موقع کا منتظر رہا۔ یہ درہ درب الکنکرون کہلاتا ہے ، اور الحدث کے علاقے میں واقع ہے۔ گذشتہ واقعات میں سیف الدولہ کے مقدمۃ الجیش نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا ، اور سپاہی تھکے ماندے تھے۔ اس حصہ فوج کو سیف الدولہ نے آگے بھیجا۔ دمستق نے اس خیال سے کہ شبہ پیدا نہ ہو اسے بغیر مزاحمت کے گزر جانے دیا۔ اس کے بعد اس نے درہ کا تنگ راستہ عظیم الشان درخت کاٹ کر اور بڑی بڑی چٹانیں لڑھکا کر بند کر دیا۔ اب سیف الدولہ کی فوج جب درہ میں پہنچی تو عقب سے یونانیوں نے اس پر حملہ کر دیا ، اور اسے اس طرح گھیرا کہ نہ تو سپاہی واپس جا سکتے تھے ، اور نہ ان درختوں اور چٹانوں میں سے گذر کر آگے راستہ پا سکتے تھے۔ اس وقت جو کشت و خون ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ سیف الدولہ کی تمام فوج یا تو قتل ہوئی یا گرفتار۔ خود سیف الدولہ چند جاں نثار سپاہیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگا۔

یہ جمادی الثانی سنہ ۳۳۹ (۲۰ نومبر ۹۵۰) کا واقعہ ہے۔ کتاب زبدۃ الحلب کے مصنف نے اس واقعہ کی تفصیل میں لکھا ہے کہ اس موقع پر سیف الدولہ اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہوکر بھاگا تو یونانیوں نے اسے پہچان کر اس کا تعقب کیا۔ آخر سیف الدولہ ایک بلند چٹان کے کنارے پر پہنچا اس کے سپاہی شکست کھا کر یا بد دل ہوکر اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، اور وہ تن تنہا اس پہاڑ پر کھڑا تھا۔ اگر توقف کرتا تو دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار کرتا۔ اس نے یہ پسند نہ کیا، بلکہ گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور گھوڑا ایک ذقند میں بلا گزند پہاڑ سے میدان میں پہنچ گیا اور یونانی منہ دیکھتے رہ گئے [۱]۔ من جملہ اور نقصانات کے جو سیف الدولہ کو برداشت کرنے پڑے (۵۰۰۰) دینار کی ایک ہنڈی، جو خلیفہ کے وزیر ابن مقلہ نے بنی حمدان کے خرچ کے لئے بھیجی تھی۔ یونانی علاقہ میں سیف الدولہ کی اس یورش کو عرب مورخ غزاۃ المصیبۃ کہتے ہیں۔ اس زبردست فتح کے بعد دمستق نے سیف الدولہ سے صلح کی درخواست کی، کیونکہ وہ اس وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھا۔ لیکن سیف الدولہ نے نہ صرف صلح کرنے سے انکار کیا، بلکہ دمستق کو آئندہ کے لئے بھی دھمکیاں دیں۔

---

[۱] عربوں کی اس شکست کے حالات لیودیاکونوس (Leodiaconus) نے لکھے ہیں وہ لکھتا ہے کہ شکست کے بعد سیف الدولہ بھاگتے ہوئے راستہ میں سونا چاندی بکھیرتا جاتا تھا، تاکہ یونانی بجائے تعقب کرنے کے سونا چاندی جمع کرنے میں مشغول ہوجائیں۔ اقریطش کی جنگ کے خاتمہ پر نقفور (Nicephorus) کو سیف الدولہ سے لڑنے کے لئے ایشیا کا دمستق مقرر کیا گیا تھا، اور اس نے تقریباً (۶۰) قلعے فتح بھی کئے تھے۔ مگر اسی دوران میں قیصر روما نوس کا انتقال ہوگیا، اور اس کے دو بیٹے بازیل، اور قسطنطین اس کے جانشین ہوئے۔ اب قسطنطنیہ کے دربار میں سازشوں کا دور دورہ ہوا۔ نقفور کچھ مدت تک ان سازشوں کا شکار رہا۔ آخر بطریرک پولیوکتوس نے ان سے آسے نجات دلائی۔ اب اس نے نئے سرے سے سیف الدولہ پر چڑھائی کی اور طرسوس پر حملہ آور ہوا۔ مگر دربار کی سازشوں نے اب بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ انجام کار نقفور کے قیصر ہونے کا اعلان کردیا گیا۔ نئے قیصر نے شمشقیق (Tzemisces) کو دمستق مقرر کیا۔ لیودیاکونوس نے بہت سے واقعات بیان نہیں کئے جو عرب مورخوں نے لکھے ہیں۔ اس کی یا تو یہ وجہ تھی کہ اس کا اصلی مقصد یونانیوں کی تاریخ لکھنا تھا، یا وہ ان واقعات سے ناواقف تھا۔ دیکھو فریٹاگ۔ ص ۱۸۹۔ بازنطینی تاریخ کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

سیف الدولہ نے اب بھی ہمت نہ ہاری؛ اور موصل، الجزیرہ، شام اور صحراء کے باشندوں کی ایک نئی فوج مرتب کر کے سنہ ۳۴۰ (سنہ ۵۱ - ۹۵۲) میں دوبارہ یونانی علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ وہ کامیاب رہا، اور بہت کچھ قتل و غارت کے بعد حلب واپس آ گیا [۱]۔ وہ حران سے ہوتا ہوا آمد آیا، جسے فتح کرنے کی یونانی کوشش کر رہے تھے۔ ایک یونانی نے وعدہ کیا تھا کہ فوج کو ایک سرنگ کے ذریعہ سے شہر میں داخل ہونے کا راستہ بتا دیگا۔ یہ وعدہ اس نے پورا کیا۔ لیکن جونہی یونانی شہر میں پہنچے، اہل شہر ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں قتل کر کے سرنگ کا منہہ بند کر دیا۔ اس سال حلب اور عواصم میں زبردست زلزلہ آیا، جس کا سلسلہ چالیس دن تک رہا۔ اس میں جان و مال کا بے انتہا نقصان ہوا۔ قلعہ دلوک کے تین برج گر گئے، اور رعبان اور تل حامد دونوں بالکل برباد ہو گئے [۲]۔

سنہ ۳۴۱ (سنہ ۵۲ - ۹۵۳) میں سیف الدولہ نے مرعش کو دوبارہ تعمیر کرایا [۳]۔ دمستق نے اس میں مزاحمت کرنی چاہی، مگر سخت شکست کھائی۔ اس کا بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ سروج فتح کر کے وہاں کے باشندوں کو گرفتار کر لیا، مال و اسباب لوٹ لیا، اور شہر اور خاص طور پر وہاں کی مسجدیں جلا ڈالیں [۴]۔

سنہ ۳۴۲ (سنہ ۵۳ - ۹۵۴) میں سیف الدولہ نے زبطرہ پر فوج کشی کی، جو ملطیہ، سمیساط، حدث اور عرقہ کے درمیان واقع ہے۔ اس مہم میں اس کا مقابلہ بردس فوکس کے تیسرے بیٹے قسطنطین سے موسر کے درے میں ہوا، اور فریقین نے اس میں بہت نقصان اٹھایا۔ اس واقعہ کے بعد سیف الدولہ دریائے فرات کو عبور کر کے یونانیوں کی سرحد پار بطن ھنزیت پہنچا، اور پھر سمیساط کی طرف روانہ ہوا۔ اس عرصہ میں دمستق انطاکیہ جا چکا تھا۔ یہ خبر سن کر سیف الدولہ

---

[۱] ابن تغزی بردی ج ۲ - ص ۳۳۰۔ [۲] ابن تغزی بردی - ج ۲ - ص ۳۳۱ -

[۳] الطباخ - ج ۱ - ص ۲۵۸۔ اس موقع پر متنبی نے ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع ہے -
فدنیاك من ربع وان زدتنا کربا ۔ فانك کنت الشرق للشمس والغربا (دیکھو ایضاً) -

[۴] ابوالفداء ج ۲ - ص ۱۰۰ - ابن تغری بردی ج ۲ - ص ۳۳۳ -

سمیساط سے پلٹا ، اور مرعش کے مقام پر دشمن سے مقابل ھوا۔ یونانیوں نے شکست کھائی ، بطریق لیو جنگ میں کام آیا ، اور دمستق کا نوجوان بیٹا قسطنطین گرفتار ھوا۔ سیف الدولہ اسے اپنے ساتھ حلب لے گیا ، اور وھیں اس نے انتقال کیا [۱]۔ سیف الدولہ نے اس کی لاش حلب کے عیسائیوں کے حوالے کردی ، جنھوں نے اسے نہایت قیمتی تابوت میں بند کر کے ایک گرجا میں دفن کر دیا۔ سیف الدولہ نے تعزیت کا ایک خط اس کے باپ کو لکھا۔ لیکن باپ کو اپنے نوجوان بیٹے کی موت کا اس قدر صدمہ ھوا کہ وہ دنیا ترک کر کے راھب ھو گیا۔ متنبی کے ذیل کے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ھے ۔

فلو کان ینجی من علی ترھبٌ — ترھبت الاملاک مثنی و موحدا

اسی واقعہ کے متعلق ایک اور شاعر ابو عباس احمد بن نامی کہتا ھے ۔

لکنه طاب الترھب خیفة — ممن له تتقاصر الاعمار
فما کان قائم سیفه عکازة — و مکان ما یتمنطق الزنار [۲]

ماہ ربیع الاول سنہ ۳۴۳ (جولائی سنہ ۹۵۴ء) میں سیف الدولہ نے یونانی علاقہ پر فوج کشی کی ، اور تمام علاقہ دل کھول کر پامال کیا۔ بہت سے یونانی قید ھوئے۔ مقتولین میں دمستق کا

---

[۱] الطباخ (ج ۱۔ ص ۲۵۹) نے ابن شداد کی کتاب الاعلاق الخطیرة سے نقل کیا ھے کہ قسطنطین نے قید کے زمانہ میں اپنے باپ بردس فوکس کو لکھا تھا کہ سیف الدولہ اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آتا ھے ، اور مرض کے دنوں میں بذات خود اس کی خدمت کرتا ھے ۔ بردس فوکس نے (۸۰۰۰۰) دینار اور تین ھزار مسلمان قیدی اس کے بدلے میں پیش کئے۔ مگر سیف الدولہ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبور ھو کر بردس فوکس نے ایک عیسائی عطار کو حلب بھیج کر خود ھی اپنے بیٹے کو زھر دلادیا۔

[۲] دی تریسی Mutanabbi und Sayfuddaulah(Dieterici) - ص ۱۰۰ -

ایک بیٹا بھی شامل تھا۔ دمستق بردس فوکس [۱] کو جب اس فوج کشی کی اطلاع ہوئی تو وہ تقریباً (۵۰۰۰۰) پیادہ اور سوار فوج لے کر، جس میں رومی، بلغاری، روسی اور ارمنی شامل تھے، سیف الدولہ کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ شعبان سنہ ۳۴۳ (اکتوبر سنہ ۹۵۴) میں فریقین کا مقابلہ الحدث کے مقام پر ہوا۔ دن بھر کی لڑائی کے بعد آخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ متعدد بطریقوں کے علاوہ دمستق کا داماد اور نواسا دونوں گرفتار ہوئے [۲]۔ عکبری لکھتا ہے [۳] کہ اس جنگ میں یونانی فوج نے مسلمانوں کو اس بری طرح گھیر لیا تھا کہ ان کے لئے نجات کی بظاہر کوئی صورت نہ رہی تھی۔ مگر سیف الدولہ کے تہور نے یکایک تمام حالات بدل دیے۔ وہ پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ حملہ کر کے یونانیوں کی صفوں کو چیرتا ہوا دمستق تک پہنچ گیا۔ دمستق اس سے اتنا گھبرایا کہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگا، اور پھر اس کی فوج کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ بردس فوکس کا بیٹا قسطنطین بقیہ جنگ کے دوران میں الحدث کے قریب ایک سرنگ میں چھپا رہا، اور

---

[۱] بردس فوکس کے راہب ہو جانے کا ذکر ہم پہلے پڑھ آئے ہیں۔ یہاں جس دمستق کا ذکر ہے وہ یقیناً بردس فوکس ہی ہوگا۔ اس لئے پہلے بیان میں غالباً مورخوں سے غلطی ہوئی ہے، اور انہوں نے کسی اور شخص کو دمستق سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح اس مہم میں ابن اثیر (ج ۸ - ص ۱۸۳) نے قسطنطین بن دمستق کے قتل کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اس کی موت کا ذکر سنہ ۳۴۲ کے واقعات میں ہو چکا ہے۔ یہاں بھی اسی قسم کا مغالطہ معلوم ہوتا ہے۔ [۲] ابن اثیر ج ۸ - ص ۱۸۳ - ابوالفداء (ج ۲ - ص ۱۰۰) لکھتا ہے کہ سیف الدولہ نے ماہ ربیع الاول سنہ ۳۴۳ میں یونانی علاقہ پر فوج کشی کی تھی اور ایک زبردست جنگ کے بعد سیف الدولہ کو فتح ہوئی تھی۔ متنبی کے شارح عکبری نے یہ واقعہ جمادی الثانی سنہ ۳۴۳ کا بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ اس میں تین ہزار یونانی کام آئے تھے۔ دیکھو الطباخ - ج ۱ - ص ۲۶۰ - [۳] الطباخ - ج ۱ - ص ۲۶۰ - مصنف نے عکبری کی عبارت نقل کی ہے۔ اگر عکبری یا ابوالفداء کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو ماہ رجب میں قلعے کی تعمیر کی تکمیل قرین قیاس ہے۔ لیکن اگر واقعہ کی تاریخ شعبان سمجھی جائے تو ظاہر ہے کہ بیان ما بعد بے معنی ہو جاتا ہے۔

رات کو اپنے باپ سے جا ملا - فتح پانے کے بعد سیف الدولہ اس وقت تک قلعے کے قریب مقیم رہا جب تک کہ اس کی تعمیر مکمل نہ ہو گئی - اس کی تکمیل رجب سنہ ۳۴۳ میں ہوئی -

سنہ ۳۴۴ (سنہ ۹۵۵-۹۵۶) میں بردس فوکس نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے روسیوں، بلغاریوں اور دوسری اقوام کی ایک فوج مرتب کی اور ماہ جمادی الاول میں الحدث کا محاصرہ کیا - وہ اتنا کامیاب ہوا کہ اس کی فوج نے شہر کی فصیل میں شگاف کر لیا ، مگر یونانی فوج شہر میں داخل نہ ہو سکی ، کیونکہ اسی وقت بردس فوکس کو معلوم ہوا کہ سیف الدولہ اس کے مقابلے کے لئے آرہا ہے اس نے محاصرہ اٹھا لیا - متنبی نے اس واقعہ کا ذکر ایک قصیدہ میں کیا ہے ، جس کا مطلع ہے -

ذی المعالی فیعلون من تعالا — هکذا هکذا و الا فلا لا

سنہ ۳۴۴ میں، نویری اور جمال الدین کے بیان کے مطابق طرسوس ، اذنہ اور مصیصہ کے لوگ سیف الدولہ کے پاس آئے - ان کے ساتھ قیصر کے سفیر بھی تھے، انہوں نے صلح کی درخواست کی، جسے سیف الدولہ نے منظور کر لیا [۱] -

سنہ ۳۴۵ (سنہ ۹۵۶ - ۹۵۷) میں سیف الدولہ نے بطن ھنزیت پر فوج کشی کی، اور دریائے ارناس کے کنارے ٹھہرا - کشتیوں کے ذریعہ دریا کو عبور کر کے وہ قلعہ تل بطریق پر حملہ آور ہوا - یہاں کا حاکم شمشقیق کا بیٹا یانس تھا - اسے بے دخل کر کے سیف الدولہ قلعہ پر قابض ہو گیا - اس موقع پر جو لڑائی ہوئی اس میں البلطس (Balantes) کا بیٹا ، اور شمشقیق کا داماد دونوں کام آئے ، اور ابن قلموط گرفتار ہوا - اس سے فارغ ہو کر سیف الدولہ درب الخیاطین واپس آیا، اسے معلوم ہوا کہ دمستق اور اس کا بیٹا کذوبہاے ھی سے اس پر قابض ہیں - مگر جنگ میں سیف الدولہ کو فتح ہوئی، اور وہ اچانک آمد کے سامنے ظاہر ہوا - جب سیف الدولہ اس مہم پر روانہ ہوا ہے تو اس نے اپنے چچازاد بھائی ابوالعشائر ابن حسین کو قلعہ دلوک [۲] کا حاکم مقرر کیا تھا، اور حکم دیا تھا کہ قلعہ عرنداس کی تعمیر کی تکمیل کرائے - دمستق لیو [۳] نے اس پر حملہ کر کے اسے شکست دی اور گرفتار کر کے اپنے ساتھ قسطنطنیہ

---

[۱] فریٹاگ - ص ۱۹۲ - [۲] حلب کے نواح میں صوبۂ عواصم کا ایک چھوٹا شہر ہے یاقوت لفظ دلوک - [۳] لیو دمستق نہیں تھا، بلکہ اپنے باپ بردس فوکس کے ماتحت فوج کا افسر تھا -

لے گیا ۔ یہیں ابوالعشائر نے وفات پائی ۔ ماہ جمادی الثانی سنہ ۳۴۵ کی مہم میں سیف الدولہ نے بہت سے مقامات مثل خرشنہ ، صارخہ وغیرہ تباہ کئے، اور رست بن البلنطس (Rost son of Balantes) لاون بن الاسطراطیقوس (Leo son of Stratikos) اور ملکونہ کے بطریق ابن غزال کو گرفتار کیا ۔ خالدیات کے بطریق اور دمستق نے بھاگ کر جان بچائی [۱] ۔

سعید بن بطریق کی تاریخ کے ذیل میں بیان کیا گیا ھے کہ سیف الدولہ نے سمید [۲] پر فوج کشی کی تھی اور اسطراطیقوس بن البلنطس کو قید کر لیا تھا ۔ وھاں سے واپس آتے ھوئے آس نے حصن زیاد کا محاصرہ کیا ۔ یہاں اس کا مقابلہ دمستق کے بیٹے سے ھوا جو سیف الدولہ کی آمد کی خبر سن کر شامی سرحد سے اسی غرض سے آیا تھا ۔ اس عرصہ میں خود دمستق الحدث کا محاصرہ کر چکا تھا ۔ آس نے اھل شہر کی جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا ، اور اسی وعدہ پر شہر اس کے حوالے کر دیا گیا ۔ سیف الدولہ الحدث کی کوئی مدد نہ کرنا چاھتا تھا ، کیونکہ یہاں کے باشندے اکثر آس کی اطاعت سے انحراف کرچکے تھے ۔ لیکن واپس ھوتے ھوئے آس نے اس کا انتظام کر دیا کہ یونانیوں کی طرف سے مسلمان قیدیوں پر کسی طرح کی سختی نہ ھونے پائے ، اور انہیں آزاد کردیا جائے [۳] ۔

سیف الدولہ کے خلاف نو برس کی مسلسل جنگ و جدل کے بعد یونانیوں کو اس بات کا احساس ھوا تھا کہ اگر سیف الدولہ کو فتح ھو تو ان کے لئے خود انہیں کے علاقے میں کوئی جائے پناہ باقی نہیں رھتی : اور اگر شکست ھو تو آس کا اثر چند ماہ سے زیادہ باقی نہیں رھتا ، بلکہ

---

[۱] فریٹاگ ۔ ص ۱۶۳ ۔ ابن اثیر یا کسی اور مورخ نے سنہ ۳۴۵ کے واقعات کی تمام تفصیل بیان نہیں کی ۔ ابن اثیر (ج ۸ ۔ ص ۱۸۷) نے صرف یہ لکھا ھے کہ اس سال ماہ رجب میں سیف الدولہ نے بلاد روم پر فوج کشی کی، خرشنہ اور صارخہ تک پہنچا، بہت سے قلعے فتح کئے مال غنیمت اور قیدی خوب حاصل ھوئے ۔ اس کے بعد وہ اذنہ آیا ، اور یہاں سے حلب واپس ھوا ۔ یونانیوں نے اپنی شکستوں کا بدلہ اس طرح لیا کہ میافارقین پر حملہ کر کے، قتل و غارت کے بعد ، سواد شہر کو جلا دیا ۔ [۲] سمید نام کے کسی مقام کا ذکر یاقوت نے نہیں کیا ۔ ممکن ھے کہ یہ سمندرو ھو ۔ [۳] فریٹاگ ص ۱۹۳ ۔ الخ ۔

پہلے سے بڑی اور عظیم الشان فوج کے ساتھ وہ آن سے لڑنے کے لئے میدان میں نکل آتا ھے۔ مدتوں سے یونانیوں کو مسلمانوں میں ایسا مد مقابل نہیں ملا تھا۔ اب انہیں پورا اندازہ ھو گیا کہ کھلے میدان میں سیف الدولہ کو شکست دے کر برباد کرنا ناممکن ھے۔ اس لئے انہوں نے سازش سے کام لینا چاہا اس سال جمادی الاول (اگست سنہ ۹۵۷) میں یونانیوں نے سیف الدولہ کے چند امراء سے سازباز کیا، اور رشوتیں دے کر انہیں اس پر آمادہ کر لیا کہ جب سیف الدولہ دمستق کے مقابلے کے لئے روانہ ھو تو آسے گرفتار کر کے دمستق کے حوالے کر دیں۔ مگر ایک امیر، ابن کیغلغ، کو ایک فراش کے ذریعہ اس سازش کی اطلاع ھو گئی۔ قبل اس کے کہ سازشیوں کو اس کا علم ھو کہ ان کا راز طشت از بام ھو گیا ھے، سیف الدولہ نے بدووں اور دیالمہ کی ایک جمعیت مہیا کر لی اور حکم دیا کہ جونہی وہ اشارہ کرے یہ لوگ ان سازش کرنے والوں پر ٹوٹ پڑیں، اور ان کا قلع قمع کر دیں حلب کی دیواروں کے باھر اس حکم پر عمل کیا گیا۔ حرس کے (۱۸۰) سپاھی قتل اور (۲۰۰) قید ھوئے۔ ان قیدیوں کے ھاتھ، پیر اور زبانیں کاٹ ڈالی گئیں۔ مجرموں میں سے صرف چند ھی اپنی جانیں بچا کر بھاگ سکے۔ اس کے بعد سیف الدولہ حلب واپس آ گیا، جہاں آس نے (۴۰۰) قیدیوں کے قتل کا حکم دیا۔ دمستق کے بیٹے کو بھاری ھتکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر محل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ فراش کو، جس نے سب سے پہلے اس سازش کی اطلاع دی تھی، بڑے بڑے انعامات دئے گئے، اور ابن کیغلغ کو اس کی وفاداری کے صلے میں، وسیع جاگیر عطا ھوئی۔ رس کے جو سپاھی باقی رہ گئے ان پر بھی سیف الدولہ کو اعتماد نہ رھا [۱]۔

ظاھر ھے کہ اس سازش کے بعد سیف الدولہ کو اپنے سپاھیوں بلکہ امراء پر بھی بھروسہ ں رھا تھا۔ اس لئے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ سنہ ۳۴۶ (سنہ ۹۵۷) میں آس نے یونانیوں پر فوج کشی ں کی۔ یانس بن شمشقیق (Joannes Tzimisces) نے ربیع الاول سنہ ۳۴۷ (مئی جون سنہ ۹۵۸) میں ار بکر کے شہر آمد، ارزن، اور میافارقین پر یورش کی، سمیساط کو برباد کیا، اور حصن الیمانی کا صرہ کر لیا۔ سیف الدولہ نے آس کے مقابلہ کے لئے نجا الکاسکی کو دس ھزار فوج دے کر روانہ کیا۔ گر نجا نے سخت سکشت کھائی۔ آس کے (۵۰۰۰) سوار کام آئے، اور (۳۰۰۰) پیادے گرفتار ھوے۔

---

[۱] فریٹاگ۔ ص ۱۹۴ –

اس کے علاوہ آس کی تمام چھاؤنی یونانیوں کے قبضے میں آ گئی ۔ اس فتح کے بعد یانس اور البراکوس سمیساط گئے اور اس پر قبضہ کرلیا ۔ یہاں سے جب وہ رعبان کی طرف کوچ کررھے تھے تو سیف الدولہ نے بذات خود ان کا مقابلہ کیا ؛ مگر شعبان سنہ ۳۴۶ (اکتوبر نومبر سنہ ۹۵۸) میں شکست کھائی ۔ اور یانس نے آس کا تعقب کیا ۔ یونانیوں نے بہت سے سپاھیوں کو قتل کیا ، اور آس کے اھل قبیلہ کو گرفتار کرلیا ۔ آس کے (۱۷۰۰) قیدی قسطنطنیہ بھیج دئے گئے ، جہاں انہیں تمام شہر میں گشت کرایا گیا ۔ اسی زمانہ میں یونانیوں نے قورس [۱] پر حملہ کیا ، اور بہت سے لوگ پکڑ کر لے گئے ۔ مگر سیف الدولہ نے انہیں رھا کرالیا ۔

اس عرصے میں سیف الدولہ ایک نئی پریشانی میں مبتلا ھوا ۔ ناصرالدولہ موصل کا حکمران تھا ۔ بغداد کے دربار میں اس کا رسوخ اب تک باقی تھا ۔ مگر سلطان معزالدولہ بن بویہ نے اسے اتنا پریشان کیا کہ وہ مع اھل وعیال موصل سے بھاگ کر حلب آ گیا ۔ سیف الدولہ نے حلب سے چار فرسخ آگے بڑھ کر اپنے بڑے بھائی کا استقبال کیا ، اور اسے دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا ۔ محل میں پہنچ کر اس نے ناصرالدولہ کو تو تخت پر بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے ھاتھ سے اس کا جوتا اتارا ۔ سیف الدولہ کا خیال تھا کہ ناصرالدولہ اس سے اس قسم کی خدمات نہ لے گا ۔ لیکن ناصرالدولہ نے نہ صرف اس وقت ان باتوں کی پروا نہ کی ، بلکہ سیف الدولہ کے عزت و احترام کا آئندہ نہایت ھی برا بدلہ دیا ۔ بہرکیف سیف الدولہ نے ان باتوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی ۔ اس نے اپنے بھائی کے نوکروں کو خلعتیں اور انعامات عطا کئے ، جن کی مقدار (۳۰۰۰۰۰) دینار تھی ، اور پھر خط و کتابت کر کے معزالدولہ اور ناصرالدولہ میں صلح کرادی اور (۲۰۰۰۰۰) دینار بطور تاوان معزالدولہ کو ادا کئے [۲] ۔

(۶)

سنہ ۳۴۸ (۹۵۹) میں قیصر قسطنطین کا انتقال ھو گیا ، اور روماںوس دوم آس کا جانشین ھوا ۔ یہ نیا قیصر بذات خود نہایت ناکارہ اور عیاش شخص تھا ۔ مگر ، جہاں تک اسلامی

---

[۱] قورس شہر حلب کے نواح میں ایک قدیم بستی تھی ، یاقوت کے زمانہ میں یہ برباد ھوچکی تھی ۔ یاقوت لفظ قورس ۔ [۲] ابن مسکویہ ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۷۱ ، ۱۷۲ ۔

جنگوں کا تعلق ھے ، اس کا عہد بہت شاندار رھا ۔ اس زمانے میں ایک تو یونانیوں کو اچھے تجربہ کار سپہ سالار مل گئے ۔ دوسری طرف سیف الدولہ اپنی خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھا ، اور گذشتہ سال کی سازش کی وجہ سے اپنے ملازموں اور امیروں پر آسے بھروسہ نہ رھا تھا ۔ لھذا اب آسے اتنی شاندار کامیابی نہیں ھوئی جتنی کہ پہلے ھوئی تھی ۔ روما نوس نے جب جزیرہ اقرلطیش [۱] کی فتح کی تکمیل کرنی چاھی تو یہ کام دمستق نقفورنوکس کے سپرد کیا ، اور نقفور کے بھائی لیوفوکس نے قیصر کے حکم سے طرسوس فتح کرنے کے لئے ایک فوج مرتب کی [۲] ۔ اس مہم میں لیو کو بہت کامیابی ھوئی ۔ آس نے بہت سے قیدی اور معتدبہ مال غنیمت حاصل کیا [۳] ۔ ماہ شوال سنہ۳۴۸ (سنہ ۹۵۹) میں لیو نے ھارونیہ [۴] فتح کیا ۔ اسی سال آس نے رھا اور حران پر چڑھائی کی اور صوبۂ دیار بکر کو بالکل پامال کر ڈالا ۔ ان لوگوں میں جو اس مہم میں قید ھوئے ابوالفوارس محمد بن ناصرالدولہ بھی تھا ، جو مع اپنی تمام فوج کے یونانیوں کے ھاتھ آیا ۔ یہ شکست نہایت سخت تھی ، اور مسلمانوں کے دلوں پر اس کا اتنا اثر ھوا کہ حلب کے خطیب ، عبد اللہ بن نباتہ ، نے جہاد کا واعظ کہنا شروع کیا [۵] ۔

جب سیف الدولہ ان مسلسل شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے روانہ ھوا تو یونانیوں نے اپنا راستہ بدل کر شام کا رخ کیا ۔ یہاں بھی انہیں کامیابی ھوئی ، اور بے شمار مال و دولت اور

---

[۱] یہ جزیرہ آس وقت مسلمانوں کے قبضے میں تھا ۔ سنہ ۲۳۰ (سنہ ۸۴۴) میں عمر بن شعیب نے آسے فتح کیا ، اور آخر وقت تک آسی کی اولاد کے قبضے میں رھا ۔ ابن تغری بردی ج ۲ ۔ ص ۳۵٦ ۔ [۲] فریڈلاگ ۔ ص ۱۹۵ ۔ [۳] ابن اثیر ۔ ج ۸ ۔ ص ۱۹۹ ۔

[۴] شام کی سرحد پر واقع تھا ۔ اور خلیفہ ھارون الرشید کا بسایا ھوا تھا ۔ اس کے گرد دھری فصیل تھی ، اور دروازے لوھے کے تھے ۔ یونانیوں کی بربادی کے وقت (۱۰۰۰) قیدی مرد و عورت اور بچے پکڑے گئے تھے ۔ یاقوت ۔ [۵] فریڈلاگ ۔ ص ۱۹۵ ۔

قیدی ان کے ہاتھ آئے۔ سنہ ۳۴۹ (سنہ ۹۶۰) کے آغاز میں سیف الدولہ [۱] (۳۰۰۰۰) فوج لے کر اہل شام کی مدد کو روانہ ہوا۔ شروع میں وہ ہر جگہ کامیاب رہا، اور اسے خوب مال غنیمت اور قیدی حاصل ہوئے۔ لیکن وہ اپنے عقب کو محفوظ کئے بغیر، یونانی علاقہ میں بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ خرشنہ پہنچا۔ مگر واپسی میں معلوم ہوا کہ یونانی تمام دروں پر قبضہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے آخر درب الکجل (یا درب الکجک) پر اسے روکا [۲]۔ یہاں پہنچنے سے قبل اہل طرسوس نے، جو اس کے ساتھ تھے، اسے آگے بڑھنے سے روکنا چاہا تھا، اور آئندہ خطرہ سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ مگر سیف الدولہ خود رائے شخص تھا، اور اسے یہ پسند نہ تھا کہ لوگ یہ کہیں کہ اسے دوسروں کے مشورے سے کامیابی ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درہ میں داخل ہونے کے بعد یونانی فوج نے گھیر لیا۔ اسے سخت شکست ہوئی۔ (۳۰۰۰۰) میں سے صرف (۳۰۰) آدمی زندہ رہے۔ تمام مال غنیمت اور قیدی بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ [۳] مگر اہل طرسوس نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ لوگ سلامت رہے۔ [۴] جن لوگوں کو یونانیوں نے گرفتار کیا، ان میں مشہور شاعر اور سیف الدولہ کا چچا زاد بھائی ابو فراس حارث بن سعید بھی تھا، جو بالعموم خرشنہ میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ مطر البلدی اور حلب کا قاضی ابو حصین الرقی بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ابو حصین اس جنگ میں کام آیا تھا [۵]۔ یہ واقعات رمضان سنہ ۳۴۹ (نومبر سنہ ۹۶۰) میں پیش آئے۔ سیف الدولہ نے الحوانیت (الحوانیت) میں رات بسر کی، وہاں سے مصیصہ آیا، اور مصیصہ سے حلب پہنچا۔ اب اس نے احمد بن محمد بن ماثل کو دوبارہ حلب کا قاضی مقرر کیا۔ ذہبی نے بیان کیا ہے کہ اسی سال سیف الدولہ کے غلام نجا نے نہایت کامیابی سے یونانی علاقہ پر حملہ کیا [۶]۔

---

[۱] فریٹاگ۔ ص ۱۹۶۔ ابن اثیر (ج ۸۔ ص ۲۰۰) نے تعداد نہیں لکھی۔ صرف یہ لکھا ہے کہ، غزا سیف الدولۃ بلاد الروم فی جمع کثیر۔ [۲] فریٹاگ۔ ص ۱۹۶۔ ابن اثیر نے درہ کا نام نہیں لکھا۔ [۳] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۰۔ ابن العبری۔ ص ۲۹۳۔ ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۱۸۱۔ [۴] ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۱۸۱۔ [۵] فریٹاگ ص ۱۹۷۔ [۶] ذہبی ج ۱۔ ص ۱۶۹۔ ابن تغری بردی (ج ۲۔ ص ۳۵۶) نے یہ واقعہ سنہ ۳۵۰ (سنہ ۹۶۱) کا لکھا ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ اس میں نجا کو (۱۰۰۰) قیدی، علاوہ مال غنیمت کے حاصل ہوئے تھے۔ ابن اثیر (ج ۸۔ ص ۲۰۲) لکھتا ہے کہ نجا سنہ ۳۵۸ میں میافارقین راستے سے یونانی علاقہ میں داخل ہوا تھا۔

جمال الدین ابو الحسن علی نے لکھا ہے کہ سنہ ۳۴۹ (سنہ ۹۶۰) میں نجا حلب سے فوج لے کر قلعہ ذوالقرنین پر چڑھائی کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ ذوالقرنین میں اس کا مقابلہ ہریط کے بطریق میکائیل اور ترنیق سے ہوا۔ لیکن باوجودیکہ یونانیوں کی فوج مسلمانوں کے مقابلے میں دس گنا تھی، انہوں نے شکست کھائی، ترنیق اور دوسرے سربرآوردہ لوگ گرفتار ہوئے۔ یونانی فوج کے ایک حصہ نے بلند پہاڑ پر پناہ لی؛ مگر مسلمانوں کی تلوار سے یہاں بھی نہ بچ سکے، اور قتل ہوئے۔ (۴۰۰) سپاہیوں نے امان مانگی اور گرفتار کئے گئے؛ مگر جو لوگ قلعہ میں پناہ گزین ہوئے تھے وہ قتل کر دئے گئے۔

سنہ ۳۵۰ (سنہ ۹۶۰) میں نجا ہریط کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ اس مہم میں اس نے پہلے ملطیہ میں عبداللہ پر حملہ کیا، اور اسے اور اس کے یونانی دوستوں کو شکست دی۔ اس کے بعد وہ ابن مسلمہ کے علاقہ میں داخل ہوا۔ یہاں بھی اسے کامیابی ہوئی، اور اس نے بہت سا مال غنیمت اور قیدی حاصل کئے۔ نجا کو واپسی میں معلوم ہوا کہ یونانیوں نے درہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ سن کر اس نے تمام قیدیوں کو قتل کرا دیا، اور پھر یونانیوں کو شکست دے کر، مال غنیمت اور دیگر سامان سمیت درہ سے گذر گیا۔ اب نجا نے ارمینیہ کے شہر قالیقلا پر حملہ کیا۔ یہاں اسے (۵۰۰) قیدی اور بے شمار مال غنیمت، اور اتنے مویشی اس کے ہاتھ آئے کہ ان کا ساتھ لے جانا ناممکن ہو گیا۔ اس کے بعد نجا حلب واپس آگیا [۱]۔

اسی سال طرسوس اور دوسرے سرحدی شہروں کے باشندوں نے سیف الدولہ کی اطاعت سے انحراف کیا، اور طرسوس کے حاکم ابن الزیات کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا۔ چنانچہ ان شہروں میں خلیفہ مطیع کے نام کا خطبہ مسجدوں میں پڑھا گیا [۲]۔

اب تک دمستق لیو مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ لیکن سنہ ۳۵۰ (سنہ ۹۶۱) میں اس کے بھائی نقفور نے جزیرۂ اقریطش کی فتح مکمل کر لی [۳] اور جب قیصر کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو

---

[۱] فریٹاگ۔ ص ۱۹۷۔ [۲] فریٹاگ۔ ص ۱۹۷۔ [۳] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۳۵۶۔

اس نے نقفور کو ایشیائے کوچک بھیج دیا۔ یہ شخص اپنے بھائی کے مقابلے میں زیادہ تجربہ کار اور قابل تھا، اور خیال یہ تھا کہ وہ اس جنگ کو بہت جلد ختم کر دیگا۔ نقفور نے اس مقصد کے لئے ایک زبردست فوج جمع کی جس کی تعداد (۶۰۰۰۰) بیان کی جاتی ھے [۱]۔ سیف الدولہ گذشتہ نقصانات کی تلافی بھی نہ کرنے پایا تھا کہ یونانیوں کی نئی تیاریوں کی اطلاع اسے ملی۔ وہ ابھی اس قابل نہ تھا کہ کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کرسکے۔ لہذا اس نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ مستحکم مقامات کی حتی المقدور حفاظت کی جائے، اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑکر یونانیوں کو پریشان کر دیا جائے۔ ظاھر ھے کہ اس سے یونانیوں کو کھلے میدان کے پامال کرنے، اور چھوٹے چھوٹے شہروں اور قریوں کو فتح کرنے کا موقع مل گیا۔ اس اثناء میں طرسوس کے باشندے جہاد کے لئے بے چین تھے، ابن الزیات ان کے جوش و خروش کو نہ روک سکا، اور (۴۰۰۰) فوج لے کر شہر سے نکلا، مگر نقفور کے مقابلے میں شکست کھائی، اور بھاری نقصان اٹھایا۔ مقتولین میں ابن الزیات کا بھائی بھی شامل تھا۔ اھل طرسوس کو جب اس شکست کی اطلاع ھوئی تو وہ ابن الزیات سے پھر گئے، اور خود اس کے دل پر اس واقعہ کا اتنا اثر ھوا کہ وہ اپنے محل کی کھڑکی سے دریا میں کود پڑا اور غرق ھوگیا [۲]۔

ابن الزیات کو شکست دینے کے بعد نقفور نے عین زربہ کا رخ کیا۔ یہ شہر سرحد پر مصیصہ کے نواح میں ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا، اور پہاڑ اس پر چھایا ھوا تھا۔ اسے سنہ ۱۹۰ (سنہ ۸۰۶-۸۰۵) میں ھارون الرشید کے حکم سے ایک ترک خادم ابوسلیمان نے جو اس وقت سرحد کا حاکم تھا، بسایا تھا [۳] نقفور نے شہر کا محاصرہ کیا، اور فوج پہاڑ کی چوٹی تک پھیلا دی۔ دوسری طرف یونانی فوج نے فصیل تک پہنچ کر سرنگ لگانی شروع کر دی۔ اھل شہر نے یہ دیکھ کر کہ بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رھی، امان کے وعدہ پر شہر کے دروازے کھول دئے۔ شہر میں آنے کے بعد نقفور کو معلوم ھوا کہ اس کی فوج کا وہ حصہ جو پہاڑ کی چوٹی پر مقیم تھا، وعدۂ امان سے قبل ھی شہر میں داخل ھوچکا تھا۔ اب اسے اپنے وعدہ پر افسوس ھوا، اور اس نے شام کو شہر میں اعلان کرایا کہ تمام

---

[۱] ابن تغری بردی۔ ج ۲۔ ص ۳۶۰ — [۲] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۲ —
[۳] ابن اثیر ج ۸ - ۲۰۲ - یاقوت لفظ عین زربی —

لوگ اپنے گھروں سے نکل کر جامع مسجد میں جمع ہوں، اور جو کوئی گھر میں رہ جائیگا، قتل کر دیا جائیگا۔ لوگوں نے اس اعلان پر عمل کیا۔ صبح کو یونانی سپاہی شہر میں آئے، اور انہوں نے تمام خانہ نشین لوگوں کو قتل کر دیا۔ مقتولین کی تعداد، جن میں مرد، عورت اور بچے سب ہی شامل تھے، بے انتہا تھی۔ پھر نقفور نے شہر کے تمام ہتھیار جمع کر کے ان پر قبضہ کر لیا، اور جو لوگ جامع مسجد میں جمع تھے، انہیں حکم دیا کہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اس اژدحام میں بہت سے لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ شہر سے نکل کر جدھر جسکا منہہ اٹھا، چل کھڑا ہوا، اور بہت لوگ راستہ میں مر گئے۔ شام کو جو لوگ شہر میں باقی رہ گئے تھے انہیں بھی یونانیوں نے تہ تیغ کیا، اور تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ نقفور نے فصیل شہر بھی مسمار کرادی [۱]۔ فتح عین زربہ محرم سنہ ۳۵۱ (فروری سنہ ۹۶۲) کا واقعہ ھے [۲]۔

عین زربہ سے فارغ ہو کر نقفور نے اس نواح کے (۵۴) قلعے فتح کئے۔ ان میں سے بعض کو خود باشندوں نے اس کے حوالے کر دیا، اور بعض بزورشمشیر فتح ہوئے۔ انہی قلعوں میں سے ایک قلعہ صاح کے ذریعے اس کے قبضے میں آیا تھا۔ یہاں کے باشندے جب اپنے وطن کو چھوڑ کر بے خان و مان نکلے تو ایک ارمنی سپاہی نے ایک مسلمان عورت سے تعرض کیا۔ مسلمانوں کی حمیت و غیرت جوش میں آئی، اور وہ تلوار سوت کر لڑنے مرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ نقفور نے حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ ان کی تعداد چار سو تھی، یونانیوں نے اس موقع پر بھی مرد، عورت اور بچے کی کوئی تفریق نہ کی۔ ان میں سے صرف وہی زندہ بچے جنہوں نے غلام بننا قبول کیا۔ بغراس کے باشندوں نے ایک لاکھ درھم دیکر یونانی لٹیروں سے جان بچائی۔ اس طرح خون کی پیاس

---

[۱] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۲۔ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ میں لکھا ھے کہ نقفور نے شہر کے گرد (۴۰۰۰۰) کھجور کے درخت بھی کٹوا ڈالے تھے۔ منقول از الطباخ۔ ج ۱۔ ص ۲۶۳۔ [۲] اس واقعہ کی تاریخ میں اختلاف ھے۔ فریتاگ (ص ۱۹۸) نے صرف ذوالقعدہ لکھا ھے۔ دوسرے مورخ محرم سنہ ۳۵۱ بیان کرتے ھیں۔ دیکھو Sadruddin's Saifuddaulah and his Times ص ۸۰۔ حاشیہ (۳)۔

بجھانے اور بدترین مظالم کرنے کے بعد نقفور دوزوں کا زمانہ (صوم النصارائے) گذارنے کے لئے واپس چلا گیا، اور فوج کو قیساریہ میں چھوڑ گیا [۱] ۔

یونانیوں کے عین زربہ سے چلے جانے کے بعد سیف الدولہ نے جمادی الثانی میں اس شہر کو تیس لاکھ درھم خرچ کر کے دوبارہ تعمیر کرایا [۲] ۔ پھر اس نے اپنے حاجب نجا کو ایک فوج دے کر، جس میں اھل طرسوس بھی شامل تھے، یونانی علاقہ میں بھیجا ۔ نجا کو اس مہم میں پوری کامیابی ہوئی ۔ مگر اس کے بدلے میں یونانیوں نے سیسیہ [۳] کا قلعہ فتح کر لیا ۔ نجا نے اب حصن زیادپر حملہ کر کے یونانیوں کو شکست دی، اور ان کی فوج کے (۵۰۰) آدمی اس سے آملے ۔ شوال سنہ ۳۵۱ (نومبر سنہ ۹۶۲) میں یونانیوں نے سیف الدولہ کے چچا زاد بھائی، ابوفراس حارث کو، جو منبج کا حاکم تھا، قید کر لیا [۴] ۔ اس کے علاوہ انہوں نے حصن دلوک اور گردو نواح کے تین قلعے بھی فتح کئے [۵] ۔

یونانیوں کے عین زربہ سے چلے جانے کے بعد سیف الدولہ بالکل مطمئن ہو گیا تھا ۔ مگر [۶] ذی القعدہ سنہ ۳۵۱ (اوائل دسمبر سنہ ۹۶۳) میں نقفور اور شمشقیق کا بیٹا یانس، دونوں حلب کے ارادہ سے روانہ ہوئے ۔ اس فوج کی تعداد دو لاکھ بیان کی جاتی ھے؛ جن میں سے (۳۰۰۰۰) ایسے تھے جو جوشن پہنے ہوئے تھے ۔ برفانی علاقوں میں راستہ بنانے کے لئے (۳۰۰۰۰) مزدور ساتھ تھے، (۴۰۰۰) خچروں پر آھنی گوکھرو بار تھے، تاکہ راستہ میں بکھیرتے جائیں [۷] ۔ سیف الدولہ کو اس فوج کی آمد کی خبر اس وقت ہوئی جب وہ بالکل قریب پہنچ چکی تھی ۔ اس نے جلدی جلدی ایک فوج جمع کی،

---

[۱] ابن اثیر - ج ۸ - ص ۲۰۴ ـ یاقوت لفظ عین زربی ـ [۲] ابن اثیر - ج ۸ - ص ۲۹۴ ـ یاقوت لفظ عین زربی ـ [۳] سیسیہ عوام میں سیس کہلاتا تھا ۔ ثغور شام کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا، اور انطاکیہ اور طرسوس کے درمیان، عین زربہ کے قریب واقع تھا ۔ یاقوت ـ [۴] ابن اثیر - ج ۸ - ص ۲۳۳ - ابوالفراس کے قید ہونے کا حال ہم پڑھ آئے ھیں ۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کب رہا ہوا تھا، اور کب منبج کا حاکم مقرر کیا گیا تھا ـ [۵] ابوالفداء ج ۲ ـ ص ۱۰۴ ـ [۶] فریٹاگ (ص ۱۹۹) نے یہ تاریخ ذھبی کے حوالے سے بیان کی ھے ۔ مگر ذھبی کی کتاب دول اسلام میں اس کا ذکر نہیں ھے ـ [۷] ابن اثیر ـ ج ۸ ـ ص ۲۰۳ ـ

اور اپنے حاجب نجا کی سرکردگی میں آسے یونانیوں کے خلاف روانہ کردیا، حالانکہ اس کے مشیروں نے آسے مشورہ دیا تھا کہ فوج کو خطرے میں نہ ڈالے۔ نجا فوج لے کر اثارب [۱] گیا، اور وہاں سے انطاکیہ پہنچا۔ مگر یونانیوں نے بالکل دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ پہلے دلوك آئے اور وہاں سے تل حامد [۲] ہوتے ہوئے تبل [۳] پہنچے۔ سیف الدولہ کو جب آس کی اطلاع ہوئی تو نجا فوج کے بڑے حصہ کے ساتھ کوچ کر چکا تھا، اور اب اتنی فوج آس کے پاس نہیں تھی کہ یونانیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ لہذا آس نے حلب خالی کر دیا۔ مگر جانے سے قبل لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ: «کل دشمن کی فوج یہاں پہنچ جائیگی، کیونکہ راستہ بدل جانے کی وجہ سے میری فوج آس کا مقابلا نہیں کر سکی۔ تمہارے لئے بہتر یہ ھے کہ شہر کے دروازے بند کرلو، اور جان ومال کی حفاظت کے وعدہ پر صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کرو۔ اس عرصہ میں میں اپنی فوج لے کر واپس آجاؤنگا، اور ہم مل کر یونانیوں کو آسانی سے شکست دے سکینگے»۔ لیکن اهل شہر نے اسے پسند نہ کیا اور کہا کہ: «ہمیں جہاد کی اجازت دو۔ ہم میں سے اکثر ایسے ھیں جو اب تك اس کار خیر میں حصہ نہیں لے سکے؛ مگر اب دشمن دروازے پر ھے»۔ سیف الدولہ نے اسے منظور کرلیا اور کہا کہ «میں بھی تمہارے ساتھ ہوں» اب وہ خود بانقوسا [۴] میں ٹھہرا، اور یونانی فوج الحسامہ (؟) پہنچی۔ یہاں سیف الدولہ اور اهل حلب نے اس کا مقابلہ کیا۔ بے شمار مسلمان قتل اور گرفتار ہوئے۔ مقتولین میں ابوطالب بن داؤد بن حمدان، ابو محمد فیاض (سیف الدولہ کا کاتب) اور سیف الدولہ کا غلام بشرے (بشارہ) بھی تھے۔ شہر حلب کے باب الیہود پر جو گھمسان جنگ ہوئی آس میں پھر بہت سے مسلمان قتل ہوئے۔ سیف الدولہ گھوڑے پر سوار ہو کر چند آدمیوں کے ساتھ مشرق کی طرف بھاگا، اور قنسرین پہنچا۔ یہاں کے باشندے پہلے ھی شہر خالی کر چکے تھے، اور مجبوراً سیف الدولہ کو ایک سرائے میں رات بسر کرنی پڑی۔

---

[۱] اثارب، حلب اور انطاکیہ کے درمیان، حلب سے تین فرسخ کے فاصلے پر ایك قلعہ ھے۔ یاقوت لفظ الاثارب۔ [۲] تل حامد، مصیصہ کی سرحد کا ایك قلعہ تھا۔ یاقوت تل حامد۔
[۳] عزاز کے نواح میں تبل شہر حلب کا ایك گاؤں تھا۔ یاقوت۔ [۴] حلب کے باہر، شمال کی سمت میں، بانقوسا ایك پہاڑ تھا۔ یاقوت۔

سیف الدولہ کو شکست دینے کے بعد یونانیوں نے صرف چار دن حلب کا محاصرہ کیا تھا کہ عمائد شہر نقفور کے پاس آئے ، محاصرہ اٹھا لینے کی استدعا کی ، اور حلفیہ بیان کیا کہ سیف الدولہ شہر میں موجود نہیں ۔ لیکن چونکہ نقفور کو بزور شمشیر شہر فتح کرنے کی امید تھی اس لئے اس نے ان کی باتوں کی مطلق پرواہ نہ کی ۔ ایک روایت یہ ھے کہ صرف دو دن کے محاصرہ کے بعد ۲۲ ذی القعدہ (۲۲ دسمبر) کو نقفور نے خود عمائد شہر کو بلایا تھا ۔ آخر فریقین میں یہ طے پایا کہ اھل شہر کو جان و مال کی امان دی جائے ، اور اس کے بدلے میں وہ بطور تاوان ایک مقرر رقم ادا کریں [۱] ۔ اس کے بعد نقفور شہر کے ایک دروازے سے داخل ھو ، اور نہایت تزک و احتشام سے شہر میں گشت لگا کر دوسرے دروازے سے نکل جائے ۔ یہ گفتگو جب ھو چکی تو عمائد نے ایک رات کی مہلت مانگی ، تاکہ اھل شہر سے بھی مشورہ کر لیا جائے ۔ دوسرے دن صبح کو جب وہ پھر نقفور کے پاس آئے تو اس نے یہ بہانہ کیا کہ انہوں نے راتوں رات اپنے سپاھیوں کو مسلح کر کے شہر کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ھے ، اور یونانی فوج کے داخلے کے وقت یہ سپاھی یونانیوں کا قتل عام کر دینگے ۔ اتفاقاً عمائد میں سے ایک شخص کی زبان سے نکل گیا کہ شہر میں ایک فرد بشر بھی ہتیار اٹھانے کے قابل نہیں رھا ۔ نقفور نے یہ اشارہ کافی سمجھا ، اور فوراً نقض عہد کا ارادہ کر کے کہا کہ : کل صبح پھر آو ،، ۔ ان کے جانے کے بعد نقفور نے اپنے سپاھیوں کو حکم دیا کہ رات کو شہر پر حملہ کرنے کی تیاری کریں ۔ چنانچہ یونانیوں نے باب قنسرین کے قریب ، جہاں فصیل شہر میدان کے پاس سے گزرتی تھی ، حملہ کرنے کی تیاری کی ۔ علی الصباح فوج نے شہر پر دھاوا کیا ۔ حلب کے باشندوں نے بھی جان توڑ مقابلہ کیا ، اور یونانیوں نے بہت سخت نقصان اٹھایا ۔ آخر یونانی فصیل کے ایک حصہ کو مسمار کرنے میں کامیاب ھو گئے ۔ اسی راستہ سے وہ شہر میں داخل ھوئے ، مگر پس پا کئے گئے ، اور رات

---

[۱] ابن اثیر (ج ۸ ۔ ص ۲۰۳) نے لکھا ھے کہ نقفور نے اس شرط پر محاصرہ اٹھانے کا وعدہ کیا تھا کہ مال کے علاوہ تین هزار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یونانیوں کے حوالے کی جائیں ۔ مگر عمائد نے یہ شرط منظور نہیں کی ۔

کو اھل شہر نے فصیل کی مرمت کرلی ۔ اب یونانی جبل جوشن تک پس پا ھوئے ۔ لیکن سوء اتفاق سے عوام الناس اور شرطه کے سپاھیوں میں جھگڑا ھو گیا ، اور ان سپاھیوں نے شہر کو لوٹنا شروع کر دیا ۔ اس ھنگامہ کی وجہ سے فصیل کی حفاظت کما حقہٗ نہ ھو سکی ، اور لوگ اپنے گھروں کو بچانے میں لگ گئے ۔ یونانیوں کو جب حالات معلوم ھوئے تو انہوں نے پھر حلب پر حملہ کیا ، اور ایک برج کو منہدم کر دیا ۔ اس طرح ۲۳ ذی القعدہ کو منگل کے دن وہ برج الغنم کے راستے شہر میں داخل ھوئے ۔ ایک روایت ھے کہ وہ ۳۰ تاریخ کو صبح ھونے سے قبل شہر میں داخل ھوئے تھے ۔ اب خوفناک قتل عام واقع ھوا ۔ جب تک یونانی بالکل تھک کر چور نہ ھو گئے ، انہوں نے تلوار نہ روکی ۔ قتل اور گرفتار ھونے والوں میں دس ھزار صرف لڑکے اور لڑکیاں تھیں ۔ کل مقتولین کی تعداد ایک لاکھ پچاس بیان کی گئی ھے [۱] ۔ اس کے علاوہ جو مال غنیمت انہیں حاصل ھوا آس کا نہ شمار ھے نہ اندازہ ۔ حلب کے باھر سیف الدولہ کا ایک محل تھا ، جسے دارین کہتے تھے ۔ صرف اسی میں سے نقفور کو درھموں کے تین سو تھیلے ، دو ھزار خچر ، اور لا تعداد ھتیار حاصل ھوئے ۔ قتل عام اور لوٹ کھسوٹ کے بعد مال غنیمت اتنا ملا کہ یونانی آسے لے جانے سے عاجز رھے ، چنانچہ جو کچھ نہ لے جا سکے ، آسے وھیں جلا کر خاک کر دیا ۔ مسجدوں کو انہوں نے جلا ڈالا ۔ انہیں میں حلب کی جامع مسجد تھی ، جو جامع دمشق کے نمونہ پر تیار ھوئی تھی ، اور آس کی تعمیر پر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے بے شمار دولت خرچ کی تھی [۲] ۔ مگر نقفور نے نواح حلب سے کچھ تعرض نہیں کیا ۔

---

[۱] ذھبی ۔ ج ۱ ۔ ص ۱۷۰ ۔

[۲] جمال الدین ابوالحسن علی نے سیف الدولہ کے محل سے جو مال غنیمت حاصل ھوا تھا آس کی تفصیل حسب ذیل کی ھے :— (۶۰۰۰) زرھیں ؛ سکوں کے (۳۰۰) تھیلے ، جن میں سو سونے کے تھے ، اور (۲۰۰) چاندی کے ؛ قیمتی کپڑوں کے (۳۰۰) تھان ؛ لاتعداد ریشمی کپڑے جو قدیم زمانہ سے یہاں جمع تھے ؛ سونے چاندی کے بیشمار برتن ، (۸۰۰) گھوڑے ، (۵۰۰) خچر ، ھتھیاروں ، تلواروں ، پیٹیوں اور جوشنوں کے (۱۰۰) ڈھیر ، اور (۲۰۰) اونٹ ۔ اس کے علاوہ محل کی چھت مسمار کرانے سے انہیں بہت دولت ملی ۔ فریٹاگ ص ۲۰۳ ۔ اس کے علاوہ دیکھو ابن تغری بردی ۔ ج ۲ ۔ ص ۳۶۱ ۔

فتح حلب کے بعد نقفور صرف نو دن وہاں ٹھہرا۔ جب مال غنیمت لے کر شہر سے چلنے لگا تو قیصر کے نواسے نے، جو اس کے ہمراہ تھا، اس سے کہا کہ یہ شہر اب ہمارے قبضے میں ھے، اور مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں۔ کیوں ہم اس کو اس طرح چھوڑ کر چلے جائیں۔ نقفور نے جواب دیا کہ ھمیں ایسی فتح حاصل ھوئی ھے کہ قیصر کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ ھم نے مال غنیمت خوب حاصل کرلیا ھے؛ قتل عام، تباھی اور آتش زدگی سے انتقام کی پیاس بجھائی، اور اپنے قیدی رہا کرائے ھیں۔ اب ھمیں کس بات کی ضرورت باقی رہ گئی ھے؟ دونوں میں تکرار بڑھی، آخر دمستق نے کہا کہ میں شہر کے دروازے پر ٹھہرتا ھوں، تم قلعہ کا محاصرہ کرو۔ قیصر کا نواسہ کافی فوج لے کر قلعہ کے دروازے تک بڑھا۔ مگر محصورین نے اس پر ایک پتھر پھینکا، جس سے وہ ھلاک ھوگیا۔ یونانی اس کی لاش لے کر دمستق کے پاس آئے، اور دمستق نے اس کے بدلے میں، تمام مسلمان قیدیوں کو، جن کی تعداد دو ھزار دو سو تھی، قتل کرا ڈالا۔ اس کے بعد وہ حلب سے چلا گیا، اور جاتے ھوئے اھل شہر سے کہتا گیا کہ یہ شہر اب ھمارا ھے۔ زراعت کرو، شہر کو دوبارہ تعمیر کرو۔ چند روز میں ھم پھر واپس آئینگے۔ نقفور کے واپس جاتے ھی سیف الدولہ حلب آیا، اور شہر کو از سر نو تعمیر کرانا شروع کیا [۱]۔

نقفور کے اس طرح اچانک حلب سے چلے جانے کے مختلف اسباب بیان کئے جاتے ھیں۔ ایک خیال یہ ھے کہ قیصر روما نوس کی موت کے بعد نقفور کو خود قیصر بننے کی توقع تھی۔ دوسری روایت ھے کہ نقفور نے ایشیا میں ساٹھ مستحکم مقامات فتح کر کے اپنی قابلیت کا اظہار کیا تھا، اور اس وقت اس کے قسطنطنیہ جانے کا مقصد یہ تھا کہ خود قیصر کے ھاتھ سے انعام و اکرام حاصل کرے۔ لیکن جونہی اسے روما نوس کی موت کی خبر ملی وہ فوراً ٹھہر گیا، اور اپنی فوج برخاست کردی۔ ایک تیسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ھے کہ نقفور جب حلب سے چلا ھے تو نجا سیف الدولہ کی فوج کا بڑا حصہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے روانہ ھوا تھا، اور برابر اسے نقصان پہنچا رہا تھا۔ سیف الدولہ بھی اپنے

---

[۱] فتح حلب کی تفصیل کے لئے دیکھو:— فریٹاگ۔ ص ۱۹۹ - ۲۰۳۔ ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۳۔ ابوالفداء۔ ج ۲۔ ص ۱۰۳۔ ذھبی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۰۔ ابن تغری بردی۔ ج ۲۔ ص ۳۱۱۔ ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۱۹۲ - ۱۹۴، اور حاشیہ (۱) ص ۱۹۴ –

حاجب کی مدد کر رہا تھا۔ سیف الدولہ نے اہل دمشق سے مدد مانگی ، اور انوجور ، اخشید مصر ، کا حاکم دمشق ، ظالم بن سلال ، اس کی مدد کو پہنچا ۔

اس اثناء میں رومانوس مرچکا تھا ۔ اس نے دو کم عمر بیٹے ، بازیل اور قسطنطین چھوڑ ے تھے ۔ نقفور نے اب قسطنطنیہ جانے کا ارادہ کیا ۔ مگر وہاں اس کے بہت سے دشمن موجود تھے ۔ بہر حال نقفور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ، اور دوبارہ ایشیا کا دمستق مقرر کر دیا گیا ۔ قسطنطنیہ کے یہ سیاسی انقلابات مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوئے ۔ کیونکہ نئی جنگ کی تیاری میں اب بہت دیر تھی ، اور اس عرصے میں شام اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو ، جو یونانی علاقے کی سرحد پر واقع تھے ، دوبارہ طاقت حاصل کرنے اور جنگ کی تیاری کرنے کا موقع مل گیا ۔

سنہ ۳۵۲ (سنہ ۹۶۳ - ۹۶۴) میں سیف الدولہ یونانیوں کے خلاف روانہ ہوا ۔ وہ بذات خود درہائے کوہ کے پاس ٹھہر گیا ، اور نجا فوج لے کر ملطیہ کے علاقے میں داخل ہوا ۔ وہ اٹھارہ دن تک یہاں رہا ، اور تمام سر زمین کو خوب پامال کر کے سالم و غانم واپس آیا ۔ اب مسلمانوں پر ایک نئی مصیبت پڑی ۔ اس وقت تمام مسلمان حکمرانوں میں صرف سیف الدولہ ہی تھا جو برسوں سے اسلامی سرحد کی حفاظت کر رہا تھا ۔ لیکن سنہ ۳۵۲ کے شروع (اواخر جنوری سنہ ۹۶۳) میں اس پر فالج کا اتنا سخت دورہ ہوا کہ بدن بالکل سن ہو گیا اور زیست کی کوئی امید باقی نہ رہی ۔ باوجود اس دورے کے وہ اس مہم میں نجا کے ساتھ تھا ۔ واپسی میں اس پر ایسی غشی طاری ہوئی کہ لوگوں کو اس کی موت کا یقین ہو گیا ۔ اس وقت اس کا بھتیجا ، ھبتہ اللہ بن ناصر الدولہ ، جو اس کی طرف سے حران کا حاکم تھا ، اس کے ہمراہ تھا ۔ اس نے موقع کو غنیمت سمجھا ، اور سیف الدولہ کے ایک غلام کو ، خانگی جھگڑے کی بناپر قتل کر ڈالا ۔ سیف الدولہ کو جب افاقہ ہوا تو ھبتہ اللہ سزا سے بچنے کے لئے حران بھاگا ۔ یہاں آکر اس نے لوگوں کو اپنے چچا کی موت کا یقین دلایا ، اور ان سے اپنے آپ کو مستقل حکمران تسلیم کرا لیا ۔ سیف الدولہ نے نجا کو اس کے تعقب میں روانہ کیا ۔ جب نجا قریب پہنچا تو ھبتہ اللہ حران سے اپنے باپ کے پاس موصل چلا گیا ۔ نجا ۲۷ ۔ شوال کو حران پہنچا ۔ وہاں کے عمائد کو گرفتار کر کے ان پر بھاری جرمانہ کیا ، اور سخت ترین سزائیں دے کر پانچ دن کے اندر یہ رقم وصول کر لی ۔ یہ رقم اتنی تھی کہ اسے ادا کرنے کے لئے اہل حران نے اپنے

گھر کا سامان تک بیچ ڈالا۔ اس طرح بے انتہا مال و دولت لے کر نجا نے حران کو اس کے حال پر چھوڑا، اور حلب کو واپس ہوا۔ حران میں اب چونکہ والی نہ رہا تھا، اس لئے اہل شہر کی جان و مال دونوں غیر محفوظ ہو گئے، اور شہر مفسدوں کا ملجا و ماوا بن گیا [۱] ۔

نجا کو جب اتنی دولت میسر آئی، تو بجائے اس کے کہ اس کا حساب دیتا، اور اپنے ولی نعمت کا شکر گذار ہوتا، اس نے بغاوت پر کمر باندھی۔ سنہ ۳۵۳ (سنہ ۹۶۴) میں وہ میافارقین کے قصد سے روانہ ہوا، اور وہاں سے بلاد ارمینیہ کا رخ کیا۔ اس علاقہ پر ایک عرب ابوالورد قابض تھا۔ نجا نے اسے شکست دی، اور اسے قتل کر کے، اس کے علاقے پر جس میں خلاط، ملازکرد، اور موش وغیرہ کے شہر شامل تھے قبضہ کر لیا۔ یہاں بھی بیشمار دولت اس کے ہاتھ لگی۔ اب اس نے سلطان معزالدولہ بویہ سے حمدانیوں کے خلاف خط و کتابت شروع کی۔ سیف الدولہ نے نجا کا پیچھا کیا، اور جب وہ میافارقین پہنچا تو نجا وہاں سے بھاگ گیا۔ سیف الدولہ نے ان تمام علاقوں کو جن پر نجا قابض ہو گیا تھا، دوبارہ فتح کر لیا۔ نجا کی فوج منتشر ہو گئی، اور خود اس کا بھائی سیف الدولہ کے پاس آ گیا۔ اس شخص نے آخر نجا کو ترغیب دے کر اسے سیف الدولہ کے دربار میں بلا لیا۔ سیف الدولہ نے بھی اس کے تمام قصور معاف کر دئے، اور پھر پرانے عہدہ پر بحال کر دیا۔ لیکن ماہ ربیع الاول سنہ ۳۵۴ (مارچ سنہ ۹۶۵) میں سیف الدولہ کے چند غلاموں نے اسے قتل کر ڈالا [۲] ۔

---

[۱] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۵ — [۲] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۶۔ ابن مسکویہ (ج ۲۔ ص ۲۰۱) کا بیان ذرا مختلف ہے۔ فریٹاگ (ص ۲۰۹) کا بیان بھی ابن اثیر سے مختلف ہے۔ وہ وہ لکھتا ہے کہ سنہ ۳۵۵ (۹۶۵) میں جب یونانیوں اور مسلمانوں میں قیدیوں کا تبادلہ ہوا ہے، تو نجا زندہ اور میافارقین پر قابض تھا۔ چنانچہ تبادلہ سے قبل سیف الدولہ کو اس کی طرف توجہ کرنے پڑی تھی۔ اس نے میافارقین کا محاصرہ کیا، اور محصورین سے کہا کہ نجا کو اس کے سامنے کرو۔ جب اس نے نجا کو برج پر دیکھا تو نام لے کر اسے آواز دی نجا نے فوراً جواب دیا "لبیک یا مولانا"، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ اسی دن وہ سیف الدولہ کے دربار میں (باقی نوٹ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷ پر)

۶ جمادی الثانی سنہ ۳۵۳ (سنہ ۹۶۴) کو سیف الدولہ کی بہن خولہ کا انتقال ہوا۔ یہ حادثہ سیف الدولہ کے لئے بہت سخت تھا۔ کیونکہ خولہ ہمیشہ اُس کی ھمدرد اور مددگار رھی تھی۔ چنانچہ جب یونانیوں نے حلب فتح کیا ھے تو اُس نے (۱۰۰۰۰۰) درہم سے سیف الدولہ کی مدد کی تھی۔ متنبی نے اُس کا ایک مرثیہ لکھا، جس کا مطلع ھے۔

یا اخت خیر اخ — یا بنت خیر اب [۱]

(۷)

اس اثناء میں قسطنطنیہ پھر ایک سیاسی انقلاب کا اکھاڑا بن چکا تھا۔ ھم لکھہ آئے ھیں کہ اس سے قبل نقفور قسطنطنیہ گیا تھا، اور باوجود مخالفت کے دوبارہ ایشیاء کا دمستق مقرر ھوا تھا۔ دارالسلطنت میں بدستور سازشیں جاری رھیں، جن کا نتیجہ آخر یہ ھوا کہ ایشیا کی فوج نے قیصریہ میں نقفور کے قیصر ھونے کا اعلان کر دیا۔ اب وہ یانس بن شمشقیق کو دمستق مقرر کر کے، فوج کے بڑے حصے کے ساتھ قسطنطنیہ چلا گیا۔ یہاں اُس کی زیادہ مخالفت نہیں ھوئی بلکہ اھل شہر نے بھی اُسے قیصر تسلیم کرلیا۔ اس دوران میں لازمی طور پر دمستق کو جنگ سے ھاتھ اُٹھانا پڑا، اور مسلمانوں کو مزید تیاری کا موقع مل گیا۔

آخر سنہ ۳۵۳ (۹۶۴) میں دمستق نے مصیصہ کا محاصرہ کیا۔ باوجودیکہ یونانیوں نے فصیل کے ایک حصہ کو منہدم کر دیا، مگر مسلمانوں نے ان کا ایسا سخت مقابلہ کیا کہ وہ شہر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶) حاضر ھوا، اور دوبارہ اپنے پرانے فرائض انجام دینے لگا۔ جب سیف لدولہ کو ھر طرح اطمینان ھوگیا تو اس نے اسے خلعت عطا کی، اور قدیم عنایات مرعی رکھیں۔ لیکن اس کے بعد نجا زیادہ دن زندہ نہ رھا۔ ایک مرتبہ شراب نوشی کے جلسہ میں نجا نے کسی امیر کو بداخلاقی سے مخاطب کیا، اور ایک دوسرے امیر کبجک نے اسے وھیں جلسہ میں قتل کردیا۔ سیف الدولہ اس وقت بیمار تھا، اور جلسہ میں موجود نہ تھا۔ اس لئے اس قتل کا الزام اس پر نہیں ھے۔ مزید برآں جب سیف الدولہ کو اس واقعہ کی اطلاع ھوئی، تو اس نے ان تمام لوگوں کو جو اس قتل میں شریک تھے موت کی سزا دی۔ مگر ابن مسکویہ (ج ۲ - ص ۲۰۹) نے بھی نجا کا قتل سنہ ۳۵۴ ھی کا واقعہ بتایا ھے۔ [۱] فریثاگ۔ ص ۲۰۵ ۔

پر قابض نہ ہو سکے۔ یونانیوں نے اس ناکامی کا بدلہ اس طرح لیا۔ کہ مصیصہ کے مضافات کو جلا ڈالا۔ یہی حال اذنہ اور طرسوس کے مضافات کا ہوا، کیونکہ ان شہروں کے باشندوں نے اہل مصیصہ کی مدد کی تھی۔ ان لڑائیوں میں (۱۵۰۰۰) مسلمان یونانیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ وہ صرف پندرہ روز اسلامی علاقے میں ٹھہرے، مگر ان کی کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ اس کے بعد قحط کی وجہ سے یونانی واپس چلے گئے؛ مگر جانے سے قبل دمستق اہل مصیصہ، اذنہ اور طرسوس سے کہہ گیا کہ وہ شکست کھا کر نہیں جا رہا، بلکہ قحط کے سبب سے مجبور ہو گیا ہے؛ اور بہت جلد وہاں واپس آئیگا۔ اس عرصہ میں جو لوگ شہر خالی کر دینگے وہ بچ جائینگے، ورنہ اس کی واپسی کے وقت جو شہر میں ہونگے قتل کر دئے جائینگے۔ اس دوران میں ایک خراسانی کے ماتحت (۵۰۰۰) نفوس جہاد کی غرض سے ارمینیہ اور میافارقین ہوتے ہوئے ماہ صفر میں سیف الدولہ کے پاس پہنچے۔ سیف الدولہ انہیں لے کر یونانی علاقہ کی طرف روانہ ہوا۔ مگر اس عرصہ میں یونانی واپس جا چکے تھے۔ قحط کی وجہ سے خراسانیوں کا وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا، اور یہ لوگ براہ بغداد اپنے اپنے وطنوں کو واپس چلے گئے [۱]۔

ذھبی نے بیان کیا ھے کہ اسی سال سیف الدولہ نے یونانی علاقہ پر حملہ کر کے (۲۰۰۰) قیدی اور (۱۰۰۰۰۰) مویشی حاصل کئے، اور پھر حران اور ملطیہ ہوتا ہوا وہ آمد آ گیا [۲]۔

ابن تغری بردی نے لکھا ھے کہ یونانیوں نے حلب کے نواح میں ایک قلعہ پر حملہ کیا، اور اس پر ان کا قبضہ ہونے ہی والا تھا کہ سیف الدولہ کی فوج مقابلے کے لئے پہنچ گئی۔ اس جنگ میں (۵۰۰) یونانی کام آئے، اور باقی گرفتار کر لئے گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ یونانی دوبارہ مصیصہ پر حملہ آور ہوئے ہیں، اور گرد و نواح کے علاقے کو تاخت و تاراج کر رہے ہیں۔ لیکن پہلے کی طرح اس دفعہ بھی قحط کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ اہل مصیصہ اور طرسوس نے ان کا تعقب کیا، بہت سے یونانی قتل ہوئے، اور بے شمار قید کئے گئے۔ یونانی فوج کی تعداد اور (۳۰۰۰۰۰) بیان کی جاتی ھے [۳]۔

---

[۱] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۰۷۔ ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۳۶۷۔ فریٹاگ ص ۲۰۵۔ ابن مسکویہ ج ۲۔ ص ۲۰۲ [۲] فریٹاگ۔ ص ۲۰۶۔ [۳] ابن تغری بردی۔ ج ۲۔ ص ۳۶۷۔

سنه ۳۵۲ (سنه ۹٦۳) میں هی قیصر نقفور کی ایک سفارت سیف الدوله کی خدمت میں اس مقصد کے لئے حاضر هوئی که قیدیوں کا تبادله کر لیا جائے۔ اس سفارت کا استقبال نہایت تزک و احتشام سے کیا گیا۔ سیف الدوله نے دربار منعقد کیا، جس کے لئے ایک خیمه خاص طور پر بنوایا گیا تھا، جس کی بلندی (۵۰) ذرع تھی [۱]۔ اسی سال قرامطه نے سیف الدوله سے استدعا کی که کچھ لوھا انہیں دے دیا جائے، چنانچه اس نے بہت سا لوھا ان کے پاس بھیجا، جو براہ دریائے فرات پہلے هیت لایا گیا، اور پھر خشکی کے راسته سے هجر پہنچا دیا گیا [۲]۔

سنه ۳۵۴ (سنه ۹٦۵) قیصر نقفور نے ایک نیا شہر قیصریه (قیساریه [۳]؟) کے نام سے آباد کیا، تاکه اسے مرکز قرار دےکر هر وقت اور هر موسم میں اسلامی سرحد پر حمله کیا جاسکے۔ وه خود قیصریه میں رهنے لگا، اور اپنے باپ کو بطور نائب قسطنطنیه میں مقرر کیا [۴]۔ اهل مصیصه اور طرسوس نے، یونانیوں کے اس قدر قریب هونے سے خوف زده هوکر، نقفور سے خط وکتابت کرکے اس کی اطاعت قبول کرلی، اور استدعا کی که ان پر کسی کو حاکم مقرر کردیا جائے۔ نقفور نے یه درخواست منظور کرلی۔ مگر پھر اسے معلوم هوا که اهل طرسوس ایسے سخت قحط کی مصیبت میں مبتلا هیں که هر روز تین سو آدمی بھوکوں مر رهے هیں [۵]۔ اس لئے وه وعدے سے پھر گیا، مسلمانوں کے ایلچی کے سر پر وه خط جلادیا جو وه لیکر آیا تھا، جس سے اس کی داڑھی جل گئی۔ اور کہا که،، تمہاری حالت وهی هے جو موسم سرما میں سانپ کی هوتی هے۔ جب اسے سردی لگتی هے تو ضعیف هوجاتا هے، اور دیکھنے والا سمجھنے لگتا هے که مرگیا هے؛ لیکن جب اس کے پاس جاکر اس پر احسان کرنے

---

[۱] فریٹاگ۔ ص ۲۰٦۔ ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۳٦٦۔ [۲] ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۲٦٦۔ ابن مسکویه ج ۲۔ ص ۲۰۳۔ [۳] ابن تغری بردی۔ ج ۲۔ ص ۳٦۹۔ ابن مسکویه۔ ج ۲۔ ص ۲۱۰۔ [۴] ذهبی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۲۔ [۵] فریٹاگ (ص ۲۰۷) لکھتا هے که نقفور کو ان مقامات کی بدحالی کی کیفیت اس طرح معلوم هوئی تھی که اس سے وعده کیا گیا تھا که اگر وه اهل طرسوس اور مصیصه کی درخواست قبول کرلیگا تو یونانی قیدی رها کردئے جائنگے۔ چنانچه مسلمانوں نے اپنا وعده پورا کیا۔ ان یونانیوں نے نقفور کو اهل ملک کے مصائب سے مطلع کیا۔ اسی بنا پر اس نے نقض عهد کیا۔ اور جنگ کی تیاری شروع کردی۔ ذهبی ج ۱۔ ص ۱۷۲۔

ایکھتا ہے وہ فوراً ڈس لیتا ہے۔ اسی طرح تم بھی ضعف کی حالت میں خوشامدین کرتے ہو اور اگر تمہیں چھوڑ دوں تو مضبوط ہو کر مجھی کو تکلیف پہنچاؤ گے [۱]۔

اس کے بعد ہی سنہ ۳۵۴ (سنہ ۹٦۵) میں نقفور نے مصیصہ پر حملہ کیا۔ یہ شہر دریائے جیحان (Pyramus) کے کنارے، انطاکیہ اور یونانی علاقہ کے درمیان، شام کی سرحد پر، طرسوس کے قریب واقع تھا، اور مدتوں سے اس سرحد پر مسلمانوں کا زبردست فوجی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ نہایت معمور اور بارونق شہر تھا، اس کی آبادی دو لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ اس کے گرد بکثرت باغ تھے، جنہیں دریائے جیحان سیراب کرتا تھا [۲]۔ نقفور نے شہر کا محاصرہ کیا، اور آخر (۴۰۰۰) آدمی کھو کر اسے فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ اہل مصیصہ نے بھاگ کر قریہ میں پناہ لی، مگر جب یہ مقام بھی یونانیوں نے فتح کر لیا تو اہل مصیصہ کا قتل عام کیا گیا، اور جو باقی رہے انہیں قسطنطنیہ منتقل کر دیا گیا [۳]۔

مصیصہ کو فتح اور تباہ کر کے نقفور طرسوس کی طرف متوجہ ہوا۔ روایت ہے کہ اسے ہارون الرشید کے عہد میں تعمیر، یا کم از کم دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا، اور خلیفہ نے اسی شہر کو اپنے نئے سرحدی صوبے العوصم کا صدر مقام بنایا تھا۔ یہ شہر شام کی سرحد پر، انطاکیہ، حلب اور یونانی علاقہ کے درمیان واقع تھا۔ اس کے گرد دوہری فصیل اور وسیع خندق تھی۔ شہر میں داخل ہونے کے چھ دروازے تھے، اور دریائے بردان شہر کے بیچ میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ سرحد پر سب سے زیادہ مستحکم اور اہم مقام ہونے کی وجہ سے اسلامی دنیا کے ہر حصے کے مجاہدین یہاں جمع تھے، جو امن کے زمانے میں اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے اور جنگ کے وقت ہتیار اٹھا لیتے۔ ان کے گذارے کے لئے بڑے بڑے اوقاف تھے۔ یہ حالت سنہ ۳۵۴ تک جاری رہی، مگر اس سال کے قحط کی وجہ سے یہاں کے حالات بے حد زبون ہو گئے تھے، اور باشندوں میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہی تھی۔

---

[۱] ذهبی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۲۔ ابن مسکویہ ج ۲۔ ص ۲۱۰۔ [۲] یاقوت۔ لفظ مصیصہ۔ ابوالفداء ج ۲۔ ص ۱۰۴۔ لی اسٹرینج: ص ۵۰۵، ۵۰٦۔ [۳] ابوالفداء ج ۲۔ ص ۱۰۴، ۱۰۵۔ فریٹاگ ص ۲۰۷۔ ابن مسکویہ ج ۲۔ ص ۲۱۱، ۲۱۲۔ حاشیہ (۱)۔

ور کے حملے کے وقت رشیق النسیمی سیف الدولہ کی طرف سے یہاں کا حاکم تھا۔ اس نے اس ط پر شہر یونانیوں کے حوالے کر دیا کہ مسلمانوں کو وہاں سے چلے جانے، اور جس قدر ، وہ اٹھا سکیں لے جانے کی اجازت دی جائے۔ مگر شہر میں داخل ہونے کے بعد یونانی فوج ، ہر سپاھی نے ایک ایک مسلمان کے گھر پر قبضہ کر کے اسے نکال دیا، اور اس کے مال و اسباب متصرف ہو گیا۔ یہاں تک ہوا کہ باپ اپنی اولاد سے بچھڑ گئے، بیویوں نے اپنے شوہروں کا تھ دینے سے انکار کر دیا، اور لوگ نہایت بے سرو سامانی کی حالت میں اپنے وطن سے چل ے ہوئے۔ شہر یوں برباد ہوا اور اھل شہر تباہ و بدحال انطاکیہ چلے گئے جو طرسوس رھے وہ یاتو قتل ہوئے اور یا عیسائی ہو گئے۔ یاقوت لکھتا ھے کہ طرسوس پر یہ گزر رھی تھی، سیف الدلہ میافارقین میں عیش کر رھا تھا۔ دوسرے حکمرانوں کو آپس کے جھگڑوں سے فرصت نہ تھی کہ مسلمانوں کی حفاظت اور جہاد کا فرض ادا کریں [۱]

ابن اثیر نے بیان کیا ھے کہ نقفور نے طرسوس کی جامع مسجد کو اصطبل بنا لیا تھا، اور کا منبر جلا ڈالا تھا۔ مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد اس نے شہر دوبارہ آباد کیا، اور بے انتہا سامان راك وهاں بھیجا۔ یہاں تک کہ اھل شہر پھر خوش حال ہو گئے، اور بہت سے پرانے باشندے اپنے ن واپس آ گئے۔ مگر ان میں سے بعض نے عیسائی مذھب قبول کر لیا۔ نقفور یہ چاھتا تھا کہ طرسوس مسلمانوں کے ملك پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنا صدر مقام بنائے۔ تمام انتظام کر کے وہ قسطنطنیہ ں چلا گیا۔ دمستق، یعنی یانس بن شمشقیق، میافارقین پر حملہ کرنا چاھتا تھا، مگر نقفور نے اسے حکم کہ اس کے ساتھ قسطنطنیہ چلے [۲]۔

اپنے غیاب کے زمانہ میں سیف الدولہ نے اپنے ایك خادم قرعویہ کو حلب کا حاکم ر کیا تھا، اور انطاکیہ پر ایك اور امیر تاج الیکی (یا الثملی) کو نائب بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن اھل انطاکیہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا؛ اور رشیق النسیمی کو، جو طرسوس سے وھاں آ گیا تھا، اپنا ئم بنا لیا۔ رشیق نے تمام کام ابن الاھوزی نام ایك شخص کے سپرد کر دیا، اور قیصر کو (۶۰۰۰۰۰)

---

[۱] یاقوت۔ لفظ طوسوس۔ ابوالفداء ج ۲۔ ص ۱۰۵ [۲] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۱۰۔ اس کے علاوہ دیکھو ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۲۱۱، ۲۱۲۔ حاشیہ (۱)۔

درہم دینے کا وعدہ کیا۔ لوگوں کے تالیف قلوب کے لئے رشیق نے ایک جعلی خط خلیفہ کی طرف سے بنایا، جس میں اسے سیف الدولہ کی جگہ انطاکیہ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ یہ خط مسجدوں میں پڑھا گیا۔ رقم مہیا کرنے کی غرض سے پہلے تو ابن الاہوازی نے خزانہ پر قبضہ کیا، اور پھر ترضے کے نام سے لوگوں سے خوب مال حاصل کیا۔ اس دولت کی مدد سے ان دونوں نے (۵۰۰۰) فوج تیار کی اس وقت صرف بطریق کرسٹوفورس سیف الدولہ کا وفادار رہا، اور ابن الاہوازی اور رشیق کے وعدہ وعید کے باوجود دیر سمعان میں سیف الدولہ کا منتظر رہا۔ اس اثنا میں ابن الاہوازی نے رشیق کو حلب فتح کرنے پر راضی کر لیا۔ اتفاق سے اسی عرصے میں دزبر نامی ایک دیلمی اپنے بہت سے هم وطنوں کے ساتھ انطاکیہ پہنچا۔ اسے ساتھ لے کر حلب پر فوج کشی کی گئی۔ قرعویہ کو حلب کے قلعہ میں محصور ہو جانا پڑا۔ اتنے میں سیف الدولہ نے اپنے غلام بشرے کی سرکردگی میں ایک فوج قرعویہ کی مدد کے لئے بھیجی۔ لڑائی کے دوران میں رشیق گھوڑے سے گر پڑا، اور ایک عرب نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اب ابن الاہوازی نے دزبر کو انطاکیہ کا حاکم بنا دیا۔ حلب پر ان باغیوں کا قبضہ ہو گیا، اور دزبر نے رقم جمع کرنے میں وہاں سخت مظالم کئے۔ قرعویہ باغیوں سے لڑنے کے لئے انطاکیہ روانہ ہوا، مگر ابن الاہوازی اور دزبر کے مقابلے میں شکست کھائی۔ معتدبہ رقم جمع کرنے کے بعد دونوں باغی حلب سے واپس جا چکے تھے۔ سیف الدولہ اب حلب آیا، اور صرف ایک رات قیام کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ حلب کے قریب ہی اس کا مقابلہ ابن الاہوازی اور دزبر سے ہوا۔ باغیوں نے شکست کھائی، اور دونوں گرفتار ہوئے۔ دزبر اسی وقت قتل کر دیا گیا۔ ابن الاہوازی چند روز قید رکھا گیا، اور پھر وہ بھی قتل کر دیا گیا [۱]۔

فریٹاگ نے جمال الدین ابو الحسن علی کے حوالہ سے بیان کیا ہے [۲] کہ سنہ ۳۵۴ میں سیف الدولہ نے اپنے بھائی ناصرالدولہ کے ساتھ تعلقات کو مستحکم کرنے کی غرض سے اپنی بیٹی ست الناس کی شادی ناصرالدولہ کے بیٹے ابو تغلب سے کی۔ اس کی یادگار میں سونے کے نئے سکے مسکوک کرائے گئے، جن کی قیمت ۳۰، ۲۰ اور ۱۰ دینار تھی۔ ان سکوں کے ایک طرف یہ عبارت تھی :—

---

[۱] ابوالفداء ج ۲ - ص ۱۰۵ - ابن اثیر ج ۸ - ص ۲۱۰، ۲۱۲ - فریٹاگ نے یہ واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دیکھو۔ ص۔ ۲۱۰ - ۲۱۲ -

[۲] فریٹاگ۔ ص ۲۰۸ -

محمد رسول اللہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب فاطمۃ الزہراء الحسن و الحسین جبرئیل
اور دوسری طرف تھا :—

امیرالمومنین المطیع للہ الامیران الفاضلان ناصرالدولہ و سیف الدولہ الامیران ابو تغلب و ابوالمکارم

اس موقع پر سیف الدولہ نے (۱۰۰۰۰) دینار خیرات کئے۔ مگر اسی سال ماہ ربیع الثانی کے وسط میں ابوالمکارم کا انتقال ہوگیا۔ بعض مورخوں نے سکوں کی ان عبارتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سیف الدولہ عقائد کے لحاظ سے یا تو شیعہ تھا یا کم از کم شیعیت کی طرف مائل تھا۔

سنہ ۳۵۵ھ (سنہ ۹۶۶) میں خراسانیوں کی ایک جماعت جہاد کی غرض سے محمد بن عیسٰے کی سرکردگی میں میافارقین پہنچی۔ سیف الدولہ کے بیٹے، ابوالمعالی نے ان کا استقبال کیا [۱]۔ اس سال یونانیوں نے آمد کا محاصرہ کیا۔ انہوں نے تین سو اہل شہر کو قتل اور چار سو کو گرفتار کیا، مگر وہ شہر فتح نہ کر سکے۔ یہاں سے ہٹ کر وہ دارا کی طرف چلے۔ نصیبین کے قریب پہنچے تو ایک قافلہ ملا جو میافارقین سے آ رہا تھا۔ اسے انہوں نے لوٹ لیا۔ اہل نصیبین ان کی آمد کی خبر سن کر اتنا گھبرائے کہ شہر خالی کر دیا۔ سیف الدولہ بھی یہاں موجود تھا۔ وہ ابھی جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ یونانیوں نے اپنا راستہ بدل دیا، اور انطاکیہ کی طرف چلے۔ انہوں نے کچھ مدت اس کا محاصرہ کیا۔ جب اسے فتح نہ کر سکے، تو مضافات شہر کو لوٹ کر جلا دیا، اور طرسوس چلے گئے [۲]۔ ایک روایت [۳] یہ ہے کہ جب یونانیوں نے انطاکیہ کا محاصرہ کرنے کا ارادہ کیا ہے تو سیف الدولہ نے اپنے بھائی ناصرالدولہ سے مدد مانگی، مگر اس نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف اہل انطاکیہ اس قدر گھبرائے کہ انہوں نے نقفور کی اطاعت کرنے اور بہت بڑی رقم ادا کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر نقفور نے ایسی شرائط پیش کیں، جنہیں منظور نہ کیا جا سکا۔ اس لئے نقفور نے نصیبین سے ہٹنے کے بعد منبج کا محاصرہ کیا، اور مضافات شہر جلا ڈالے۔ لیکن جب لوگوں نے اطاعت قبول کر لی تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ یہاں سے نقفور وادی بطنان کی طرف روانہ ہوا، اور

---

[۱] ابن تغری بردی ج ۲۔ ۳۸۴ — [۲] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۱۴ — [۳] ابن مسکویہ۔ ج ۲۔ ص ۲۲۰۔ حاشیہ (۱)۔

سیف الدولہ قنسرین گیا۔ مگر سیف الدولہ کی فوج ، اور خانہ بدوش عربوں نے یونانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس علاقہ کو انہوں نے اتنا لوٹا کہ رسد بہم پہنچانا ممکن ہو گیا۔ باوجود اس کے سیف الدولہ نے نقفور سے خط و کتابت کی ، اور صلح کرنے کی غرض سے ایک بہت بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا۔ مگر نقفور نے منظور نہ کیا اور کہا کہ نصف شام میرے حوالے کر دو۔ بہر حال بد حال ہونے کے باوجود نقفور نے آٹھ دن تک انطاکیہ کا محاصرہ کیا ، اور آخر تنگ آ کر وہاں سے ہٹ گیا [۱]۔

گو نقفور صلح کرنے سے انکار کر چکا تھا ، لیکن یونانی گزشتہ ناکامیوں سے بد دل ہو رہے تھے ، اور ان کی فوج سنہ ۳۵۵ (سنہ ٩٦٦) کی مہموں میں تقریباً تباہ ہو چکی تھی۔ دوسری طرف سیف الدولہ بھی بیمار تھا ، اور کسی بڑی مہم کی نگرانی بذات خود نہ کر سکتا تھا۔ لهذا اب فریقین میں صلح ہوئی ، اور فیصلہ ہوا کہ قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ اس غرض سے سیف الدولہ پہلے میافارقین آیا۔ نجا کی بغاوت کی وجہ سے جو شورش اور بدامنی پیدا ہو گئی تھی اسے فرو کرنے کے بعد وہ سمیساط چلا گیا۔ یہیں پر غرہ رجب سنہ ۳۵۵ (۲۳ جون سنہ ٩٦٦) کو دریائے فرات کے کنارے قیدیوں کا تبادلہ ہوا ، اور زر فدیہ ادا کیا گیا۔ قید سے رہا ہونے والوں میں سیف الدولہ کا بھتیجا ابوالفوارس محمد بن ناصرالدولہ ، اس کا چچا زاد بھائی ابو فراس ، اور ابوالهیثم بن قاضی ابوحصین بھی شامل تھے۔ ابوفراس منبج کا حاکم تھا ، اور جب سنہ ۳۵۱ میں یونانیوں نے اس علاقہ پر حملہ کیا ھے تو گرفتار ہوا تھا ، اور اب اسے قید سے رہائی ملی تھی [۲]۔ ابوالفوارس کے متعلق ابن تغری بردی نے

---

[۱] ابن تغری بردی (ج ۲ - ص ۳۷۴) نے لکھا ھے کہ انطاکیہ کا حاکم محمد بن موسے الصلاحی خزانۂ عامرہ کی پوری رقم لے کر بظاہر سیف الدولہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوا تھا ، لیکن راستہ میں مرتد ہو کر یونانی علاقہ میں چلا گیا۔ ایک روایت ھے کہ اس نے شہر کو یونانیوں کے حوالے کر دینے کا ارادہ کیا تھا ، مگر لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا ، اور اس خوف سے کہ اس کی غداری کی خبر سیف الدولہ کو نہ پہنچ جائے ، خزانے کی رقم لے کر شہر سے نکل گیا۔ [۲] فریتاگ نے زبدۃ الحلب میں ابوفراس کا ایک قصیدہ نقل کیا ھے جس میں اس نے اپنی قید اور فدیہ کا ذکر کیا ھے۔ دیکھو زبدۃ الحلب ص 135 -

لکھا ھے که قیصر کی بہن نے اپنے بھائی سے یه وعدہ لیا تھا که ابوالفوارس کے بدلے میں خود اس کا بھائی چھڑا لیا جائیگا۔ چنانچہ سیف الدوله نے اس یونانی امیر کو تین سو آدمیوں کے ساتھ قلعه ھیاج بھیجا۔ دوسری طرف سے تین سو یونانی ابوالفوارس کو لیکر وھاں پہنچے۔ قلعه کے قریب پہنچ کر فریقین کے پانچ پانچ آدمی اپنے قیدی کو لیکر آئے، اور ھر دو قیدی رھا کر دئے گئے [۱]۔ سیف الدوله نے (۳۰۰۰) مسلمان قیدیوں کے بدلے میں (۲۰۰۰۰۰) یونانی دینار بطور زر فدیه ادا کئے۔ تبادله کا فیصله ھو جانے کے بعد سیف الدوله نے دوسرے دن ان آزاد شدہ قیدیوں کو ایک فوج کی حفاظت میں حلب کی طرف روانه کر دیا۔

صلح ھونے کے بعد سیف الدوله بہت دن تک زندہ نہیں رھا۔ وہ تین برس سے برابر بیمار چلا آ رھا تھا۔ شیزر میں تھا که اس کی بیماری میں اضافه ھوا۔ جب زیست کی کوئی امید نه رھی تو اسے حلب لے آئے۔ یہاں پہنچنے سے دو تین دن بعد ۲۵ صفر سنه ۳۵٦ [۲] (۹ فروری سنه ۹٦۷) کو اس عظیم الشان شخص کا، جس نے تیئس برس تک اسلامی سرحد کی حفاظت کی تھی، انتقال ھو گیا۔

خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را

روایت ھے که فوجی مہموں کے دوران میں جو گرد اس کے کپڑوں پر جم جاتی تھی اسے باحتیاط جمع کر کے سیف الدوله نے ھتیھلی کے برابر ایک اینٹ بنوائی تھی، اور وصیت کی تھی که قبر میں یه اینٹ اس کے رخسار کے نیچے رکھ دی جائے۔ اس پر عمل کیا گیا [۳]۔ اس نے (۵۲) برس (۲) مہینے اور (۸) دن کی عمر پائی۔ مرض الموت کے متعلق دو روائتیں ھیں۔ بعض کا قول ھے که اسے حبس البول کا عارضه تھا [۴]، اور بعض کہتے ھیں که اس نے فالج سے انتقال کیا [۵]۔ اس کا جنازہ تقی الدین کی حفاظت میں، جو انطاکیه سے اسی غرض سے حلب آیا تھا، میافارقین لایا گیا، اور یہاں اس کی والدہ کے پہلو میں اسے دفن کیا گیا [٦]۔

---

[۱] ابن تغری بردی۔ ج ۲۔ ص ۳۷۴ — [۲] ابن خلکان۔ ج ۱۔ ص ۳٦٦ —
[۳] ابن خلکان۔ ج ۱۔ ص ۳٦٦ — [۴] ابن خلکان ج ۱۔ ص ۳٦٦ — [۵] ابن اثیر ج ۸۔ ص ۲۱۷ — [٦] ابن خلکان ج ۱۔ ص ۳٦٦ —

سیف الدوله کے چار بیٹے تھے - ابوالھیجا عبداللہ نے سنہ ۳۳۸ (سنہ ۹۴۹) میں انتقال کیا - ابوالبرکات کی موت جمادی الآخر سنہ ۳۵۴ (سنہ ۹۶۵) کو واقع ہوئی، اور ابوالمکارم کا انتقال سنہ ۳۵۵ (سنہ ۹۶۶) میں ہوا - ابوالمعالی سعد الدولہ باپ کا جانشین ہوا -

گذشتہ اوراق میں جو کچھ بیان ہوا وہ سیف الدولہ کی زندگی کا صرف ایک رخ تھا - بہادر سپاہی اور تجربہ کار سپہ سالار ہونے کے علاوہ سیف الدولہ علم و فن کا مربی، اور علماء و فضلاء کا سرپرست تھا - اسی وجہ سے اس کا دربار ہر طرح علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا - جب تک اس کی زندگی کے اس رخ کو ظاہر نہ کیا جائے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ دنیائے اسلام میں اس شخص کے کارنامے کیا تھے، اور کس طرح اس نے ایک طرف مسلمانوں کی سرحد کی حفاظت کی، اور دوسرے طرف علم و فن کو فروغ دیا - کہا جاتا ہے کہ ''انہ لم یجتمع بباب احد من الملوك بعد الخلفاء ما اجتمع ببابه من شیوخ الشعر و نجوم الدھر'' [۱] -

[۱] ابن خلکان - ج ۱ - ص ۳۶۴ -

بنی حمدان کا شجرۂ نسب [۱]
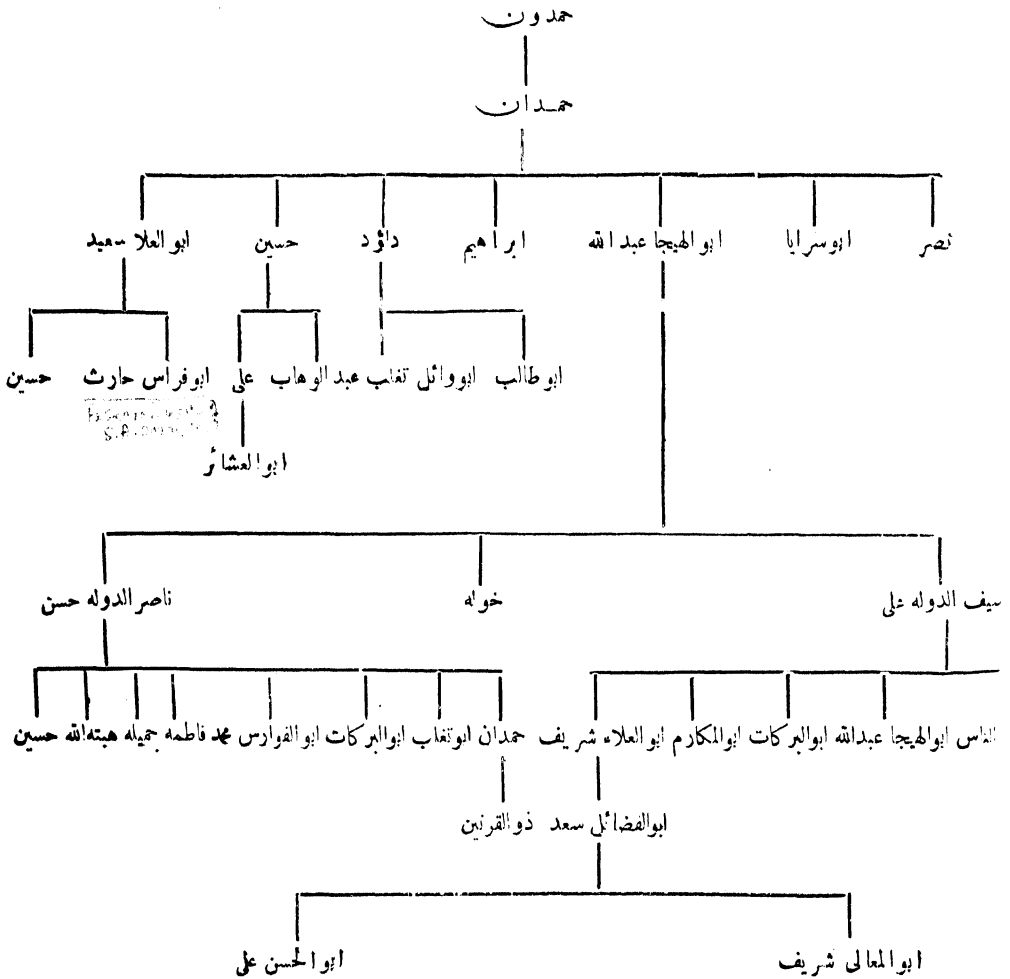
[۱] Wustenfeld's Genealogische Tabalen der Arabischen Stamme und Familien, Gottingen, 1852. C.

موجودہ شجرہ میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔

حوالہ جات :-

(۱) ابن اثیر : کامل جلد ۷ ، ۸ - مطبوعہ مصر سنہ ۱۲۹۰ ھجری

(۲) ابوالمحاسن ابن تغری بردی : نجوم الزاھرہ - جلد ۲ - مصححہ ژون بال - لیدن (بریل) سنہ ۱۸۵۰ ء

(۳) ابوالفداء : کتاب المختصر فی اخبار البشر - جلد ۲ - مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۲۵ ھجری

(۴) ذھبی : دول الاسلام - جلد ا - دائرۃ المعارف - حیدر آباد دکن سنہ ۱۳۳۷ ھجری

(۵) الیافعی ، عفیف الدین : مرآۃ الجنان و عبرۃ الیقظان - جلد ۲ - دائرۃ المعارف - حیدرآباد دکن - سنہ ۱۳۳۷ ھجری

(۶) ابن خلکان : وفیات الاعیان - مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۱۰ ھجری

(۷) یاقوت : معجم البلدان - مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۲۷ ھجری

(۸) محمد راغب بن محمود بن ھاشم الطباخ : اعلام النبلاء فی تاریخ حلب الشھباء - جلد ا - حلب سنہ ۱۳۴۲ ھجری

(۹) ابن العبری ، غریفوریوس ابی الفرج بن ھارون الطبیب الملطی المعروف بہ : تاریخ مختصر الدول

(۱۰) ابن مسکویہ : تجارب الامم جلد ۲ مصححہ آمدروز - مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۳۳ ھجری

(۱۱) مسعودی : کتاب التنبیہ والاشرف - مصححہ دی خویہ

(۱۲) ابن خلدون : کتاب العبر - مطبوعہ مصر - جلد ۴

(۱۳) زبدۃ الحلب - مصححہ فریٹاگ (Freytag) - مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۱۹ ء -

(۱۴) Freytag: Geschichte der Dynastien der Hamdanides in Mosul und Aleppo. (In Zeitschritt der Deutschen morgenlandischen Gesellschaft, vol. XI, 1857)
اس مضمون کا حوالہ فریٹاگ کے نام سے دیا گیا ھے -

(۱۵) Sadruddin, M.,: Saifuddaulah and his Times, Lahore, 1930.

(۱۶) Le Strange: Palestine under the Moslems, London, 1890.

(۱۷) Weil: Geschichte der Chalifen, Mannheim, 1848, vol. II. III.

(۱۸) Wustenfeld: Genealogjsche Taballen der Arabishen Stamme und Familien, Gottingen, 1852-

دیکھو، کسی شخص کی شراب خواری کے حکم کے لئے کتنے اشخاص اور کتنے ماهرین فن سے مدد لینے کی ضرورت هوی ،، اس شخص نے جو عاقل، بالغ، تها بغیر کسی مجبوری کے شراب پی هے یه اصلی مقدمه هے جس پر حکم لگے گا. اس کے ثبوت کے لئے دو عاقل، بالغ مسلمان مردوں کی ضرورت هے۔ کیونکه نا تجربه کار هونے کی وجه سے حدود میں عورتوں وغیره کی شهادت نا قابل قبول هے۔ دوسرے احکام اسکے موقوف علیه هیں جن میں معیار شهادت کی ضرورت نهیں، بلکه اخبارات سے غلبه ظن کا حاصل هوجانا کافی هے۔ اب رہ گئی یه آیت اذا جاء کم فاسق بنبا فتبینوا یعنے جب تمهارے پاس کوئی فاسق کسی قسم کی خبر لائے تو اسکی تحقیق کرو۔ اخبار پر یقین کرنے کے لئے یا یوں کهو که اخبار پر یقین کئی وجوه کے مجموعه سے حاصل هوتا هے۔

کهنے والا (۱) پوری عقل کا (۲) راست باز (۳) معامله فهم (۴) واقعات کو صحیح طور سے خیال رکهنے والا (۵) جس شئی کی خبر دینا چاهتا هے اسکو اچهی طرح سے ادا بهی کرتا هو (٦) جس شخص کے متعلق شهادت دیجاتی هے کیا اس سے قرابت قریبه تو نهیں یا عداوت تو نهیں (۷) یا اس کے زیر اثر اور اس کا خادم تو نهیں (۸) قرائن سابقه ولا حقه معین مثبت یا مخالف و نافی تو نهیں (۹) زمانهٔ وقوع سے اسکی روایت کو کتنا بعد هے (۱۰) محل وقوع سے اس روایت کرنے والے کو کتنا بعد هے ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد کهیں یقین یا غلبه ظن حاصل هوتا هے۔ پس فاسق کا خبر دینا خبر کو یقین سے دور کرتا هے۔ ایسی صورت میں مختلف امور پر غور کرنا، ماحول اسباب وعلل پر فکر و خوض کرنا ضرور هے تا که مجموعهٔ اسباب سے جانب اثبات یا جانب نفی کو قوت حاصل هو جائے۔

یه بات یاد رکهنی چاهئے که یقین کیا نهیں جاتا، یه انسان کا بالا راده فعل نهیں که چاها یقین کیا چاها یقین نه کیا۔ یه نفس کا واقعات سے تاثر هے یا ایک قلبی کیفیت هے جو بے اختیار پیدا هوتی هے۔

ایک حجرے میں ایک عورت هے جسے درد زه هو رها هے۔ اسکے پاس ایک هندو دائی هے باهر خاوند هے۔ دائی ایک بچه کو اس حجرے میں سے باهر لاتی هے اور کهتی هے که آپ کے یه لڑکا پیدا هوا هے۔ مبارک هو مبارک۔

دیکھو صرف ایک ہندو دائی کہتی ہے کہ یہ بچہ اس شخص کا ہے اور اس شخص کو یقین آجاتا ہے۔ اور شرع اس بچے کو اس شخص کا وارث تسلیم کرتی ہے

اگر میرے سامنے ایک مائع شیشی میں بھرا ہوا ہو اور ایک مولوی صاحب فرمائیں کہ یہ شراب نہیں ہے اور ایک شرابی کہے کہ یہ شراب ہے تو مجھے مولوی صاحب کے قول کی نسبت شرابی کے قول پر زیادہ اعتماد ہوگا۔ کیونکہ شرابی کو شراب سے سابقہ رہتا ہے۔ وہ اسے جانتا اور سمجھتا ہے

یہ بات خیال رکھنی چاہئے کہ جب ہم شرعی حکم کسی پر لگاتے ہیں تو ایک مقدمہ صغریٰ ہوتا ہے جو واقعاتی اور جزئی ہوتا ہے اور ایک مقدمہ کبریٰ جو شرعی کلیہ اور اصول دین سے ہوتا ہے۔ واقعاتی مقدمہ کا اثبات شہادت اور خبر سے ہوتا ہے۔ شہادت فصل خصومات اور عقوبات میں حاکم و قاضی کے پاس ہوتی ہے

اخبارات سے اپنے عمل کے لئے یقین یا ظن حاصل کیا جاتا ہے

اصول یقینیات حسب ذیل ہیں۔ اولیات، مشاہدات، وجدانیات، فطریات، حدسیات، تجربیات، متواترات۔ تجربیات پر دنیا کا تمام کام چلتا ہے۔ اسی سے تمام علوم و فنون بنتے ہیں۔ تجربیات و مشاہدات وغیرہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ناقابل انکار ہوتا ہے۔

ماہر فن کا قول جس کو تجربات اور اختبارات سے علم حاصل ہے، قابل قبول ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص ہر امر کی تحقیق نہیں کر سکتا، ماہر فن کا قول معتبر ہے۔ لہذا ماہر فن کے لئے ضرور نہیں کہ مسلمان اور عدل ہو۔ اگر ایک انگریز ڈاکٹر کہے کہ یہ دوا زہر ہے یا لیبل پر پائزن لکھا ہوا ہو اور کوئی باوجود اس علم کے اس دوا کو کھائے اور مرجائے تو وہ بلاشک خود کشی کا مرتکب سمجھا جائیگا۔

متواترات سے پیدا ہونے والا یقین بھی ناقابل انکار ہے۔ اس کی مخالفت نرا مکابرہ ہے۔

متواترات میں مرد اور مسلمان اور عدل ہونا ضرور نہیں۔ سب جانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ لندن ایک بڑا شہر ہے سلطنت برطانیہ کا پایہ تخت ہے۔ مگر کس مسلمان عاقل، بالغ، عدل نے دیکھ کر بیان کیا۔

خبر متواتر میں الفاظ متحد ہوں تو لاریب موجب یقین ہے۔ الفاظ مختلف اور معنے متحد ہوں تو تو بھی قطعاً موجب یقین ہے بات یہ ہے کہ انسان خبر کے بعد خبر سنتا جاتا ہے اور اس کا علم بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کو یقین ہو جاتا ہے۔

قرائن اور ماحول کو بھی یقین وظن کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بلاتحقیق ہر ایک دعوی مان لیا جائے وھمیات کو ظنیات یا ظنیات کو یقینیات سمجھ لیا جائے ہر کس و ناکس کی بات قبول ہی کرلی جائے۔ راویان حدیث کی جرح و تعدیل کی جاتی ہے تا بہ دیگرے چہ رسد مگر ضرور ہے کہ جو شئی متواتر ہو روز روشن کی طرح واضح ہو اس کا انکار بھی نہ کیا جائے۔

مولنا بحر العلوم شرح مسلم الثبوت (ص ۸۴ الاصل الثانی سنة) میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غایة ما یقال فی الجواب انه ای القدر المشترك بین الاخبار المنقولة۔ معلوم لا لان احدها صدق فقط عقلا حتی یرد ماقلت بل انما هو معلوم بالعادة قال العادة الالهیته قد جرت با حداث العلم عندوجود هذه الاخبارات وذلك کما فی التجربیات فان العادة الالهیة جرت با حداث العلم بعد التجربة والتکرار و السرفیه ان اجتماع الظنون الحاصلة باخبارات کثیره یعد الذهن عادة لقبول الذهن العلم والیقین الواقعی والاخبارات علی هذا الوجه انما لا یکون عادة الا فیما کان القدر المشترك حقا مطابقا للواقع فتفکر فان انکار ذلك مکابرة

اور صفحہ ۲۲۴ میں تحریر فرماتے ہیں۔

تقسیم للحنفیة محل الخبر مطلقا من غیر تقیید کونه خبرا عن رسول الله صلی الله علیه و علی اله و اصحابه و سلم، اما حقوق الله تعالی وهو عقوبات اولا کالعبادت والمعاملات وهو ای خبر الواحد العدل مقبول فیهما ای فی العقوبات والعبادات کالاخبار بطهارة الماء ونجاسته فاذا اخبر العدل بنجاسته یباح التیمم والاخبار عن رسول الله صلی الله علیه وعلی اله واصحابه وسلم قال حکمها الوجوب وهو عبادة کما مر ولا یقبل فیهما خبر الفاسق فلا یجوز التیمم باخبار الفاسق بنجاسة الماء بل یعمل بالتحری فان وقع التحری علی الطهوریه یتوضأ وان اخبر الفاسق بالنجاسة فضم التیمم احب وان وقع علی النجاسته تیمم واراقه الماء قبله احب واما حقوق العباد فاما ما فیه الزام محض اولیس فیه الزام اصلا او فیه الزام من وجه دون وجه فما فیه الزام محض کالبیوع عند انکار احدهما ونحوها کدعاوی اخری یشترط مع شرائط

الرواية الولاية فلايقبل قول الكافر على المسلم ولا قول العبد ولفظ الشهادة والعدد كون المخبرين رجلين او امراتين مع رجل واحد عند الامكان . فلا عدد ولا ذكورة شرط فى شهادة القابلة بالولادة فانه لايحضر الرجل عند ذلك فسقطت وقد صح عن رسول الله صلى الله عليه واله وصحبه وسلم انه قبل شهادة القابلة فى الاسلام ولا اسلام فى الشهادات على الكافر اذ قلما يشاهد المسلم معاملة الكفار ففيه ضرورة ايضا وفيه خلاف الشافعى رح وما لا الزام فيه اصلا كالوكالات والهدايا ونحوها ومنه اخبار كون اللحم الذى يباع فى الاسواق ذبيحة مسلم او كتابى فلا شيترط سوى التميز فلا يقبل قول الصبى الغير المميز والمعتوه غير المميز والمجنون يقبل قول المميز مع تصديق القلب صدق المخبر فاذا جاءت جارية واخبرت ان سيدى ارسلت نفسى اليك هدية يقبل قولها ويحل وطيها دفعا للحرج فانه لو اشترط العدالة لاختل امر المعاش فانه قلما يجد الانسان عدلا يعامل معه او يبعثه شهودا مع الهدايا كيف وكان عليه و على اله الصلواة والسلام يقبل خبر الهدية من البر والفاجر والحر والعبد وقد صح انه عليه الصلواة والسلام قبل هدية سلمان حين كونه عبدا نصرانيا وما فيه الزام من وجه دون وجه كعزل الوكيل وحجر الماذون فان هذا الخبر سلب المخبر الولاية التامة ولا تلزمها شيئ من الدعوىٰ فالوكيل والرسول من العادل والفاجر كما قبله يقبل قوله ولو فاسقا او عبدا لانهما يقومان مقام الموكل والمرسل فقولهما قوله وشرط الاسلام فى الخبر الفضولى احد شطرى الشهادة العدد او العدالته . لانه لما كان ذا شبهين عمل بهما فاعطى حكم كل من وجه فلو تصرف الوكيل بعد اخبار واحد فاسق نفذ تصرفه خلافا لهما فانهما يقولان انه مثل الاول لا يشترط فيه شيئ سوى التميز وتصديق القلب لمكان الضرورة قلنا الضرورة قد اندفعت لعدم الاشتراط فى الرسول والوكيل تعامل والا ظهر قولهما وفى وجوب الشرايع على من اسلم بدار الحرب باخبار واحد فاسق او كافر فيه خلاف فقيل تشترط العدالة لانه امر دينى ونقل على الخلاف بين الامام وصاحبيه كما فى القسم الثالث وقيل الاصح عدم اشتراط العدالة اتفاقاً حتى يجب عليه العبادات ويجب القضاء وان لم يأت بها باخبار فاسق وبه قال شمس الائمة لانه اى المخبر رسول الرسول ولا يشترط من اخبار الرسول شيئ وهو منقوض بالرواية فان راوى الحديث ايضاً رسول الرسول والحق ان عدم الاشتراط انما هو فى رسالة رجل بعينه لاخبار شيئ بعينه فى المعاهدات ولا يلزم من ذلك عدم الاشتراط مطلقا والحق فى الاستدلال انه لا يعتبر العدالة ههنا لمكان الحرج العظيم فان وصول العدل ههنا قلما تيسير فلو لم يقبل قول الفاسق والكافر فيه وجوز عدم الايقان يا

لعبادات لم ینل ذلك المسلم الکمال الانسانی و یلحق بالبهائم ۔

ان عبارتوں کا ماحصل یہ ھے کہ جب متعدد طرق سے خبر حاصل ھوتی ھے تو اگر الفاظ میں اختلاف ھو تو وہ متواتر معنوی ھے اور موجب یقین ھے ۔ اور یہ کہ محل خبر اگر عبادات ھو تو مخبر عدل ھونا چاھئے ، مخبر فاسق ھو تو تحری کرنی چاھئے ۔ اگر کوئی مسلم دارالحرب میں ھو تو عبادات میں بھی فاسق و کافر کے خبر پر عمل کرنا چاھئے ۔ الزام یعنی دوسرے پر کوئی شئے واجب ھونے کا حکم لگانے اور تصفیہ حقوق میں حاکم شہادت کے اصول پر تعداد و عدالت و صداقت کا اعتبار کریگا ۔ اگر محل خبر میں مردوں کو دخل نہو تو ایك عورت کا قول بھی کافی ھے ۔ جیسے قابلہ کے قول کو حضرت نے قبول فرمایا ۔ ایسے معاملات میں جو الزام نہیں ھیں ، ممیز کا قول مع تصدیق قلب معتبر ھے ۔

اور صفحہ ۳۰۶ میں متواتر کے عدد کے متعلق فرماتے ھیں ۔

والمختار عدم تعیین العدد للقطع بالعلم باخبار الجماعة من غیر علم بعدد مخصوص لا متقدما علیه ولا متاخرا عنه وایضالا سبیل الی علمه ای العلم بالعدد المخصوص عادة لان الاعتقاد یتقوی بتدریج کالعقل والقوة لبشریة عاجزة عن ضبط ذلك والعدد یقل بقوة اطلاع المخبرین کذ خالیل الملك و مظنة السامعین و قرینة لوقایع عقلا آگے چلکر کہتے ھیں ولو اخبر اهل قسطنطنیه بقتل ملکهم حصل العلم بلاریب فعلم ان العدالة غیر مشروطة وکذالاسلام نعم ذلك ای العدالة والاسلام دخیل فی تقلیل العدد الموجب للعلم و موکد لعدم التواطئی علی الکذب ۔

اس کا حاصل یہ ھے کہ متواتر کے لئے کوئی عدد معین نہیں ۔ قوت اطلاع مخبرین اور مظنہ سامعین اور قرب و قایع کو تقلیل عدد میں بڑا دخل ھے ۔ نیز متواتر میں نہ اسلام شرط سے نہ عدالت مگر یہ موجب تقلیل عدد ضرور ھیں ۔

اب میں ایك اور مسئلہ پر توجہ دلاتا ھوں اور وہ یہ ھے کہ اگر ایك تار کسی ملك سے ھم کو پہنچے تو اتنا ضرور یقینی امر ھے کہ جس ملك سے تار دیا گیا ھے وہ لفظاً لفظاً ھم تك پہنچا ھے اور یہ روزانہ کا تجربہ ھے ایسا ھرگز نہیں ھوسکتا کہ تار دینے والے نے تو تار اور دیا ھے اور پہنچا اور ۔ جو اشارات اس کے لئے متعین کئے گئے ھیں وہ منضبط اور با قاعدہ ھیں ۔ تجربہ اور قواعد اس

پر شاهد عدل هین مگر همکو صرف ایک تار سے اس کا یقین نهیں هوتا که تار دینے والے نے سچ کہا هے، جیسے ایک شخص کے کہنے سے پورا یقین نہیں هوتا۔ اگر مختلف مقامات سے بوقت واحد اتنے تار آئے هوں که ایک جهوٹی بات پر ان سب کا اتفاق کرلینا عقل باور نه کرے تو ظاهر هے که یه بهی خبر متواتر اور موجب یقین هے۔ مین نہیں سمجهتا که کوئی صاحب عقل سلیم اس کی مخالفت پر کربسته هوگا۔

اسکے بعد میں ایک اور مسئلے پر توجه دلاتا هوں۔ که ۲۴ گهنٹے مین افتاب کا پوری زمین کے اطراف گردش کر لینا بهی یقینی امر هے۔ تار کے ذریعے سے معلوم هوتا هے که هر ملک کا جدا وقت هوتا هے۔ کہیں دن هے کہیں رات کہیں صبح هے کہیں شام، کہیں دوپهر هے کہیں آدهی رات۔ میں نے خود اپنے سفر عراق و شام و فلسطین و حجاز میں ایک بالکل صحیح هشت روزه جیب گهڑی ساته رکهی تهی جسکو میں صرف کنجی دیدیتا تها گهٹاتا بڑهاتا نه تها۔ اس سے مجهے معلوم هوتا تها که میری گهڑی میں کچه اور وقت رهتا تها اور اس مقام میں کچه اور۔ اور بہت سے آدمی میرے تجربه کی اپنے تجربه سے تائید کرینگے۔ غرض که زمین کا کروی هونا اور آفتاب کا چوبیس گهنٹوں میں اس کے گرد پهرنا یقینی امر هے۔ اس سے انکار کرنا بالکل درست نہیں۔،،پس چوبیس گهنٹوں میں افتاب زمین کے گرد گهوم جاتا هے۔ تو بعید ترین مقام کا وقت ۱۲ گهنٹوں سے زیاده نہیں هوسکتا زیاده سے زیاده یه هوسکتا هے که کہیں صبح هے کہیں شام هے۔ کہیں دن کے باره بجے هیں اور کہیں رات کے باره۔ ایسا هرگز نہیں هوسکتا که کہیں جمعه کا دن هے اور کہیں یکشنبه یا دو شنبه کا دن اسی طرح یه بهی ممکن نہیں که کہیں پہلی تاریخ هو کہیں تیسری یا چوتهی تاریخ۔ ان قطعیات سے جو انکار کرنے کی جرات کرتا هے اس سے میری گفتگو نہیں۔ علم هئیات پر اعتبار نه کرنا جو هزارها سال اور مختلف مذاهب والوں کے تجربات پر مبنی هیں اتنا ناگوار نہیں جتنا ان کاروباری اور روز مره کے تجربات سے انکار کرنا اور کہنا که کہیں پہلی اور کہیں تیسری اور چوتهی بهی هوسکتی هے۔ متقدمین کے وسائل اطلاع محدود تهے، اب ریل هے، جہاز هے، هوائی جہاز هے تار هے لاسلکی هے جن سے علم صحیح حاصل هوسکتا هے۔ باوجود متواتر طور پر علم حاصل هوجانے کے انکار طریقۂ اهل علم نہیں۔

حدیث شریف میں جو فرمان واجب الاذعان هے۔ صوموالروية الهلال وافطروالرویته یا فان غم علیکم فاکملوا العدة اس کے یه معنے هیں که حضور رمضان یا شوال کا آگر تمکو علم نهین تو

مہینے کی تکمیل کر لو اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سہولت اور عفو ہے کہ رمضان آگیا اور روزہ نہیں رکھا اور شوال آگیا اور روزہ رکھا۔ مواخذہ علم پر ہوتا ہے جب علم نہیں تو عفو ہے۔ اس کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ اگر سال بھر ابر گھرا رہے تو تمام مہینوں کو تیس ہی کے سمجھا کرو۔ ان خیالات سے دامن اسلام پر تو کوئی دھبہ نہیں آتا۔ بلکہ انہی حضرات کا قول نہیں مانا جاتا جو حدیث شریف کے معنے خلاف واقع لیتے ہیں اور دنیا کے علم و یقین اور مشاہدات کے خلاف باور کرانا چاہتے ہیں۔

پس اگر فلک نما کے اسٹیشن سے ایک جگہ ایک تار اور کاچی گوڑے کے اسٹیشن سے ایک تار دوسری جگہ اور سکندر آباد کے اسٹیشن سے ایک تار تیسری ہی جگہ اور نام پلی کے اسٹیشن سے ایک تار ایک چوتھی جگہ اور بیگم پیٹھ کے اسٹیشن سے ایک تار پانچویں جگہ دیا جاے اور سب کا جواب ایک ہی آئے کہ چاند ہوگیا تو یہ خبر متواتر ہوجائیگی اور موجب یقین کیونکہ اتنے مقام کے لوگوں کا جھوٹ پر کمر باندھنا عقل کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب
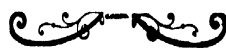
هندوستان میں مغلوں کا قانونی

نظم و نسق

از

ابن حسن

(خاکہ)

اسلامی ریاست میں بادشاہ۔ اس کے فرائض، تحفظ شریعت، اور تحفظ رعیت
تحفظ شریعت کے دو پہلو، اور دربار سے علما کی ایک جماعت اور اس کے صدر کی
منسلک رہنے کی ضرورت۔ صدر اور اس کے فرائض۔ رعیت۔ مسلمان اور غیر مسلم قانون
میں سب کے لئے مساوات۔

مغلوں کی حکومت میں قانون اسکے حدود بہت محدود تھے۔ مسلمان مقننوں کا قائم کیا ہوا
قانونی نظم و نسق۔ دو خاص ذرائع۔ (الف) بادشاہ (ب) صدر (قاضی القضاۃ)۔ صدر، اسکا تقرر، مدت
ملازمت، اختیارات۔ ما تحت منصفوں کے تقررات۔ عدالت کی کارروائی۔ مفتی اور محتسب۔

مغلوں کا دستور۔ مسلمان قانون دانوں کے قائم کردہ دستور پر بالکل مبنی تھا۔ صدر اسکے
علاوہ شہر میں ایک اور منصف (میر عدل) تھا۔ مفتی، محتسب۔ قاضی صرف شہروں تک محدود نہ تھے۔

بادشاہ اور عدل۔ مغل بادشاہ بنفس نفیس عام درباروں میں منصفانہ فیصلے کرتے تھے۔
روزانہ صبح کو ہر شخص کی رسائی ممکن تھی۔ درخواستیں قبول کی جاتی تھیں اور ان پر غور کیا جاتا تھا۔
باقاعدہ عدالتی درباروں کے ہفتہ میں خاص دن مقرر تھے۔ شاہی سیر و سیاحت کی تیاریاں۔ بادشاہ
کس قسم کے مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔

قانون تعزیرات کا نظم و نسق۔ حاکموں سے اسکی علاحدگی کا کہیں ذکر نہیں۔ صوبہ داروں
اور قاضیوں کا باہمی تعلق، اور ان کو قانونی عدالتوں کی نگرانی کے اختیارات۔

تعمیل | اسلامی قوانین کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی تھی ۔ نظائر پیش ہوتے تھے ۔

مغلوں | کے دستور کی اہم خصوصیات :۔

(۱) اسلامی قانون کی پابندی ۔
(۲) ریاست میں منصفوں کی حیثیت معمولی سی تھی ۔ اس کے وجوہ اس کے نتائج ۔
(۳) قانون میں مساوات ، سب کے لئے غیر جانبدارانہ انصاف ۔
(۴) قانونی چارہ جوئی کے لئے بہت کم مقدمات اور ان کے لئے بہت کم عدالتیں ۔ فیصلوں میں عجلت ۔ ایک ایسا دستور جو اس زمانے اور اس معاشرت کے لئے بہت موزوں تھا ۔

بادشاہ | ریاست کی ضرورت اور بادشاہت کا مقصد ، مسلمان قانون دانوں کے نقطۂ نظر سے تحفظ شریعت ، اور حفاظت رعایا ہے ۔

تحفظ شریعت | (قانون ، اسلام میں) دو پہلو رکھتا ہے : علم شریعت کی ترویج اور من حیث القانون سلطنت میں اسکا احیاء ۔ ان میں سے پہلی وجہ سے علماء کی ایک جماعت کا قیام جو درس و تدریس اور احیائے علم میں سرگرم رہے ضروری قرار پاتا ہے ۔ دوسری وجہ سے ان میں سے افضل ترین اور صالح ترین عالم کو بادشاہ کا مشیر سلطنت مقرر کرنا ضروری ہوجاتا ہے ۔ یہ علما قانونی اصطلاح میں بھی علما کہلاتے ہیں ۔ اور ان میں سے جس خاص عالم کا انتخاب کیا جاتا ہے آسکو شیخ الاسلام یا قاضی القضاۃ یا صدر کہتے ہیں [۱] ۔

---

[۱] سیاست نامہ نظام الملک صفحہ ۴۰ ۔ بادشاہ کا فرض تھا کہ ہفتے بھر میں ایک یا دو مرتبہ علما کو جمع کر کے ان سے مذہب اور اصول عدل پر گفتگو کرے جو علما اس طرح مشورہ کے لئے طلب کئے جاتے وہ بھی صدور کہلاتے ہیں ۔ اور ایک خاص عالم جو دائمی طور پر بادشاہ کی پیشی میں رہتا ہے صدر کہلاتا ہے ۔ ھندوستان میں یہ خطاب عام معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے ۔ مختلف زمانوں میں تینوں مذکورہ بالا خطاب استعمال ہوتے رہے ہیں ۔ بہر حال مغل اس عہدے کے لئے مستقل طور پر لفظ ،، صدر یا ،، صدرالصدور ،، کو استعمال کرتے رہے ہیں ۔

صدر مسلمان قانون دانوں کے قائم کردہ اصول کے اعتبار سے صدر بادشاہ اور رعایا کی درمیانی کڑی ہوتا تھا - وہ شرع کا علمبردار اور علما کا نقیب تھا۔ وہ بادشاہ اور رعایا دونوں کے لئے وہ ضروری تھا۔ بادشاہ پر اسکا ممکنہ احترام فرض تھا، اور ضروری تھا کہ وہ اس سے ہر مذہبی یا سیاسی معاملے میں مشورہ لے -

صدر کے فرائض سلطنت میں اسکی حیثیت پر اسکی وسعت عمل کا انحصار تھا:—
اسکے فرائض سہ گونہ تھے -

(۱) مسلمانوں میں کامل ترین عالم، اور مذہبی پیشوا ہونیکی وجہ سے وہ عوام الناس کی تعلیم، خیالات، اور اخلاق کی ایک طرح سے نگرانی کیا کرتا تھا - اور اسی حیثیت کی وجہ سے ریاست میں اسکا اثر بہت اہم ہوتا تھا - سلطنت کے علما کے نمائندے کی حیثیت سے وہ ایسی تمام باتوں سے بادشاہ کو آگاہ کرتا تھا جو مذہب کے مفاد کے مخالف یا منافی ہوں - ان معاملات میں بادشاہ خود رائی سے کام نہیں لے سکتا تھا -

(۲) چونکہ ریاست کا قانون، قانون اسلام پر مبنی تھا، اس لئے وہ محکمہ عدل کا بھی صدر ہوتا تھا، اور اس حیثیت سے وہ قاضیوں اور مفتیوں کے تقررات کا، اور انکے فرائض کی مکمل بجا آوری کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا - اسی وجہ سے وہ تمام علما، فضلا اور طالبعلموں سے واقفیت رکھا کرتا تھا تاکہ اپنے محکمے میں حسب ضرورت عہددار فراہم کر سکے -

اس وجہ سے اسکی قوت اور زیادہ مستحکم ہوگئی اور اسے ملک کے نظم و نسق میں ایک خاص حیثیت حاصل ہوگئی -

(۳) بادشاہ اور رعایا کی درمیانی کڑی ہونیکی وجہ سے یہ اسی کا کام تھا کہ بادشاہ سے مستحق علما اور طالبعلموں کی سفارش کرے کہ انکو فکر معاش سے مخلصی حاصل ہو سکے۔ اسکے علاوہ اور جن معاملات میں ریاست کی مالی امداد کی ضرورت ہوتی انکی اطلاع بادشاہ کو دیتا۔ [۱]

---

[۱] اکبر کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں علما کو زمینات عطا کرنے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ لیکن محکمۂ امور مذہبی کی بد نظمی، اور اس گروہ علما سے اکبر کے قابل گرفت رویہ سے اکبر بہت متنفر ہوگیا اور صدرالصدور کے اختیارات بہت کم ہوگئے -

اس طرح دیوان (یعنی وزیر مالیہ و مالگزاری) سے بھی اس کا تعلق ہوتا تھا۔ اور اس وجہ سے اسکا اثر اور زیادہ بڑھ گیا۔

رعایا یہاں اسلامی نظریۂ ریاست پر بحث کرنے کی گنجایش نہیں اور نہ اسکا موقعہ ہے کہ آنکے قانونی دستور کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ صرف اتنا کہ دینا کافی ہے کہ اسلامی قانون رعایا کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے، مسلم اور غیر مسلم۔ اور بادشاہ پر یہ فرض عاید کرتا ہے کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلم سچے مسلم رہیں، اور غیر مسلم آن تمام حقوق سے مستفید رہیں جو ذمی ہونیکی وجہ سے انکو دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ان اصول پر حکومت کرنے کی دقتیں تیرھویں صدی ہی میں محسوس ہونے لگی تھیں۔ سلطان بلبن اور جلال الدین خلجی [۱] نے انکا کھلم کھلا اعتراف کیا ہے۔ مغلوں نے اپنے سے پہلے کی تین صد سالہ اسلامی حکومت کے تجربوں کو پیش نظر رکھکر ان اصول کی پابندی کی کوشش نہیں کی۔ اسلامی قانون گو غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مساوی سیاسی رتبہ نہیں دیتا تھا، پھر بھی مساوی انصاف اور اسکے سوا امن اور حفاظت جان و مال کا ذمہ دار تھا۔ قانونی معاملات میں مسلمان مقنن دونوں طبقوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ "عدل و انصاف پوری رعایا پر یکساں ہونا چاہئے۔ (جمیع رعایا) بادشاہ ظل اللہ ہے، اور خدا کا لطف و کرم مسلموں اور غیر مسلموں سب کے لئے یکساں ہے" [۲]۔ بادشاہ کو ظلم سے دست کشی کرنی چاہئے کیونکہ آنحضرت کا قول ہے کہ "مظلوم کی آہ خواہ وہ فقیر کیوں نہو بغیر مقبول ہوئے نہیں رہتی" [۳]

مغلوں کا قانون

انتظام عدالت میں دھلی کے سلاطین اسلامی قانون کی پوری پوری پابندی کیا کرتے تھے۔ مغلوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ اکبر کے متعلق البتہ یہ کہ سکتے ہیں کہ بعض بعض

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی برنی۔ صفحہ (۷۰، ۷۱ اور ۲۱۷)۔ [۲] ذخیرۃ الملوک (مخطوطہ صفحات ۱۰۰ اور ۱۱۱)۔ [۳] آداب سلطنت (مخطوطہ صفحہ ۱۴)۔

موقعوں پر وہ اسلامی قانون سے ہٹ گیا ھے ، لیکن ایسے موقعے بہت کم ھیں ، اور ان کی حیثیت بہت معمولی سی تھی ، کیونکہ یہ کسی طرح نہیں معلوم ھوتا کہ اس کی پالیسی نے مسلمانوں کے قانونی نظم و نسق پر کوئی اثر ڈالا ھو ۔ چونکہ قوانین وراثت ۔ شادی اور طلاق کا تعلق مسلمانوں کے ایمان اور عقائد سے تھا اس لئے اس زمانہ میں ان قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح نہیں ھوسکتی تھی اور برٹش انڈیا میں بھی دو قوانین اس وقت بھی اسی شکل میں موجود ھیں

قانون تعزیرات اور قانون شہادت میں کبھی کبھی ترمیم کی جاتی تھی ۔ اور اکبر نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس امر پر زور دیا کہ قاضیوں کو صرف گواھوں کے بیان پر اکتفا نہ کرنی چاھئیے بلکہ حقیقت سے آگاہ ھونیکے لئے دوسرے ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاھئیے [۱] اور اس کے بعد کے جانشینوں نے اگر قانون کی حد تک نہیں، تو کم سے کم عمل کی حد تک اس اصول کو اختیار کیا ۔ اسی طرح بعض ایسے تعزیری مقدمات کا علم ھوتا ھے جن میں سزا دھی مین اسلامی قانون کی پابندی نہیں کی گئی تھی ۔

حدود قانون اس طرح پر جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق تھا ، دیوانی مقدمات قانون شرع شریف کی رو سے فیصل کئے جاتے تھے ۔ قانون تعزیرات (ترمیم شدہ یا بغیر ترمیم کے) مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں تھا ، اسی طرح قانون شہادت اور قانون معاھدہ دونوں کے لئے یکساں تھا ۔

برخلاف اس کے وراثت نکاح وغیرہ کے مقدمات میں ھندو قانون میں کسی قسم کی ترمیم ممکن نہیں تھی ، اور وہ ھندؤں کے لئے بدستور نافذ رھا ۔ اسلامی قانون کی حدود اس لحاظ سے بھی یکہ مختصر ھوگئیں کہ دیہاتوں کے قدیم ھندو نظم ونسق کو معہ ھندو اداروں کے بدستور برقرار رکھا گیا ۔ یہ مغلوں کی رواداری تھی کہ مذھبی اور معاشری اداروں (جن کی اس زمانے کے معاشی حالات میں خاص اھمیت تھی) میں دخل نہیں دیتے تھے ۔ مسٹر مکرجی نے اپنی کتاب Democracies In The East میں لکھا ھے ۔ کہ ھندو سیاسی مفکرین کے نزدیک سرکاری عہدداروں کو گاؤں میں مداخلت

---

[۱] اکبر نامہ جلد سوم ۔ صفحہ ۲۵۷ ، ۷۷۴ (قاسم بیگ تبریزی میر عدل لشکر کے نام نصیحت) اور صفحہ ۲۲۷ ۔

نه کرنا چاهئے ، اور هندو قانون کے مطابق عام حالات میں وہ اس وقت تک اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے جب تک که ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا تھا ۔ نه موروی حکومت ، نه اسلامی حکومت ، اور نه اکبر یا اورنگ زیب کے مرکزی نظم ونسق اور نه انگریزوں کے دائمی بندوبست یا رعیت واڑی طریقے نے دیہاتی طبقوں کے روایتی حقوق میں دخل اندازی کی ۔ اور اب بھی وہ اسی طرح باقی هیں جیسے اوتھا شاستر (صفحه ۲۰۷) میں انھیں بیان کیا گیا هے ۔

اسطرح دیہاتوں اور انکی ستر فیصدی سے زیادہ آبادی کو چھوڑ کر ، حکومت کا ذمه دارانه عدالتی نظم ونسق صرف بڑے بڑے حلقوں یعنی :— پرگنے ، قصبات ، سرکار (اضلاع) ، صوبے کے مرکز اور دارالسلطنت کی حد تک موقوف تھا ۔

ان حلقوں میں بھی قانون وراثت ونکاح وغیرہ میں هندؤں کی حد تک انکے قوانین بر قرار رکھے گئے تھے ۔ بدایونی کا یه بیان که هندؤں کے مقدمات کی سماعت بھی هندو منصفین کرتے تھے ، اسی قسم کے مقدمات کے متعلق هوگا [۱] ۔ اسی طرح ابو منصرات کا یه قول که برهمن اپنی پنچایت سے عوام پر حکومت کرتے هیں ، دیہاتوں کے قانونی نظم و نسق کے متعلق هوگا [۲] ۔

قانونی نظم و نسق

مغلوں کے زیر حکومت ، سلطنت کے نظم و نسق کی بنیاد انہیں آئین پر تھی جو مسلمان قانون دانوں کے مقرر کردہ تھے اور اس کی ترکیب وهی تھی جو سلاطین دهلی نے قائم کی تھی ۔

اگرچه که مسلمان مقننوں میں اس امر میں اختلاف هے که بغیر قاضی کی مدد کے کس حد تک بادشاہ کو نظم و نسق عدل کا اختیار هے مگر اس بات پر سب متفق هیں که آسے بنفس نفیس قانونی مقدمات کی سماعت کا اختیار هے ۔ پھر بھی جمعیت علماء کا تقرر جو قانونی مسائل پر فتوے دے سکیں ، اور ان میں سے قابل ترین عالم کا قاضی القضاۃ مقرر کیا جانا ضروری تھا ۔ اس طرح انہوں نے نظم و نسق عدالت کے دو مرکز قرار دئے هیں ۔ بادشاہ اور قاضی القضاۃ ۔

---

[۱] البدایونی ۔ منتخب التواریخ جلد دوم صفحه ۳۵۶ ۔ [۲] ابو منصرات ۔ شرح صفحه ۲۱۹ ۔

قاضی القضاۃ بادشاہ اپنی رائے سے ، اور اپنی واقفیت سے کسی کو اس عہدے کے لئے نامزد کرے ۔ عہدے کی دعوت بادشاہ کی جانب سے ہوتی تھی ۔ اس عہدے کے لئے درخواست نہیں کی جا سکتی تھی ۔ تقرر کرنے والے (یعنی بادشاہ) کو اسے برطرف کر دینے کا بھی اختیار تھا ۔

مدت ملازمت مسلم قانون دانوں کے ایک گروہ نے قاضی القضاۃ کی مدت ملازمت کو بہت مختصر قرار دیا ہے ، بعض تو اس کے لئے ایک سال کافی تصور کرتے ہیں تاکہ وہ کسب علم کو فراموش نہ کرے ۔

اس کے اختیارات جب بادشاہ قاضی القضاۃ کا تقرر کر دیتا تھا تو پھر اپنے ماتحت قضاۃ کے تقرر کا اسے اختیار ہوتا تھا ۔ الماوردی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب تک بادشاہ اسے یہ کہہ کے تمام اختیارات نہ دیدے کہ "میں تمہیں تمام معاملات میں قاضی قرار دیتا ہوں" اس وقت تک اسے اسقدر وسیع اختیارات حاصل نہیں ہو سکتے ۔

بادشاہ کو قاضی کے قانونی اختیارات مین دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا ۔ وہ نہ یہ حکم دینے کا مجاز تھا کہ دارالسلطنت مین آسکی واپسی تک کسی خاص مقدمے کی سماعت ملتوی رہے ۔ اور نہ وہ کسی فیصلہ شدہ مقدمے کی ، جسکو قاضی اپنی صوابدید سے فیصل کر چکا ہو دوبارہ سماعت کرا سکتا تھا ۔

قاضی عسکر لیکن بادشاہ کو یہ اختیار تھا کہ فوج کے لئے ایک جداگانہ قاضی مقرر کرے ۔ مگر اس قاضی کے اختیارات صرف حدود متعلقہ تک محدود تھے ۔ قاضی عسکر ان مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتا تھا جن میں طرفین میں سے کوئی فرد قاضی شہر کے علاقے کی حدود میں سکونت رکھتا ہو ۔ ہاں کبھی کبھی اسکو پورے اختیارات دے دیئے جاتے تھے کہ وہ ان مقدمات کی بھی سماعت کرے جن میں طرفین اہل مقدمہ میں سے ایک فریق اسکے حلقہ کا ساکن ہو ۔

شہر میں ایک سے زیادہ قاضی بادشاہ کو اسکا بھی اختیار تھا کہ وہ وقت واحد میں

ایک سے زیادہ قاضیوں کا تقرر کر سکے۔ لیکن اس صورت میں ان کے فرائض کی الگ الگ صراحت کردی جاتی تھی ۔

اس کے فرائض قاضی صرف منصف ہی نہیں بلکہ نگران کار محبس بھی ہوتا تھا، اور اپنے علاقے کے تمام اوقاف کا امین بھی وھی ہوتا تھا۔ اسکا فرض تھا کہ پابندی سے محبسوں کا معائنہ کرے اور قیدیوں کی حالت کی نگرانی کرے ۔

عدالتی کارروائی عدالت کا اجلاس کسی عام مقام پر اور عموماً مساجد میں [۱] ھوا کرتا تھا تاکہ غربا و مساکین آسانی سے اس تک پہنچ سکیں۔ اس کے ساتھ کاتب موجود رہتے تھے جو گواھوں کی شہادتیں قلمبند کرتے جاتے تھے، اور مترجم موجود رہتے تھے جو اس صورت میں کہ اھل مقدمہ یا گواھوں میں سے کوئی ایسی زبان بولتا ھو جو قاضی سمجھ نہ سکے، اس کا مفہوم قاضی کو سمجھاتے تھے ۔

فریقین اھل مقدمہ عدالت کی نظر میں یکساں تھے۔ اگر خود بادشاہ بھی فریقین میں ھوتا تب بھی عدالت کے آداب نشست میں کوئی تبدیلی نہ کی جاتی ۔

اگر مدعی عدالت میں بلا کسی تحریری درخواست کے حاضر ھوتا تو کاتب اس کے بیان کے ضروری امور کو مختصر طور پر لکھ لیتا اور پھر مدعا علیہ کو طلب کرتا ۔

جب دونوں فریق جمع ھوجاتے تب مقدمہ قاضی کے سامنے پیش ھوتا۔ مقدمہ اگر واضح اور قرین قیاس ھوتا تو اس کی سماعت ھوتی ورنہ خارج کردیا جاتا ۔

کارروائی کے دوران میں کاتب بیانات کو قلمبند کرتا جاتا اور قاضی غور سے مدعی کے بیان کو سنتا جاتا۔ جب بیان ختم ھو جاتا تو وہ کاتب کے قلمبند کردہ بیان کو پڑھ کر سناتا۔

---

[۱] علاءالدین خلجی کے زمانے میں قاضی مساجد میں بھی عدالت کیا کرتے تھے۔ مگر مغلوں کے زمانے میں یہ پابندی تھی کہ انھیں سرکاری مکانات میں اجلاس کرنا پڑتے تھے۔

اور اگر مدعی اس کو صرف بحرف صحیح تسلیم کرتا تو قاضی مدعا علیہ سے مخاطب ہو کر کہتا کہ فلاں شخص نے تمہیں اس الزام میں ملزم گردانا ہے ، تمہیں اس کے خلاف کیا کہنا ہے ۔ اقبال کرتے ہو یا انکار ؟ اگر وہ الزام سے انکار کرے اور اپنی بریت کے لئے کوئی بیان دے تو وہ بھی قلمبند کیا جاتا تھا ، اور اسے پڑھ کر سنایا جاتا تھا ۔ قاضی ان دونوں بیانوں کو سامنے رکھکر مقدمے کی تحقیق کرتا اور بجز اس صورت کے کسی مزید گواہ کے اظہار کی ضرورت ہو ، وہیں فیصلہ صادر کر دیتا ۔ اگر مقدمہ ثابت نہوتا تو وہ مدعی سے قانون شہادت کے تحت مزید واضح ثبوت طلب کرتا ۔ جب کوئی گواہ عدالت میں آتا تو قاضی اسے کسی قسم کی ہدایت نہیں کرتا جب کارروائی ختم ہو جاتی تو وہ حسب قانون فیصلہ صادر کرتا ۔

مفتی مفتی کا وجود لازمی نہیں تھا ۔ اگر قاضی خود فتویٰ دینے کا مجاز نہوتا تو وہ مقدمے کو مفتی کی طرف رجوع کرتا اور اس سے فتویٰ طلب کرتا ۔

محتسب اسلامی سلطنت میں ایک محتسب بھی ہوتا تھا جس کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ وہ پولیس کے فرائض یعنی تجارت کے آلات وزن آلات پیمائش کی تنقیح کرے یا شراب خواری ، اور قمار بازی کا انسداد کرے بلکہ وہ مذہبی محتسب بھی ہوتا تھا ۔ اس حیثیت سے اس کے جو فرائض ہوتے تھے ان کو الماوردی نے حسب ذیل طریقے پر گنایا ہے ۔

(۱) یہ نگرانی اس پر فرض تھی کہ مسلمان پابندی سے نماز پڑھیں ، رمضان میں روزے رکھیں ، اور شراب سے پرہیز کریں ۔

(۲) انسداد گداگری بھی اس کا فریضہ تھا ، خصوصاً تنومند لوگوں کو وہ بھیک مانگنے سے باز رکھتا تھا ۔

(۳) وہ طبیبوں کے وثیقہ جات کی تنقیح کیا کرتا تھا تاکہ بہروپیے اس پیشے کو اختیار نہ کر سکیں ۔

(۴) غلاموں کی حالت کی نگرانی بھی اس پر فرض تھی اور وہ اسکا خیال رکھتا تھا کہ آقا غلاموں پر بہت زیادہ سختی نہ کریں۔

(۵) سفر کرنے والے جہازوں کی بھی وہ تنقیح کرتا کہ کہیں وہ اسقدر بوجھ نہ لادیں جو سنبھل نہ سکے یا وہ طوفان اور تیز ہوا میں سفر نہ کریں جس سے مسافروں کی جان خطرے میں پڑجائے

(٦) یہ بھی اس کا فرض تھا کہ وہ کوئی عمارت عام شاہراہوں پر بننے نہ دے۔ اور اگر بنائی جائے تو فوراً منہدم کرادے، خواہ وہ مسجد ھی کیوں نہو۔ [۱]

مغلوں کا نظم و نسق

مغلوں کے نظم و نسق کی تنظیم اسلامی مقننوں کے مقرر کردہ آئین پر مبنی تھی۔ بادشاہ قاضی القضاۃ کا تقرر کرتا تھا؛ جو صدرالصدور کہلاتا تھا۔ اور اس صدر کو ماتحت قاضیوں کے تقرر کا اختیار حاصل تھا۔ گو کہ بادشاہ کی اجازت بھی ضروری تھی۔ بادشاہ اپنے اختیارات سے ھر شہر میں ایک سے زیادہ قاضی کا بھی تقرر کرتا تھا، ھر بڑے شہر میں ایک قاضی اور ایک میر عدل ھوتا تھا۔ مغل فوج کے لئے قاضی عسکر کا بھی تقرر کرتے تھے، اور اکثر اسکے ساتھ بھی ایک میر عدل ھوتا تھا۔ مفتیوں کا تقرر التزام کے ساتھ نہ تھا۔ سلطنت کے معمولی حلقوں میں انکا ذکر بہت کم آتا ھے۔

محتسب اپنے مروجہ (پولیس کے اور اخلاق) فرائض کی انجام دھی کے دارالسلطنت اور صوبوں کے مستقر پر مقرر کئے جاتے تھے۔ مگر الموردی کے آئین کے بر خلاف سڑکوں اور جہازوں کی نگرانی یہاں ان پر فرض نہ تھی۔ محتسبوں کا تقرر بھی صدرالصدور کے وسیلے سے ھوتا تھا۔ [۲]

قاضی صرف شہروں کی حد تک محدود نہ تھے

عام طور پر، غلطی سے یہ باور کیا جاتا ھے کہ مغلوں کے زمانے میں صرف دارالسلطنت یا صوبوں کے مستقر یا دوسرے بڑے بڑے شہروں میں قاضیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ لیکن مختلف منتشر مواد سے

---

[۱] یہ حصہ الموردی (احکام سلطانیہ) ھدایا اور سلطان الملوک پر مبنی ھے۔ مسودہ برٹش میوزیم میں یا ۲۳۳، جلدیں ۲٦ - ۴۱ - [۲] مراۃ احمدی۔ مسودہ برٹش میوزیم ۳۲۰

جو ابتک دستیاب ہوسکا ہے یہ مکمل طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قصبات اور پرگنوں تک میں قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔ صرف دیہات البتہ مستثنے تھے۔

ابوالفضل اس مبحث پر بالکل خاموش ہے۔ آئین اکبری میں عہدہ داران عدالت کے متعلق صرف دو جملے ہیں سلطنت میں صدرالصدور کی حیثیت کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ "قاضی اور میر عدل اسکے ماتحت ہیں" [۱]۔ اور ایک دوسری جگہ وہ لفظ میر داد کو صدرالصدور کی جگہ استعمال کرتا ہے اور لکھتا ہے "اسکا عناد اور خود غرضی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ جس کی نظر میں نگہبان کی نظر کی وسعت و بلندی ہونی چاہئے۔ اور جو محض گواہوں اور قسموں پر اعتماد نہ کرے" [۲]۔ برخلاف اسکے مراۃ احمدی کے مصنف نے اس مسئلے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "صوبوں اور قصبات کے قاضیوں کا تقرر صدرالصدور کے ذریعے سے، دربار کی سند پر ہوتا ہے۔ اور وہ صوبوں کے صدور کے ذریعے سے جائزہ حاصل کرتے ہیں [۳]"، اس اہم ثبوت کے علاوہ (جو مغلوں کے صوبجاتی معاملات میں سند تسلیم کیا جاتا ہے) حسابات کی وہ مثلیں جو پرگنوں سے مرکزی حکومت کو بھیجی جاتی تھیں، یہی ظاہر کرتی ہیں۔ ان میں ایک مستقل مد اس انعام کی ہے جو قاضیوں کو عید کے موقوں پر دیا جاتا تھا [۴]۔ محکمۂ مالگزاری کا یہ دستور تھا کہ ہر پرگنے کے بازار کے چالو بھاؤ جو دارالسلطنت کو لکھکر بھیجے جاتے، ان پر مقامی قاضی کے دستخط ہونا ضروری تھے۔

لیکن قصبوں اور پرگنوں میں قاضیوں کے ساتھ ساتھ میر عدل کا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس زمانے کی معاشی حالت اور معاشرتی انتظام کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس میں بہت زیادہ مقدمہ بازی کے امکانات نہیں تھے، ہر طرح سے یہ مان لینے میں کوئی امر مانع نہیں کہ میر عدل ان مقامات پر ہوتے بھی نہیں تھے۔

بادشاہ اور عدل

عدالت کے نظم ونسق کا دوسرا مرکز بادشاہ کا دربار تھا۔ مغل شہنشاہ، مسلم مقننوں کے

---

[۱] آئین۔ صفحہ ۱۹۸۔ مترجمہ میوزیم صفحہ ۲۶۸ — [۲] آئین اکبری صفحہ ۵۔ مترجمہ بیوریج صفحہ ۲۹۱ — [۳] مراۃ احمدی۔ ف ۳۲۰ — [۴] برٹش میوزیم مسودہ —

دیئے ہوئے حقوق کو مقدمات کی سماعت میں پوری طرح استعمال کرتے تھے۔ لیکن ان کی یہ خواہش اور فکر کہ وہ بنفس نفیس انصاف کریں اور ظالموں کے مقابلے میں مظلوموں کی داد رسی کریں اسوقت تک پوری نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ اس کا انتظام نہو تاکہ رعایا آسانی سے دربار شاھی تک پہنچ سکے جس طریقے سے اسکا انتظام کیا گیا تھا اسکا مفصل ذکر معاصر تذکروں اور اس زمانے کے یوروپین سیاحوں کے سفر ناموں میں موجود ھے ۔

مغل شہنشاہ نے کاروبار سلطنت کے لئے ایک مستقل نظام العمل مرتب کر رکھا تھا ۔ اکبر دن میں کم سے کم تین مرتبہ برآمد ہوکر مسلسل تین تین چار چار گھنٹوں تک بیٹھ کے کام کرتا ۔ جہانگیر نے بھی اس دستور کی پیروی کی ۔ اور شاہ جہاں نے اس کو اور زیادہ منظم بنادیا اور کام کے گھنٹے بڑھادئے تاکہ وسیع سلطنت کے بڑھتے ہوے کاروبار کو سرانجام دے سکے ۔

سب سے پہلی مرتبہ تو یہ سلاطین طلوع آفتاب کے وقت رعایا کو درشن دکھانیکے لئے برآمد ہوتے پھر اسکے بعد دربار عام ہوتا جس میں ھندو مسلم ، غریب امیر ، مرد عورت سب کو آنیکی اور اپنی تحریری عرضیاں اور اپنے مقدمات بادشاہ کے سامنے پیش کرنیکی اجازت تھی ۔ اکبر ایسے مقدمات کا وھیں فیصلہ کر دیتا اور وھاں تقریباً چار سے لیکر ساڑھے چار گھنٹے تک صرف کر دیتا اور شاھجہاں اڑتالیس منٹ کے عرصے میں صرف درخواستیں لے لیتا اور پھر مقدمات کی اھمیت کے اعتبار سے ایک کھلے ہوے دربار (جو دربار خاص و عام کہلاتا تھا) یا اپنے حجرۂ خاص میں فیصلے صادر کرتا تھا ۔

تیسرے پہر اور شام کو جو اجلاس [۱] ہوتے وہ صرف اہم تر سرکاری کاروبار کے لئے مخصوص تھے ۔ جن میں صرف وزرا اور عمائد سلطنت شریک ہوسکتے تھے ۔

---

[۱] یہ اجلاس ایک خاص کمرے میں ہوتے جو ,, غسل خانہ ،، کہلاتا تھا ۔ اکبر اور جہانگیر یہاں شام کو آتے ، لیکن شاھجہاں دربار سے واپسی ھی پر یہاں آتا اور یہاں زیادہ دو گھنٹے کام کاج میں صرف کرتا ۔ وہ اپنے بزرگوں کے برخلاف شاہ برج میں بہتر (۷۲) منٹ تک وہ ایک پوشیدہ اور مختصر سا اجلاس کرتا ۔ سہ پہر کے بعد کے اجلاس بھی شاہ جہاں کے عہد میں بدستور جاری رھے ۔ اور وھاں پر وہ عصر سے مغرب تک نشست رکھتا ۔ اپنے بزرگوں کی طرح وہ شام کو بھی دربار کرتا جو عشاء کے وقت تک جاری رھتا ۔ اور پھر کھانیکے لئے برخاست ھو جاتا ۔

طلوع آفتاب کے وقت درشن کی رسم اکبر کی ایجاد تھی۔ اور اُس کی بنیاد ھندوستانی ذھنیت کے مطالعے پر تھی۔ ’’جب بادشاہ جھروکہ کی کھڑکی میں نمودار ہوتا تو ھندوؤں کے گروہ کے گروہ جمع ہوجاتے تاکہ دن کے کام کاج کو وشنو کے دوسرے جنم لینے والے کی صورت دیکھکر شروع کریں،، [۱]۔ اُس کے بعد ھی جو دربار عام ہوتا اُس میں عوام الناس کو بادشاہ تك آسانی سے پہنچنے کا موقع ملتا۔ اور جس تلطف اور مہربانی سے اُن کی طرف توجہ کی جاتی اس کی وجہ سے ان کی ھمت بڑتی کہ وہ اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کرسکیں، اور ملك کی سب سے طاقتور ھستی سے اپنے نقصانات کی تلافی حاصل کرسکیں۔

معاصر مصنفین یہ بیان کرتے ھیں کہ لوگ اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھاتے تھے، اور مغلوں کے دور حکومت میں یہ رسم بہت مفید رھی۔ بدایونی لکھتا ھے۔ ’’لوگ جوق درجوق جمع ہوجاتے اور بہت چہل پہل ہوتی،، [۲]۔ دھایت نے جہانگیر کے زمانے میں بھی یہی دیکھا۔ ’’عوام الناس صحن میں جمع ہوجاتے ھیں۔ اُس کا (بادشاہ کا) بادشاہ سلامت کے نعرے سے استقبال کیا جاتا ھے۔ ان مواقع پر ھر اس شخص کو باریابی کا موقع ملتا ھے جو ایك تحریری عرضی لایا ہو۔ [۳]

شاھجہاں کے دور حکومت کا مورخ لاھوری شاھجہاں کے جھروکے میں نمودار ہونے اور روزانہ دربار کرنے کا حال لکھتا ھے۔ لوگ اپنی درخواستیں گذرانتے اور اپنے مقدمات پیش کرتے۔ محکمۂ عدالت کے منشی اُن کے خلاصے لکھ لیتے اور ان کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتے [۴]۔

برنیز، اورنگ زیب کے زمانے کے حالات میں یہی لکھتا ھے۔ ’’تمام لوگ جو عرضیاں لیکر ’’عام خاص،، یعنی کھلے ہوئے دربار میں جمع ہوتے، بادشاہ کے سامنے لائے جاتے، مقدمات

---

[۱] ای۔ بی۔ ھیول۔ ’’History of Aryan Rule in India,, صفحات ۵۱٦ تا ۵۱۸ –

[۲] عبدالقادر بدایونی۔ جلد دوم صفحہ ۲۳٦ – [۳] دیھایت:۔ Dehaet

Empire of the Great Moghul .p 92,93,97) [۴] عبدالحمید لاھوری۔ بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴ –

پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، اور درخواست گذاروں سے بادشاہ خود مخاطب ہوتا ہے۔ اور اکثر ظلم رسیدہ درخواست گذاروں کی اسی موقع پر داد رسی کرتا ہے،، [۱]۔

عدالت کے مقررہ ایام اس انتظام کے علاوہ ہر شہنشاہ نے ایک نہ ایک دن محض عدالت کے لئے وقف کر دیا تھا جس میں اہم تر مقدمات کی سماعت ہوتی جن میں گواہوں کی شہادت یا جرم کی ضرورت ہوتی۔ اکبر نے اس کام کے لئے جمعرات، جہانگیر نے سہ شنبہ، شاہجہاں اور اورنگ زیب نے چہارشنبہ کو مقرر کیا تھا [۲]۔ اس دن کاروبار سلطنت بند کر دیا جاتا تھا۔ اور بادشاہ قاضی القضاۃ اور محکمۂ عدل کے دوسرے عہدہ داروں، اور ارباب فتویٰ کے ساتھ اجلاس کرتا۔ سوائے چند برگزیدۃ علما اور امرائے خاص کے جو ہمیشہ حاضر خدمت رہتے تھے عہداروں و امرائے سلطنت میں سے اور کوئی حاضر نہو سکتا تھا۔ محکمہ کے عہدہ دار درخواستگزاروں کو یکے بعد دیگرے پیش کرتے، بادشاہ غور سے انکی شکایت سنتا، نرم لہجے میں جرح کرتا اور اور علما کے فتاویٰ کے مطابق فیصلہ صادر کرتا [۳]۔

ایام سفر میں انتظامات جب بادشاہ کسی سرکاری دورے پر ہوتا یا تفریحا سیر کرنے لئے سفر کرتا تب بھی یہ انتظامات برقرار رہتے۔ تمام مغل شہنشاہوں میں جہانگیر اس انتظام عدل کا بہت پابند

---

[۱] برنیر۔ سفر نامہ صفحہ ۲۶۳ - [۲] جہانگیر نے ایک زنجیر طلائی گھنٹیوں کے ساتھ اسی مقصد کے لئے نصب کی تھی۔ کہ براہ راست مظلوموں کی شکایت سن سکے۔ ولیم فنچ نے (William Finch) جو سنہ ۱۶۱۰ میں آگرے گیا یہ زنجیر دیکھی تھی وہ اس دربار کے ایک طرف طلائی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں کہ اگر کوئی مظلوم عہداروں سے انصاف نہ پا سکے تو بادشاہ کی نشست کے وقت ان گھنٹیوں کو بجائے تاکہ وہ بادشاہ کے سامنے بلا یا جا سکے اور اسکی شکایت کی سماعت ہو۔ (پڑھو۔ Early Travels in India edited by William Foster P 184) برنیر لکھتا ہے کہ چہارشنبہ کے علاوہ ایک اور دن بھی بادشاہ خلوت میں معمول طبقے کے لوگوں سے جن کی عرضیاں ملاحظہ کرتا تھا۔ (صفحہ ۲۶۳) -

[۳] ابوالفضل اکبر نامہ۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۷ - Hawkins: Early Travels (Foster) P.116 Dehast: Empire of Great Moghul P.93 لاہوری - بادشاہ نامہ جلد اول۔ صفحہ ۱۵۰ برنیر۔ سفر نامہ۔ صفحہ ۲۶۳ تراونیر (Travenier) سفر نامہ صفحات ۷۸-۷۹ -

تھا اور اس نے اپنی توزک میں جن مقدمات کا ذکر کیا ہے، وہ اسکے والد اور اسکے بیٹے کے عہد کے مقدمات سے تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔

احمد آباد میں، جہاں کے لوگ کمزور اور رقیق القلب تھے اُس نے ایک مقام کو عدالت کے لئے انتخاب کیا جس میں دروازے یا چوبداروں یا نقیبوں یا کسی اور روکنے والی شے کا دخل نہ تھا۔ وہ خود لکھتا ہے "جس دن سے میں اس شہر میں داخل ہوا ہوں، باوجود یہاں کی سخت گرمی کے روز دو یا تین گھنٹے میں یہاں اجلاس کرتا ہوں، مظلوموں کی داد رسی کرتا ہوں، اور ظالموں کے لئے اُن کے ظلم کے سنگینی کے لحاظ سے سزائیں تجویز کرتا ہوں"۔ باوجود اپنی طبیعت کی ناسازی کے وہ برابر عدالت کرتا رہا۔ "روزآنہ میں باوجود انتہائی درد و تکلیف کے جھروکے میں جاتا ہوں، اور آرام و تن آسانی کو حرام سمجھتا ہوں"۔ شاہ جہاں نے بھی اپنے پنجاب، کشمیر کابل اور پشاور کے سفر میں اسی قسم کے انتظامات کئے تھے۔ برنیر نے اورنگ زیب کے زمانے میں بھی یہی حال دیکھا "بادشاہ ان عدالت کے اجلاسوں کو محاز جنگ پر بھی نہیں بھولتا تھا۔ یہ دستور قانون اور فرض سمجھا جاتا ہے، اور اُس کی پابندی میں شاذ و نادر ہی تعویق ہوتی ہے"۔

کس قسم کے مقدمات فیصل کئے جاتے تھے

دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ وہ عدالت ابتدائی اور عدالت اپیل دونوں کے مقدمات فیصل کرتا تھا۔ اس زمانے کی تاریخوں میں فوجداری مقدمات کا ذکر زیادہ نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلم قانون میں دیوانی مقدمات کی دیوانی مقدمہ بازی کی بہت کم گنجائش تھی جسکا پیشتر تذکرہ کیا گیا ہے۔ صرف پیچیدہ اور غیر معمولی مقدمات دربار شاہی تک پہنچتے ورنہ عام حالات میں اخراجات سفر ہی فریقین کو مرافعے سے روکتے تھے۔ برخلاف اس کے مغاوں کا ہمیشہ یہ دستور رہا کہ فوجداری جرائم کی سزا دہی کے اختیارات مقامی عہدہ داروں کو بہت کم دیئے گئے۔ اور اہم سزاؤں کے لئے بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ اس زمانے کے نوشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ دار، یہاں تک کہ خود دارالسلطنت کے عہدہ دار سنگین سزائیں دینے سے ہچکچاتے تھے اور اہم تر مقدمات کو بادشاہ کے پاس بھیج دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہر ہفتے سنگین سزاؤں کے مناظر یوروپین سیاحوں کو دربار میں نظر آتے تھے۔

مرافعے کے کوئی خاص آصول یا دستور نہیں تھے ، اور نہ عدالتوں میں اس قسم کا امتیاز تھا کہ درجہ بدرجہ مرافعے دربار تک پہنچیں ۔ لیکن عمل یہ تھا کہ دیوانی مقدمہ میں فریقین براہ راست بادشاہ کے پاس اپنا مقدمہ لے جاتے یا قاضی کے فیصلے کے خلاف مرافعہ کرنیکا حق حاصل تھا ۔ اسی طرح کسی فوجداری مقدمہ میں مجرم کو اس کا حق تھا کہ خود بادشاہ کے پاس مرافعہ کرے ۔ اور اسی طرح قاضی کو بھی اختیار تھا کہ چاھے مقدمہ کو خود سماعت کرے ، خواہ بادشاہ کے پاس بھجوادے خواہ کارروائی کسی درجے پر کیوں نہو ۔

جس قسم کے دیوانی مقدمات بادشاہ کے پاس آتے تھے ، یا منصفین اس کے پاس بھیجتے تھے ان کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوسکے گا ۔

جہانگیر کے جلوس کے پندرھویں سال لاہور کے قاضی اور میرعدل نے ایك مقدمہ دربار کو بھجوایا جس میں مسمی عبدالوھاب نے مسمی سید ولی کے بیٹوں سے اسی ھزار روپیے کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا اس کے باپ نے ان دونوں کے متوفی باپ کے پاس مذکورہ بالا رقم امانتاً جمع کردی تھی اور انکے پاس قاضی نوراللہ کی دستخطی دستاویز موجود تھی ۔ سید برادران نے اس معاھدے سے لاعلمی کا اظہار کیا عبدالوھاب نے قاضی کی عدالت میں اپنے دعوے کو ثابت کردیا اور قرآن پر قسم کھانیکو بھی تیار تھا ۔ جہانگیر نے دونوں منصفوں کو جنکی عدالت میں مقدمہ چل رھا تھا ۔ حسب قانون کارروائی کرنیکا حکم دیا لیکن مقدمہ کو معتمد خاں بخشی دربار نے سیدوں کی جانب سے دوبارہ دربار میں پیش کیا ، اور مقدمے کی پیچیدگی کی طرف توجہ دلا کر عرض کی کہ حقیقت مقدمہ تك پہنچنے میں زیادہ توجہ صرف کیجائے بادشاہ نے آصف خاں [۱] کو مقرر کیا کہ وہ مقدمے کی ھر تفصیل کو بغور جانچے اور اگر اس پر بھی مقدمہ صاف نہ ھو تو بادشاہ نے دونوں فریقوں پر جرح کرنیکا ارادہ ظاھر کیا ۔ اس پر مدعی ھراسان ھوگیا اور مقدمے سے دست کش ھونا چاھا اسکی اجازت نہیں دی گئی ۔ آصف خاں نے جو خود مقدمے کی سماعت کی ، مدعی نے جعلسازی کا اقبال کرلیا ، اور اس جعل کا الزام اپنے ایك ملازم پر رکھا ۔ اس سے

---

[۱] آصف خاں ، جہانگیر کی محبوب ملکہ نور جہاں کا بھائی ، اور نہایت بلند پایا امرا میں سے تھا ، اور ھمیشہ بادشاہ کے ھمرکاب رھتا تھا ۔

تحریری اقبال نامہ لکھا لیا گیا جو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ چونکہ مدعی جاگیردار بھی تھا اس لئے اسکی جاگیر ضبط کرلی گئی اور مدعا علیہم کو بعزت و احترام لاہور واپس جانیکی اجازت دیدی گئی۔ [۱]

شاہ جہان کے پاس ایک بہت دلچسپ مقدمہ آیا تھا، جس میں دو شخصوں میں ہو ایک لڑکے کے متعلق یہ امر متنازعہ فیہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک اسکو اپنا بیٹا کہتا تھا۔ مقامی قاضی اور میر عدل نے مقدمے کی سماعت کی، فیصلہ صادر ہوگیا، مگر جسکے خلاف فیصلہ ہوا تھا وہ یہی کہتا رہا کہ لڑکا میرا ہے مقدمہ بادشاہ کے پاس بھجوایا گیا۔ شاھجہان کو پیش کردہ شہادت کی بنا پر فیصلہ منسوخ کرنے کی کوئی وجہ نہ معلوم ہوئی۔ لیکن اس نے فریقین کو آزمانے کا یہ ذریعہ سوچا اور یہ حکم دیا کہ لڑکے دو ٹکڑے کردیئے جائیں اور فریقین میں تقسیم کردئے جائیں۔ جس شخص کے حق میں عدالت ماتحت سے فیصلہ ہوا تھا وہ تو خاموش رہا لیکن دوسرا شخص کانپنے لگا اور چلا اٹھا " میں اپنے حق سے دست بردار ہوتا ہوں، بچے کو مت کاٹو، اس طرح سچ ظاہر ہوگیا، بچہ اسکو دیدیا گیا اور پھر مزید تفتیش سے بادشاہ کے فیصلے کی تصدیق ہوگئی۔ [۲]

شاہ جہان کے زمانے کے ایک اور مقدمہ کا نوشتوں میں پتہ چلتا ہے جس میں فریقین ہندو تھے۔ مقدمہ بہت پچیدہ تھا، اور باھمی معاھدے اور تجارتی حصہ داری کے متعلق تھا۔ یہ مقدمہ براہ راست دربار کو بھیجا گیا تھا جہاں اسکا فیصلہ ہوگیا مگر کسی خاص قانونی دقت کے باعث مقامی عہدار تعمیل نہ کراسکے، اور بادشاہ کے پاس پھر مرافعہ کیا گیا۔ اسی دوران میں فریقین میں سے ایک فوت ہوگیا اور اسکے بیٹوں نے متوفی کے سارے مال و متاع پر قبضہ کرلیا جس پر مدعی کے بھی حقوق تھے۔ قبل اسکے کہ کوئی اور کارروائی کی جاسکتی وھاں کے میر عدل کا تبادلہ ہوگیا، اور نیا عہدہ‌دار جو وھاں آیا اسنے اپنے آپ کو اس قضیے کے چکانے کے قابل نہ پایا۔ اس نے اس تحریر کے ساتھ یہ مقدمہ بادشاہ کے پاس بھجوادیا کہ مقدمہ بہت پیچیدہ اور بہت پرانا ہے اور اس پرگنے کے بقالوں کی چالاکی کی وجہ سے جو نہ تو حقیقت حال کا اظہار کرتے ہیں، اور

---

[۱] جب یہ مقدمہ اور فریقین اس کے پاس پہنچے ہیں تو جہانگیر کشمیر میں تھا۔ (توزک جہانگیری صفحہ ۳۰۶) [۲] چندربھان برھمن۔ بابرچمن (مسودہ برٹش میوزیم فولیو ۱۹، ۲۰)۔

نہ اس قضیے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں ، میں اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتا ہوں ۔ اور اسی لئے فریقین کو دربار روانہ کرتا ہوں ۔

عدالت فوجداری کا نظم و نسق

جہاں تک عدالت فوجداری کا تعلق ہے ، وہ علحدگی جو حکومت اور عدالت کے عہدہ داروں میں دیوانی مقدمات کی حد تک تھی اس صورت میں نہ تھی ۔ صوبہ داروں کو سنگین سزائیں دینے کے اختیارات تھے گو عملاً ان پر بہت سی بندشیں تھیں ۔ صوبہ دار نہ صرف فوجداری مقدمات کی نگرانی کرتا تھا ۔ بلکہ خود فیصلے بھی کر سکتا تھا ۔ اس کا فرض تھا کہ ان مقدمات کی تفتیش کرے جو اسکے پاس پیش ہوں یا فوجدار (ضلعوں کے حاکم) اس کے پاس بھیجیں ۔ ان میں سے جو مقدمات شرع شریف کی حدود میں آتے ان کو وہ قاضی کے پاس بھیجدیتا ، جنکا تعلق مالگزاری سے ہوتا انکو دیوان کے پاس بھیجدیتا ، اور جو سیاسی جرائم ہوتے وہ خود اس کے اجلاس پر پیش ہوتے ۔ کوتوال شہر اس کا ماتحت ہوتا ۔ اس کو قید خانوں کے معائنے کا اختیار تھا ۔ اور وہ ان قیدیوں کو رہا بھی کر سکتا ، جسکو حراست میں رکھنے کی ضرورت نہ سمجھتا ۔

ایسے مقدمات میں اس کے اختیارات کا اندازہ اس مقدمے سے ہو سکتا ہے جس میں اورنگ زیب نے احمدآباد کے قاضی کو اس وجہ سے تنبیہ کی تھی کہ اس نے ان قیدیوں کو جو صوبہ دار کے حکم سے نقض امن کے جرم میں زیر حراست رکھے گئے تھے کیوں رہا کر دیا ۔

اسکا بھی پتہ چلتا ہے ۔ کہ صوبوں کے دیوان (یعنی محکمۂ مال و مالگزاری کے صدور) بھی صوبہ داروں کے ساتھ عدالتی تنظیم کے اس شعبے (فوجداری) پر نگرانی کیا کرتے تھے ۔ Pelsoert کا یہ قول کہ صوبہ دار ، دیوان اور بخشی روزانہ یا ہفتے میں چار بار منصفوں کے ساتھ

اجلاس کرتے ھیں جو صرف فوجداری مقدمات سے متعلق تھے [۱]

جس طرح دارالسلطنت میں بادشاہ فوجداری مقدمات کی نگرانی کرتا تھا اسی طرح صوبجات میں صوبہ دار اسکے نائب کی حیثیت سے نگرانی کرتا تھا۔ اور دیوان [۲] ۔ صوبہ دار اور قاضی دونوں کا ایك حدتك نگران تھا۔

قصاص آئین قصاص میں ھمیشہ اسلامی قانون کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ اور جرم کی نوعیت، اور مقدمے کے حالات پر اسکا دارو مدار ھوتا تھا۔ ابو منصرات نے اکبر کے زمانے کی سزاؤں کے مختلف طریقے بھی بیان کئے ھیں۔ "جو کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرتے تھے یا تو وہ ھاتھیوں سے کچلوا دئے جاتے تھے [۳] یا انکو سولی یا پھانسی دیدی جاتی تھی۔ زانی اور بدکاروں کا یا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا یا پھانسی دیدی جاتی تھی۔ پھر بھی اس امر کا لحاظ رکھنا چاھئے کہ قاضی یا وہ منصف جو فوجداری مقدمات کی سماعت کرتے تھے اس قسم کی سزائیں تجویز کرنے کے مجاز نہ تھے ان کی سزائیں شرع شریف پر مبنی ھوتی تھیں، یا وہ ایسے مقدمات کو بادشاہ کے پاس بھیجدیتے تھے۔

---

[۱] Pelsoert Jahangir's India P57 [۲] ایك سے زیادہ مواقع پر اورنگ زیب نے دیوانوں کو ایسے مقدمات کی نگرانی اور دربار میں مسلسل انکی رپورٹ بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ (مراۃ احمدی۔ صفحہ (۱۰۴) اور (۱۱۱))۔ [۳] ابو منصرات۔ شرح صفحہ ۸۰ تا ۸۲ ــ " ھاتھی مختلف کاموں کے لئے سدھائے جاتے ھیں اپنے مہاوتوں کی آواز کے پابند اور انکے مطیع ھوجاتے ھیں۔ گرہ کو باندہ یا کھول سکتے ھیں۔ کسی چیز کو ڈھکیل سکتے ھیں، اٹھا سکتے ھیں، اور پھر رکھ سکتے ھیں، اور الٹ سکتے ھیں۔ ناك پھیلا کر کھانس کے تنکوں یا سکوں کو اٹھا سکتے ھیں۔ یہاں تك کہ انکو ناچنا بھی سکھایا جاتا ھے مجرموں کو انکے پیروں کے نیچے کچلوا کر قتل کیا جاتا ھے۔ منصرات نے اکبر کے ایك دیوان شاہ منصور کو غداری کے جرم میں پھانسی پاتے دیکھا (صفحہ ۹۹) اور عہدہ دار تجارت کا زناکاری کی پاداش میں گلا گھونٹا گیا۔ بادشاہ کو بدکاری اور زناکاری سے اسقدر نفرت ھے کہ منت سماجت، اثرات، یا تاوان کی گراں قدر رقم کوئی چیز اسے معاف کردینے پر آمادہ نہ کرسکی (صفحہ ۲۱۰) ان دونوں مقدمات کا اکبر نامے میں بھی ذکر ھے۔

شاہ جہاں کے ہم عصر مورخ تغلب نے اس کو واضع طور پر لکھا ہے کہ اگر کوئی منصف شرعی حد سے متجاوز ہو کر سزا تجویز کرتا تو بادشاہ اسکو سزا دیتا ۔ (جلد اول صفحۂ ۲۰۲)

اعضا کی قطع و برید

ابوالفضل سزائے موت کا حامی نہیں ہے ، قطع اعضا کو وہ بمقابل ترجیح دیتا ہے جب کسی مجرم کے جرائم دوسروں کو ہراسان کردیں اور دھمکیاں ، سزائیں ، قید سب بیکار ثابت ہوں تب اسکو اسی عضو سے محروم کردینا چاہئے جس سے اس نے جرم کیا ہے ، یعنی آ سے اندھا کردینا چاہئے یا اسکے ہاتھ پیر قطع کردینا چاہئے ۔ لیکن بادشاہوں کو یہ نہیں چاہئے کہ کسی کی جان لیں ، اور محقق عارفیں جسم انسانی کو ایک عمارت کہتے ہیں جس کو خدا نے بنایا ہے ، اور اسی لئے وہ اسکو ضائع کرنیکی اجازت نہیں دیتے ۔

صوبہ داروں کو اسی اصول کی بنا پر حکمنامے بھیجے گئے تھے کہ وہ جب تک ہر پہلو سے غور و خوض نہ کرلیں سزائے موت نہ صادر کریں ۔

اکبر قطع اعضا کی سزا دینے میں بہت احتیاط کرتا تھا اور ابو منصرات نے اپنے قیام دربار کے زمانے میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں دیکھا ۔ [۱] جہانگیر نے اپنے سنہ جلوس میں ایک فرمان نافذ کیا جس میں قطع بینی و گوش کی سخت مخالفت کی اور خود بھی عہد کیا کہ کسی کو یہ سزا نہ دے گا ۔ اپنی تخت نشینی کے چھٹے سال اس نے ایک اور فرمان نافذ کیا جس میں صوبہ داروں کو تاکید کی کہ وہ سزاً مجرموں کو بینائی سے محروم کرنا ترک کردیں ۔

نظم و نسق کی اہم خصوصیات

قانونی نظم و نسق کی اہم خصوصیات جن پر ان صفحات میں روشنی ڈالی گئی ہے یہ ہیں ۔

(۱) محکمۂ عدالت میں اسلامی طریقۂ نظم و نسق اور ایک حد تک اسلامی قانون مغلوں نے بدستور جاری رکھا ۔ حالانکہ آنکے سیاسی نظم و نسق کے کسی اور شعبے میں یہ اثر

---

[۱] اس نے ان آلات کی فہرست گنائی ہے جو جلاد کے پاس ہوتے تھے ، لیکن کسی کو ان آلات سے سزا نہیں دی گئی ، انکا مقصد استعمال سے زیادہ محض خوف دلانا تھا (صفحہ ۲۱۱) ۔

نظر نہیں آتا۔ اس مبحث پر اس مضمون کے ابتدائی حصے میں کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

(۲) محکمۂ عدالت کے عہدہ داروں کی معمولی حیثیت جو مرکزی حکومت کے دوسرے با اثر محکموں کے عہدہ داروں کے مقابلے میں بہت متضاد حیثیت رکھتے۔ اسکی پہلی وجہ یہ ہے کہ حکومت کو عدالتی نظم و نسق کا بہت کم موقع تھا کیونکہ

(الف) ہندو اور مسلم قانون میں تبدیلی کی گنجایش مطلق نہ تھی۔

(ب) دیہاتوں میں ملک کے پرانے دستور کو برقرار رکھا گیا تھا جہاں پنچایت ہی دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کا تصفیہ کرتی۔

(ج) قصبوں اور شہروں کی معاشری تنظیم۔ ''برادری'' کا دستور۔

(د) ہر قصبے میں لوگوں کا معاشی اور معاشرتی وجوہات سے ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق ہوتا تھا کہ چونکہ ہر ایک دوسرے کے حرکات وسکنات، عادات واطوار، اور طرز زندگی سے واقف ہوتا تھا، اور ہر خبر بجلی کی سرعت سے پھیل جاتی تھی، اور ذرا سی بد نامی خاندان بھر کے ناموس کو خاک میں ملا دیتی تھی اس لئے جرائم کا بہت کم ارتکاب ہوتا تھا، اور بلا کسی دقت کے فوراً مکمل تفتیش ہوسکتی تھی [۱] ان حالات نے حکومت کے محکمۂ عدالت کی مصروفیت عمل بہت محدود کردیں۔ شہروں اور قصبوں میں جو سرکاری عدالتیں تھیں وہی معدودے چند دیوانی یا فوجداری مقدمات کی سماعت کے لئے کافی تھیں۔

---

[۱] چوری۔ قزاقی، ڈاکہ زنی جیسے جرائم کے کرنے والے لوگ پیشہ ور مجرم ہوتے تھے جو مختلف گروہوں کی شکل میں ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو حکومت امن کا دشمن سمجھتی تھی، اور کھلے میدان میں ان کا مقابلہ کر کے ان کا استقبال (استیصال) کیا جاتا تھا، اور یہ لوگ خود بھی مقابلے کے لئے تیار رہتے تھے، اور قانونی چارہ جوئی نہیں کرتے تھے اس صورت حال نے عدالت میں فوجداری مقدمات کی تعداد اور کم کردی تھی۔

(۳) حکومت کی اس پالیسی نے کہ مقدمہ بازی کی حوصلہ شکنی کی جائے نظام معاشرت کو برقرار رکھا جس نے اس پالسی میں امداد کی اور مختلف درجوں کی عدالتیں بھی قائم کی گئیں جو عام طور پر فریقین کو ہر ایک عدالت کے فیصلہ کے خلاف مرافعہ کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

دوسری وجہ قاضیوں کے ادنٰی مراتب ہیں۔ اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری جو ہر دور میں نمایاں رہی اور جسپر یوروپی سیاحوں نے بھی زور دیا ہے وہ قاضیوں کی ابتری ہے اور یہ زیادہ تر نتیجہ ہے اس طویل دور انتشار و انحطاط کا جو چودھویں صدی کے نصف آخر میں خاندان تغلق کے تحت سلطنت دہلی کی تباہی کے بعد شروع ہوا تھا۔ اکبر کو اپنی حکومت کے دیگر شعبہ جات میں بھی ان عناصر کا انسداد کرنا پڑا لیکن جو طریقہ اس نے مسلم معاشرہ کے اس خاص طبقہ کی اصلاح کے لئے اختیار کیا اس سے مطلوبہ مقصد حاصل نہو سکا۔ جب عدل گستری کو قاضیوں کے ہاتھوں میں علٰی حالہ برقرار رکھا گیا تھا تو چاہئے تھا کہ سررشتہ کی دیگر اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان کے مراتب بھی بلند کئے جاتے لیکن اس کے برعکس اکبر نے نہ صرف ان کے مراتب گھٹادئے بلکہ وقار میں بھی کمی کردی یہی حالت اکبر کے جانشینوں کے زمانہ میں بھی رہی یہاں تک کہ خود شاہجہاں کے دور میں جس نے عہدہ داران حکومت کی تنخواہوں میں قابل لحاظ اضافہ کیا تھا قاضی اسلم جیسے ممتاز شخص کو صرف دس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کی اراضی دیگئی تھی اور شاہجہاں آباد (دارالسلطنت) کے قاضی خوشحال کو صرف پانچ سو جات کا رتبہ حاصل تھا۔

اکبر نے نظماء صوبجات کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے اپنے مستقر پر قاضیوں کی نگرانی کریں حالانکہ موخرالذکر سرکاری حیثیت سے صدر کے ماتحت تھے۔ اورنگ زیب نے بھی اس خصوص میں انکی کوئی قدر افزائی نہیں کی۔ اس کا بھی حکم تھا کہ قاضی ہر چہار شنبہ کو ناظم صوبہ سے ملا کریں (روز چہارشنبہ نزد ناظم صوبہ حاضر شوند)۔

بہر حال قاضیوں کو نہ قوت حاصل تھی اور نہ مرتبہ۔ انکی تنخواہیں کم تھیں اور عہدہ داران عاملہ اور رعایاء کے نزدیک انکی حیثیت اور بھی گری ہوئی تھی اس لئے کچھ عجب نہیں کہ یہ

سررشتہ موزوں افراد کی خدمات سے جو ان حالات میں عہدہ قضاۃ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے محروم رہا ہو اور جو افراد کہ اسمیں داخل ہوئے ہوں وہ ان توقعات کو پورا نہ کر سکے ہوں جو ان سے وابستہ کی گئی تھیں اور رشوت ستانی پر اتر آئے ہوں تاہم اس سررشتہ پر اکبر کی نگرانی اور صوبہ جات میں قاضیوں کو نظماء کے ساتھ وابستہ کر دینے سے اچھے اثرات مترتب ہوئے اور بدعنوانیوں کا دائرہ بہت بڑی حد تک محدود ہو گیا جسکا ثبوت یہ ہے کہ ہر عہد میں چند افراد ایسے بھی ملتے ہیں جنکی صداقت راستبازی اور دیانت داری کا بادشاہ اور رعایاء دونوں احترام کرتے تھے ۔

(۳) مغلوں کے قانونی نظام کی نمایاں خصوصیت انکی سخت انصاف رسانی اور غیر جانبداری ہے ۔

انصاف کے آگے ہر شخص جھک جاتا ہے ۔ مساوات سے اکثر لوگ ڈرتے ہیں .... تاہم انصاف کو ارسطو بجا طور پر مساوات کی ایک صورت قرار دیتا ہے اس لحاظ سے انصاف میں غیر جانبداری کے دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) قانون کا اطلاق غیر جانبداری اور ٹھیک ٹھیک مساوات کے ساتھ ان تمام صورتوں پر کیا جائے جو اس کی تعریف میں آتی ہیں لیکن قانون کے نزدیک مساوات کے معنی اس سے بھی آگے جاتے ہیں ۔ اسمیں قانون کا غیر جانبدارانہ استعمال کافی نہیں (۲) خود قانون کو بلالحاظ مذہب و ملت مرتبہ و نسل سب کیلئے یکساں ہونا چاہئے ۔ پروفیسر ہاب ہوز کہتا ہے کہ " قانون کے آگے مساوات کے معنی جیسا کہ ایک موجودہ زمانہ کا آدمی سمجھتا ہے یہ ہیں کہ نہ صرف قتل کی سزاء خواہ وہ کچھ ہو غیر جانبدارانہ طور پر نافذ کی جائے بلکہ سزاء سب کیلئے ایک ہو خواہ قاتل اور مقتول کوئی ہوں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کے تحت ہر شخص کے جسم و جان کی یکساں حفاظت ہوگی اور جو اس کی خلاف ورزی کریگا اس پر سزاوں کا نفاذ یکساں ہوگا "[۱] ۔ مغل شہنشاہ عدل گستری میں اس معیار کے مطابق بجا طور پر غیر جانبدار کہلا سکتے ہیں ۔ علاوہ نظری حوالوں اور شہنشاہوں کے اقوال کے جو تواریخ میں جا بجا ملتے ہیں اور جن پر مورخین نے زور دیا ہے ایسی حقیقی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں جنمیں

---

[۱] معاشری عدل کے عناصر مصنفہ ہاب ہوز صفحہ ۱۰۳ ۔

انصاف بالکل غیر جانبداری کے ساتھ کیا گیا۔ اکبر کی حکومت کے چوبیسویں سال اس کا ایک چہیتا گورنر اور بچپن کا ساتھی مصیبت میں آ گیا تھا اسطرح سے کہ اس نے ایک عامل (عہدہ دار مالگزاری) کو غلاب کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے کسی خانگی ملازم کی تحویل میں دیدیا تھا اس ملازم کو عامل سے عداوت تھی اس نے عامل کا خاتمہ کردیا۔ اس پر گورنر نے حسب ضابطہ ملازم کے خلاف مقدمہ چلایا اور اس کو موت کی سزا دلائی لیکن معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ عامل کا باپ ایران سے آیا اور داد رسی چاہی۔ گورنر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ عامل کو گرفتار کر کے اس کے قتل کا باعث ہوا۔ جب اس کی خبر بادشاہ کو ہوئی تو اس نے عام عدالت میں مقدمہ کی تحقیقات کا حکم دیدیا اور گورنر کو بڑی مشکل سے متوفی کے والد کو شرعی خون بہا قبول کرنے پر آمادہ کر کے مقدمہ کا تصفیہ کرانا پڑا۔ اس موقع پر ابوالفضل نے بجا طور پر یہ ریمارک کیا تھا کہ "وہ ہز مجسٹی عدل و انصاف میں اجنب و اقرب، میں کوئی فرق نہیں کرتے اور نہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار اور معمولی سے معمولی بہکاری میں کسی امتیاز کو روا رکھتے ہیں" [۱]۔

اسیطرح سے اکبر نے گجرات کے ایک زبردست امیر چنگیز کو سپرد عدالت کرنے کا حکم دیکر سنسنی پھیلادی تھی جس پر متوفی کی ضعیف ماں نے قتل کا الزام لگایا تھا۔ چنگیز مجرم ثابت ہوا اور اس کو قتل کی سزا دیگئی [۲]۔

اسی طریقہ سے جب جہانگیر کو معلوم ہوا کہ سلطنت کے ایک قدیم گورنر سعید خان کے لوگ غرباء پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں تو اس نے لکھہ بھیجا کہ "میرا انصاف کسی کے ظلم کو برداشت نہیں کرسکتا اور میزان عدل میں بڑے اور چھوٹے کا لحاظ نہیں ہوتا"، گورنر کو یہ تحریری اقرار کرنا پڑا کہ اگر اسکے لوگ آئندہ ظلم و زیادتی کرینگے تو وہ اپنا سر نذر کردیگا۔

---

[۱] اکبر نامہ حصہ سوم ص ۲۶۶ سال بست و چہارم۔ انگریزی ترجمہ ص ۳۸۷۔

[۲] اکبر نامہ۔ سال اول۔ انگریزی ترجمہ ص ۶۴۔ ضعیف اور بے وسیلہ ماں کو یہ خواب و خیال بھی نہ تھا کہ ایسے صاحب اقتدار شخص کو اس کے بد اعمالیوں کی سزاء ملیگی اس انصاف کو دیکھکر وہ متحیر ہوتی تھی۔

دوسری نمایاں مثال خان عالم کے بھائی کا مقدمہ ہے جو سلطنت کا ایک بلند پایہ امیر تھا۔ اسپر ایک معمولی شخص کے قتل کا الزام تھا جسکا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔ بادشاہ نے اس پر مقدمہ چلایا اور موت کی سزاء دی؟ خود جہانگیر نے اس واقعہ کو اپنی یادداشتوں میں اس طرح نوٹ کیا ہے ،، اسکو (یعنی ہوشنگ ملزم کو) اپنے حضور میں طلب کر کے میں نے تحقیقات کی اور جب الزام ثابت ہوگیا تو اس کے قتل کا حکم دیا۔ خدا نکرے کہ ان معاملات میں امراء تو بجا شہزادوں کا بھی پاس و لحاظ کروں۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں خدا میری مدد کریگا۔ (حاشا کہ دریں اوور رعایت خاطر صاحبزادہ نہ کردہ تا بہ امراء وساتر بندھا چہ رسد) ص ۳۳۳ سال ششدھم۔

عدل و انصاف کیطرف شاہجہاں کی توجہ بھی جہانگیر کی طرح ضرب المثل ہے اور اس صفت کو اس کے دور کے ہر مورخ نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ ھالم کا یہ ریمارک کہ مسلم بادشاہوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاطیوں کے تدارک میں سخت انصاف سے کام لیتے ہیں ہندوستان کے مغل شہنشاہوں پر بھی صادق آتا ہے اور اس صفت کا بہت بڑا حصہ انمیں پایا جاتا تھا۔

قانونی مساوات اور غیر طرفدارانہ عدل و انصاف کے باوجود عدالتیں چند تھیں ضابطہ سادہ تھا اور انفصال مقدمات میں عجلت کیجاتی تھی [۱]۔ اس زمانہ میں نہ تو وکلاء تھے جو مقدمہ بازی پر زندگی بسر کرتے ہیں اور نہ ایک اعلیٰ پیمانہ پر منظم سررشتہ عدالت کے اخراجات کی پابجائی کیلئے گراں بار رسوم عدالت عائد کئے جاتے تھے۔ آیا یہ طریقہ اصولاً اچھا تھا یا برا یہ ایک ایسا بحث طلب سوال ہے جس کا جواب موجودہ زمانہ کے ماہرین بھی قطعیت کے ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن اسقدر یقینی ہے کہ یہ نظام اس دور کے لئے جس میں وہ رائج تھا اور اس معاشرہ کے لئے جس کے لئے وہ مدون کیا گیا تھا موزوں تھا۔

---

[۱] سیاحت برنیر ص ۲۳۶۔ ان کے ہاں چند وکلاء ہیں اور چند مقدمہ اور یہ چند بھی بہت عجلت کے ساتھ طے کردے جاتے ہیں اگرچہ وہ اس صورت حال کو حق جا ئداد شخصی کی عدم موجودگی کا باعث قرار دیتا ہے۔

اردو شاعری میں ایہام گوئی

از

مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر ادب آردو

صنائع بدائع ادب کا جز ہیں ، یہ ایک فطری چیز ہے ۔ کلام کا حسن بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ اکثر اوقات مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے ۔ لیکن جب صنعت کے ساتھ تصنع اور تکلف آجاتا ہے اور سوچ سوچ کر اور کوشش کر کے صنائع کو داخل کیا جاتا ہے تو کلام بے لطف اور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے ۔ شعر شعر نہیں رہتا ، ضلع جگت ہو جاتا ہے ۔ اردو شاعری پر فارسی کا بہت بڑا اثر ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ اس کی دست گرفتہ اور پروردہ ہے ۔ یہ صنائع ادبی جو ہمارے ہاں رائج ہیں سب وہیں سے آئے ہیں ۔ اردو شاعری میں تجنیس ، مراعاۃ النظیر اور ایہام وغیرہ کے بڑے دور دورے رہے ہیں ۔ خاص کر ایہام کا تو ایک خاص دور گزرا ہے ، جبکہ اس کا شوق خبط کی حد تک پہنچ گیا تھا اور ایہام ریختے کی ایک قسم قرار دے دی گئی تھی ۔ چنانچہ میر تقی میر نے جہاں ریختے کی قسمیں گنوائی ہیں وہاں ایہام کو بھی اس کی ایک قسم بتایا ہے ۔ فرماتے ہیں

"پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت ۔ اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است ، مگر بسیار بشستگی بستہ شود"۔

اس کے بعد وہ ایہام کی تعریف کرتے ہیں ۔

"معنی ایہام اینست ، کہ لفظے کہ بر او بنائے بیت بود آں دو معنی داشتہ باشد یکے قریب و یکے بعید ؛ و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او۔"

ایہام گوئی کا سارا دارومدار ذومعنی لفظ پر ھے۔ اور یہ کھیل اسی سے کھیلا جاتا ھے فارسی میں تکلفات کی کچھ کمی نہیں خصوصاً متاخرین نے اس معاملے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لیکن باوجود اس کے فارسی شعرا نے غزل میں صنائع کے استعمال میں احتیاط سے کام لیا ھے اور اس کا استعمال اس حد تک نہیں کیا کہ وہ گران گذرے۔ اس لئے یہ خیال قرین صحت معلوم ھوتا ھے کہ اردو ایہام گوئی پر زیادہ تر ھندی شاعری کا اثر ھوا ھے۔ اور ھندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی ھے۔

سنسکرت میں اس صنعت کا نام شلیش ھے۔ شلیش ایسے لفظ کو کہتے ھیں جس کے کئی معنی ھوں۔ اس کی کئی قسمیں ھیں۔ لیکن خاص قسمیں دو ھیں، سبھنگ اور ابھنگ۔ سبھنگ وہ حالت ھے جبکہ لفظ سالم رھتا ھے اور ابھنگ وہ ھے جبکہ لفظ کے ٹکڑے کر کے یہ صنعت پیدا کی جاتی ھے۔

ھندی میں اس صنعت کو بہت فروغ ھوا اور اس کی لے یہاں تک بڑھی کہ بعض جدت پسند صاحبوں نے بہاری کے کلام سے طبی نسخے نکالے ھیں۔ ھندی میں اکثر شاعروں نے اس صنعت کو استعمال کیا ھے۔ مثلاً رحیم کہتا ھے

جیوں رحیم گتی دیپ کی کُل کپوت گتی سوے   بارے اجیارو لگے بڑھے اندھیرو ھوے

جیسے چراغ کی حالت ھے ایسے ھی خاندان میں کپوت کی حالت ھے جلانے پر اجالا ھوتا ھے اور بڑھانے پر اندھیرا۔

یہاں بارا کا لفظ ذومعنی ھے ایک معنے بچپن کے اور دوسرے جلانے کے۔ اسی طرح بڑھنا کے بھی دو معنے ھیں یعنے بچے کا بڑھنا اور چراغ کا بڑھنا یعنے بجھنا۔ آخری مصرعے کے دوسرے معنے یہ ھوے کہ بچپن میں بچہ اجالا ھوتا ھے اور جوں جوں بڑھتا جاتا ھے تو وہ اندھیرا ھوجاتا ھے بہاری لعل کا ایک شعر ھے

چر جیو جوری جرے کیوں نہ سنیہ گنبھیر   کو گھٹی یہ ورش بھانو جاوے ھلدھر کے ویر

(رادھا کرشن) کی جوڑی دیر تک قائم رھے۔ دونوں میں گہری محبت کیوں نہ ھو، دونوں برابر کی جوڑی ھیں۔ ایک ورش بھانو کی بیٹی ھے اور دوسرا بلرام کا بھائی ھے۔

یہاں ورش ہانوجا کے لفظ کو توڑ کر صنعت ایہام پیدا کی گئی ہے یعنی ورشبھ بمعنے بیل اور انوجا کے معنے چھوٹی بہن ۔ اور اسی طرح ھلدھر کے دو معنے لئے گئے ھیں ایک بلرام کا نام ھے اور دوسرا ھل دھر بمعنے بیل ۔ دوسرا مطلب یہ ھوا کہ ایک تو بیل اور دوسری بیل کی چھوٹی بہن ۔

رس خان کہتا ھے

گورس کے مس جورس چاھت سورس کانہہ جیو نیکو نہ پئی ھو

یعنے گئو کے رس کے بہانے سے جو رس چاھتے ھو وہ کشن جی تم کو نہیں ملے گا ۔ دوسرے معنے گورس کے دودہ کے ھیں ۔

اورنگ زیب ، بہادر شاہ اور ان کے بعد محمد شاہ کے عہد میں اگرچہ ھندی کے اعلیٰ درجے کے استاد بہت کم ھوے ھیں لیکن تعداد میں ھندی شاعر بکثرت پاے جاتے ھیں ۔ اور کمتر درجہ کے شعرا کا یہ قاعدہ ھے کہ وہ بجاے معانی کے الفاظ سے زیادہ کام لیتے ھیں اور طرح طرح کی صنعتوں سے اپنی دکان سجاتے ھیں ۔ ایسے اردو شعرا کے لئے جن کی رسائی بلند معانی تک نہ تھی اور جن کا تخیل بام رفعت تک پہنچنے سے عاجز تھا ، یہ چیز بہت للچانے والی تھی عہد محمد شاھی جس میں اردو شاعری کا چرچا عام ھوگیا تھا ، اس بارے میں خاص امتیاز رکھتا ھے ۔ اس دور میں چھوٹے بڑے سب شاعر ایہام گوی میں مبتلا پاے جاتے ھیں ۔ محمد شاھی دربار کے تکلفات نے اس قسم کی شاعری کو اور فروغ دیا ۔ اس گروہ کا سب سے بڑا معلم نجم الدین شاہ مبارک آبرو ھے ۔

آبرو گوالیار کے رھنے والے اور سراج الدین علی خان آرزو کے شاگرد تھے ۔ ابتدای جوانی سے شاھجہان آباد میں آگئے تھے ۔ انہیں ایہام گوئی کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ گویا بغیر اس کے شعر سوجھتا ھی نہ تھا ۔ طبیعت شوخ پائی تھی اس لئے اور کھل کھیلے ۔ مضمون بگڑتے بگڑجاے ، متانت رھے یا نہ رھے لیکن ایہام ھاتھ سے نہ جاے ۔ شعر گوئی ایہام کے مترادف ھوگئی تھی ۔ تمام ایہام گو شعرا کی یہی روش ھے ۔ لفظ کی خاطر یہ بزرگ سوقیانہ پن اور فحش گوئی سے بھی نہیں چوکتے ۔ آبرو کا دیوان اس صنعت سے مالا مال ھے ۔ چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ھیں ۔

آج عاشق کی بے نصیبی ھے کہ تم آس پاس سیں چلے ھو بھاگ

بھاگ کے دوسرے معنے نصیب کے بھی ھیں -

دعویٰ ھے جس کوں شعر کی قوت کا آبرو — مضموں کا بوجھ آ کے اٹھاوے ھمن کے نال

نال کے ایک معنے تو ساتھ کے اور دوسرے معنے ھیں پتھر یا لکڑی کا کندا جسے پہلوان زور آزمائی کے لئے اٹھاتے ھیں -

اس کی کنجی زبان شیریں ھے — دل مرا قفل ھے بتاشے کا

"بتاشے کا قفل" کے معنے چھوٹے قفل کے ھیں -

تشنہ ھوں دلربا کی صورت کا کس کو دیکھوں — حیران ھوں ندیکھا کوئی آبرو پیاسا

پیاسا یعنے پیا جیسا اور دوسرے معنے تشنہ کے ھیں -

سن کے چرچا غیر نیں جا کر چھچھوندر چھوڑ دی — گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ھوا

چھچھوندر ایک آتش بازی ھے اور چھچھوندر چھوڑنا یعنے شگوفہ چھوڑنا۔ ٹوٹا کے معنے ایک تو نقصان کے ھیں دوسرے ایک آتشبازی کے ھیں -

جان ھر جائی نہو جا یا نکر تو جا بجا — مان جا بیجا نجا جاتا ھی ھے تو جا بجا

جا بجا یعنے ھر جگہ اور جا بجا یعنے معقول جگہ جا -

آبرو کے ھم عصر اور شاگرد بھی ایہام گوئی میں شہرت رکھتے ھیں۔ ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ھے -

محمد شاکر ناجی دھلی کے رھنے والے اور ایہام گوئی کے دلدادہ تھے۔ آبرو کے ھم عصر تھے -

تری نگاہ کی کثرت سے اے کمان ابرو — ھمارے سینہ پہ تودہ ھوا ھے تیروں کا

اس شعر میں تودہ ایک تو عام معنوں میں ھے یعنے ڈھیر اور دوسرے معنے اس مٹی کے ڈھیر یا ٹیلے یا کچی دیوار کے ھیں جس پر تیر اندازی کی مشق کی جاتی ھے -

موجی ھے اپنے دل کا مچھی ندے کہے سے — اور اب مخالفوں نے وہ بات ھی ڈبوئی

مچھی کے ایک معنے تو مچھلی کے ھیں اور دوسرے معنے بوسہ کے ھیں -

ترے غنچہ دھن کی دیکھ لالی   امیٹھے تھا کلی کے گوش مالی

اس شعر میں "گوش مالی" سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مالی کلی کے گوش (کان) امیٹھتا تھا۔ دوسرے گوش اور مالی کے لفظوں کو ملا کر "گوشمالی" بنایا گیا ہے جو مضمون سے مناسبت رکھتا ہے۔

شرف الدین مضمون بھی اسی زمانے کے شخص ہیں۔ اگرچہ آگرہ کے قریب کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے، لیکن ابتدائے جوانی سے دھلی میں آگئے تھے اور وھیں انتقال کیا۔

ایک تو تھا ھی وہ مہرو خود پسند   ہو گیا دیکھ آرسی کے تئیں دو چند

یہاں ایہام چند کے لفظ سے پیدا کیا گیا ہے جس کے معنے چاند کے بھی ہیں۔

نہیں ہیں ہونٹھ تیرے پان سے سرخ   ہوا ہے خون میرا آ کے لبریز

اس میں لبریز کے جز لب سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔

میاں آبرو کے ایک اور معاصر مصطفٰی خاں یکرنگ ہیں، وہ بھی اس صنعت سے خوب کام لیتے ہیں۔

لب شیریں سے تلخ کاموں کو   بولنا تلخ کام ہے تیرا

اس شعر میں ایہام کام کے لفظ میں ہے۔

اب تو تمہیں نباھے ھی ھم سے سجن پڑے   ھم سب طرف سے ھار تمہارے گلے پڑے

ایک تو ھار کے معنے ھار کر ھیں اور دوسرے گلے کا ھار۔

امروھے کے ایک صاحب سعادت علی تھے وہ بھی اس رنگ میں کہتے ہیں۔

اھل زر کے سیم تن ہوتے ہیں رام   صید ہو ہیں جس جگہ دیکھے ہیں دام

پپیہے کی طرح دارو کے شیشے   زبان حال سے کہتے ہیں پی پی

میر سجاد اکبر آباد کے تھے اور بہت خوش گو شاعر ہیں، لیکن جب کبھی موقع ملتا ہے تو ایہام گوئی سے نہیں چوکتے۔

ساقی بغیر جام کے جیو کا بچاؤ نہیں — جوں نیل مست آوے ہے ابر سیہ پلا

پلا ایک تو پینے سے ہے اور دوسرا پالنا ہے۔

مقبول اس جہان کا ہرگز غنی نہ دیکھا — راجا وہی ہے جو کوئی یہاں سے گیا ہے رانا

رانا کے ایک معنے رانده کے ہیں اور دوسرے معنے راجا کے ہیں۔

جان و دل سے قبول ہے جانا — ہر گلی میں تیری مجھے آنا

جانا یعنے اے جان۔

قاتل کی تیغ آگے جاتے ہیں ہم ندھڑک کے — ہرگز ہمارے دل میں سر کا نہیں ہے دھڑکا

ہر سادہ رو مخطط ہونے کی دھن رکھے ہے — لیکن کوئی نکالے تیرا سا خط تو لکھ دیں

لکھ دیں کے ایک معنے تو عام ہیں دوسرے معنے یہ ہیں کہ ہم شرط کرتے ہیں۔

آبرو کے ایک ہم عصر میاں احسن اللہ ہیں انہیں بھی ایہام کا لپکا ہے

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ — کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

حاتم خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ مشہور شاعر ہیں۔ اکثر سخنوروں کی صحبت پائی تھی آبرو اور ناجی کے ہم عصر اور ہم کلام تھے۔ شاگرد بھی بہت سے تھے منجملہ ان کے مرزا رفیع سودا ہیں۔ ابتدا میں انہیں بھی ایہام کا بہت شوق تھا۔

مثال بحر موجیں مارتا ہے — لیا ہے جس نے اس جگ سے کنارا

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی — تا کہ سب مل کہیں وصال ہوا

نظر آوے تھا بکری سا کیا پر ذبح شیروں کو — نجانا میں کہ یہ قصاب کا رکھتا ہے دل گردا

دل گردا یعنے ہمت یا حوصلہ

خاصے سجن کا ملنا نہ سکہ ہے عاشقاں کا — گاڑھے رقیب سارے روتے ہیں ہاتھ مل مل

مضمون کے ایک شاگرد محمد عارف تھے، وہ بھی ایہام گوئی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

دختر رز کو کہہ کہ آس سے ملے ورنہ عارف افیم کھاتا ہے

"افیم کھاتا ہے" یعنے اگر دختر رز (شراب) نہ ملی تو وہ افیم کھانی شروع کر دے گا۔ دوسرے معنے یہ ہے کہ اگر دختر رز نہ ملی تو افیم کھا کر جان دیدے گا۔

کمترین اگرچہ قوم کے پٹھان تھے مگر ایہام گوئی کی صنعت انہیں بھی مرغوب تھی۔

تیری انگیا میں کیا بلا کچھ ہے جن نے دیکھا وہ ہاتھ ملتا ہے

ہاتھ ملنے سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔

تم شاہ پسند ہو ہم کمترین تمہارے کے بیر ہم کو دو کے نازک بدن پیارے

شاہ پسند اور نازک بدن بیروں کی قسمیں ہیں۔ بیر کے دوسرے معنی باری کے ہیں۔

یہ مقصدی نہیں ملتے اگر بھانڈوں سے ذاتوں میں تو کیوں پیسے کماتے ہیں نقل کر کر براتوں میں

نقل اور برات کے الفاظ میں ایہام ہے۔ برات کے ایک معنی تو معروف ہیں اور دوسرے معنے حساب کے کاغذ وغیرہ کے ہیں۔

مصطفیٰ خاں یکرنگ کے بھائی دلاور خاں ہمرنگ (نیرنگ) بھی اسی رنگ کے شعر کہتے تھے

سدا بیدار رہ غفلت سے ہو ترش مثل مشہور ہے سویا سو چوکا

سویا اور چوکا دونوں ساگ ہیں۔ چوکا میں ایہام ہے، یہ ترش ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں شاہ مزمل بھی ایک ایہام گو شاعر ہوئے ہیں۔

من ہرن میرا مزمل ہو گیا دشمنوں کے من کے چیتے ہو گئے

صلاح الدین عرف مکھن و پاکباز کا رجحان طبعیت بھی اس طرف پایا جاتا ہے۔

بہیں ندیاں مرے آنسو سے جو میں ہجر میں رویا کہے ہے ساری بستی ہائے مکھن نے ہمیں کھویا

اس میں کھویا اور مکھن کی مناسبت سے ایہام پیدا کیا ہے۔

مضمون کے ایک شاگرد فضل علی دانا بھی صنعت ایہام کے شائق معلوم ہوتے ہیں۔

دل میں ہر ایک کے سودا ہے خریداری کا یوسف مصر مگر تو ہی ہے اے یار عزیز

ان کا ایک دوسرا شعر ہے۔

نہ چاٹے خون کو جس روز میرے اُس کے فاقا ھے   رگِ گردن سے میری اُس کے خنجر کو علاقا ھے

یہاں علاقے کے لفظ میں ایہام ھے۔ علاقہ اُس گھنڈی دار ڈوری کو کہتے ھیں جو تلوار یا خنجر کی موٹھ میں لگی رھتی ھے۔

شاہ ولی اللہ اشتیاق کا شمار بھی انہیں شاعروں میں ھے۔

دوبالا ھو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ھے   پیالا اور بھی پی لے سجن یہ دور چلتا ھے

یہاں "چلتا ھے" ذو معنی ھے۔ یعنے جاری ھے اور رخصت ھوتا ھے۔

اسی عہد میں اس طرز کے اور بھی کئی شاعر گزرے ھیں۔ مثلاً یکرو شاگرد آرزو، محمد اسمعیل بیتاب شاگرد یکرنگ، شہاب الدین ثاقب، محمد مراد، عاجز وغیرہ یہ سب لوگ اس صنعت پر فریفتہ تھے۔

پوشاک، خوراک، تعمیر غرض زندگی کے ھر شعبے کے متعلق ھر عہد میں کوئی نہ کوئی جدت ایسی نکل آتی ھے جس کا عام رواج ھو جاتا ھے۔ کوئی ذھین یا صاحب اثر شخص اس کی ابتدا کرتا ھے اور بیسوں اس کے مقلد اور پیرو پیدا ھو جاتے ھیں۔ یہی چیز رفتہ رفتہ فیشن ھو جاتی ھے اور اس عہد کا ذوق کہلانے لگتی ھے۔ ادبیات میں بھی یہی ھوتا ھے۔ چنانچہ عہد محمد شاھی میں ایہام گوئی ایک فیشن ھو گئی تھی۔ لوگوں کو اس کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ ایہامی شعروں کی سب سے بڑھ کر داد ملتی تھی۔ اس لئے چھوٹے بڑے شاعر سب اُسی طرف ڈھل گئے۔

ایہام کے استعمال میں ان لوگوں نے طرح طرح کی نزاکتیں پیدا کی ھیں۔ مثلاً

مشابہت صوت۔ یعنی دو لفظ ھیں تو مختلف لیکن بولنے میں اُن کی آواز یکساں ھے، اس سے بھی ایہام پیدا کیا ھے۔ جیسے

یکرنگ پاس اور سجن کیا ھے کچھ بساط   رکھتا ھے دو نین جو کہو تو نظر کرے

اس میں نظر اور نذر کی مشابہت صوت سے ایہام پیدا ھوتا ھے۔

باد صبا سے زلف معطر کی ھم تلک   مدت ھوئی کہ پہنچی نہیں ھے خبر اتر

حسرت شاگرد مظہر کا شعر ھے۔

کب کرے میرے عشق کو آرے   اس کو تو ھم سے عار آتا ھے

آرے یعنی بالے ۔

کبھی دو مختلف لفظوں کو ملا کر ایہام پیدا کیا جاتا ھے ۔ جیسے

(حسرت)
ھوئی ھے کل سے گم کیلی مرے طالع کہاں کیونکر [۱] نجومی فتحیابی اس سیاہ کو کب کو کو کب ھے

اس شعر میں کو کہو کا بگاڑ ھے اور کب سے مل کر کوکب ھو گیا ۔

دل رشک کی جلن سیں پھپو لا ھوا پیا کیوں غیر سیں بلا کے کہا تم نیں آب لا (آبرو)

،، آب لا ،، یعنی آبلہ ۔

تیرے غنچہ دھن کی دیکھ لالی اینٹھے تھا کلی کے گوش مالی

گوش اور مالی دو جدا جدا لفظ ھیں ، ان کے ملنے سے گوشمالی ھوا جس سے ایہام نکلتا ھے ۔

بعض اوقات لفظ کے ایک جز یا کسی قدر تغیر و تبدل سے ایہام کی صفت پیدا کی جاتی ھے ۔ جیسے

وہ پختہ کار کب پڑھتا ھے نامہ نہیں پکا کہ اوں میں ھاتھ خامہ

خامہ کے جز خام سے ایہام پیدا کیا گیا ھے ۔

لب سیں ھر مصرا ھوا ھے اوسکا مصری کی ڈلی آبرو نیں شعر میں جب سیں سرا ھے تیرے ھونٹ

مصرع کو مصری کی مناسبت سے مصرا کر دیا ھے ۔

نہیں ھیں ھونٹھ ترے پان سے سرخ ھوا ھے خون ھمارا آ کے لبریز (مضمون)

لبریز کے جز اول لب سے ایہام پیدا کیا گیا ھے ۔

یہ سچ ھے کہ رواج میں برے بھلے کی تمیز نہیں ھوتی اور ذوق کے معاملے میں چون چرا کی گنجائش نہیں ، لیکن جس چیز کی بنا حقیقت پر نہیں اُسے پائیداری نصیب نہیں ھوتی ۔ ایہام کا دور دورہ کچھ دنوں تو خوب رہا ، مگر آخر کو مردود ٹھیرا اور نئے سخنور اسے غیر فطرتی

---

[۱] بمعنے کنجی

سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہونے لگے۔ چنانچہ قائم اپنی بیزاری کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ھے ,, این ستم کہ شاعران ابتدائی زمانۂ محمد شاہ باعتقاد خود تلاش الفاظ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند تا بمعنی چہ رسد ، غرض نا گفتہ بہ ،،۔ سب سے پہلے اس طلسم کو مرزا جان جاناں مظہر نے توڑا۔ چنانچہ مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ھیں —

,, در دور ایہام گویان اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست ،،۔ اس کے بعد لکھتے ھیں ,, فی الحقیقت نقاش اول ریختہ باین و تیرہ باعتقاد فقیر مرزاست ، بعدہ تتبعش بہ دیگران رسیدہ ،، [۱] —

قدرت اللہ شوق اپنے تذکرے میں لکھتے ھیں —

,, دیگر بیند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوے معلی شاھجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ مروج ساختہ ، زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز حجاب اکبر کاشف کنوز طریقۂ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر مردے است فرشتہ صفت عاوی نسب .....،، [۲] —

حکیم ابو القاسم میر قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں اس بارے میں یوں رقم پرداز ھیں —

,,حق این است کہ ایجاد طرز و انداز وے نمودہ و اندراس رویۂ ایہام دوئی ساز وے فرمودہ،، [۳] -

مرزا صاحب کی نفاست طبع اور سلامت ذوق کے سب قائل ھیں۔ وہ نہایت خوش تقریر ، نازک مزاج اور صاحب کمال بزرگ تھے ۔ فقر و درویشی میں جو اعلیٰ مرتبہ انہیں حاصل ھے ، شاعری اور خوش گوئی میں ان کا درجہ اس سے کچھ کم نہیں ۔ آن کے گوناگوں کمالات کی وجہ سے کسب فیض کے لئے دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ھوتے تھے ۔ اور شاعری پر ان بڑا احسان ھے ۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایہام کی دلدل سے نکال کر خوش گوار فضا میں پہنچا دیا۔

---

[۱] تذکرہ ھندی صفحہ ۳۰۲ [۲] تذکرہ .... قلمی [۳] مجموعۂ نغز جلد دوم صفحہ ۹۸ ؛ —

اُن کے کلام اور اُن کے ذوق کے اثر سے دلی کی شاعری کا رنگ بالکل بدل گیا ـ

یہی وجہ تھی کہ اُس وقت کے شعرا ایہام گوئی ترک کر کے سیدھے رستے پر پڑ گئے ـ علاوہ اُن کے شاگردوں (مثلاً یقیں ، حزیں ، فقیہ دردمند ، حسرت وغیرہ) کے دوسروں نے بھی اُن کا اتباع کیا ۔ یہاں تک کہ کہنہ سال اور کہنہ مشق شاعر حاتم بھی پرانی روش سے دست بردار ہو گیا اور اس نے اپنے کلام سے اس قسم کے اشعار خارج کر کے ایک مختصر دیوان ،، دیوان زادہ ،، کے نام سے مرتب کیا ۔ اس کے بعد سے ہمارے شعرا ایہام گوئی سے بیزاری ظاہر کرنے لگے ۔ حاتم کہتا ہے ـ

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

سودا کا شعر بھی اس کی تصدیق کرتا ہے ـ

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجکو دورنگی منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

لیکن اس کا چسکا ایسا پڑ گیا تھا کہ خود مرزا صاحب علیہ الرحمہ کے شاگرد جو نئی طرز کے بانی ہوئے ہیں کبھی کبھی پرانے رنگ میں شعر کہہ جاتے تھے ـ مثلاً

مجھے پالا مشیت کے جو پالے میں پڑا جب کا لرزتا تب سیں ہوں سردی سیں رہتا ہوں رضائی میں (یقیں)

رضائی کا لفظ اس شعر میں مشیت کی رعایت سے آیا ہے یعنے رضا کی مناسبت کے لئے ـ

سونے سے سونا ہوے دل سونا نہ منگ حق سیں یقیں جس کو خدا کا شوق ہے سونا کرے سونا طلب

،، سونا کرے ،، یعنے وہ نہ کرے ـ

کب کرے میرے عشق کو آرے اُس کو تو ہم سے عار آتا ہے (حسرت)

سن پت نرھگی تیری ٹھٹھہ تیں مجھ سیں مت کر صورت تری نہ دیکھوں تجھ بارہا کہا ہوں (حسرت)

اس میں حسرت نے ایہام کی کئی صورتیں استعمال کی ہیں ـ

سن پت ایک مقام کا نام ہے اور پت کے معنے عزت کے بھی ہیں ـ اسی طرح ٹھٹھہ مقام

کا نام بھی ہے اور دل لگی کے معنے میں بھی آتا ہے ۔ صورت میں سورت (شہر) سے مشابہت آواز پائی جاتی ہے ۔ بارہا ایک مقام کا بھی نام ہے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اس کا شوق بھی پھر بھی کچھ کچھ باقی تھا ۔ میر کا یہ شعر خلاف واقعہ نہیں بلکہ اس کی کچھ اصلیت پائی جاتی ہے ۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے ۔ کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

خیر یقین اور حسرت نے تو اسی دور میں پرورش پائی تھی جس میں ایہام گوئی کا جنون تھا ، اگر انہوں نے چند شعر اس رنگ میں کہ دیے تو کچھ مضائقہ نہیں ، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سودا اور میر حسن جیسے باکمال اور حقیقی شاعر بھی اس سے نہیں بچے ۔ میر حسن فرماتے ہیں ۔

مجھ جل جاؤں گا میں رشک سے مت دیکھ آئینہ ۔ دکھاتے غیر کو منہ آرسی تجھ کو بھی آئی نا

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اس گلی کے تنکے ۔ رہتے ہیں ہم دوانے روز ازل سے تنکے
اک دم میں بھوت ہیں وہ اک دم میں ہیں فرشتہ ۔ ہم آشنا ہوئے ہیں دو چار دن سے جن کے

کیا ڈھنگ ہوویں اب کے دیکھیں تیرے حسن کے ۔ صحرا کو پھر یہ نکلا مجنوں کے حال بن کے

سودا کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں ۔ فیروزہ ہووے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا
دبکے ہے اس قدر تو مجھے دیکھ کر رقیب ۔ چوہے کی سانت جائے ہے نظروں سے یہ بلا
غم سے خزاں کے خون جگر چھٹ اب اے نسیم ۔ غنچے گلوں کے کچھ نہیں کھاتے انہیں کھلا

اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے ۔ جو کچھ تو چاہے یک شب مجھ پاس آ کے سولے
انصاف کچھ بھی یا رو ہے عشق کے نگر میں ۔ دل غم سے آب ہووے اور چشم موتی رولے
دھقان پسر وہ ہم سے یوں صلح کب کرے ہے ۔ بوٹوں کے کھیت اوپر جب تک نہ جنگ ہولے

لیکن سودا کے ذوق کی داد دینی پڑتی ہے کہ کہنے کو تو وہ یہ دو غزلیں کہہ گئے لیکن دونوں کے مقطعوں میں اس کلفت کو دور کردیا جو ان غزلوں کے پڑھنے سے ہوتی تھی ۔

ھو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا   تو اس زمیں میں نادان طور اپنا کیوں نہ بولے

اور اس کے بعد ھی وہ دوسری غزل اس بحر اور قافیے میں اپنے رنگ میں لکھتا ھے تاکہ الزام رفع ھو جائے۔ دوسری غزل کا مقطع یہ ھے۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ھے یہ   مضمون و آبرو کا ھے سودا یہ سلسلا

سودا نے اسطرح اپنی بریت کرلی۔ میر صاحب بھی کبھی کبھی اس صنعت کے پھند سے میں آپھنستے ھیں۔ لیکن ان بزرگوں کا کبھی کبھی دو چار اس قسم کے شعر کہہ دینا یا تو محض اتفاق ھے یا بغرض تفنن، اس لیے ان کو اس سے بری سمجھنا چاھئے۔ لیکن لکھنؤ کی شاعری میں ایك دور آتا ھے جس میں شعرا نے صنائع کا استعمال اس افراط اور بے اعتدالی سے کیا ھے کہ دور محمد شاھی بھول جاتا ھے۔ لیکن یہ تاریخ ادب اردو کا دوسرا باب ھے جس کا ذکر ھم پھر کبھی کریں گے۔

صنعت ایہام جب التزام کے ساتھہ برتی جاتی ھے تو شعر شعر نہیں رھتا تك بندی ھو جاتا ھے۔ جس دور کا ھم نے ذکر کیا ھے وہ اردو شاعری پر ایك بد نما دھبا ھے۔ لیکن انصاف شرط ھے، اس ضمن میں ایك فائدہ بھی ھوا ھے۔ ایہام گو شعرا نے اس دھن میں الفاظ کی جستجو میں ساری زبان کو چھان مارا اور اپنی زبان اور بول چال کے وہ وہ الفاظ تلاش کرکے نکالے جن سے ھمارا ادب کبھی روشناس نہیں ھوا تھا۔ ان بزرگوں کا کلام محقق زبان اور لغت نویس کے لیے ایك بے بہا ذخیرہ ھے۔ گو یہ فائدہ ضمنی ھے لیکن ایك لحاظ سے بہت بڑا فائدہ ھے اور ھمیں ان بزرگوں کے احسان کا اعتراف کرنا پڑتا ھے۔

The following from Radhakrishna's *Philosophy of Rabindranatha* will, we are sure, help the reader to understand Veda rightly. ' Nature is not antagonistic to spirit—it is there for the purpose of being used by the spirit. It is fuel for the flame of the spirit. The Taittiriya Upanishad calls matter *annam* or food, a means for the manifestation of spirit-energy. Only through Nature can spirit realise itself. If we adopt the right attitude to Nature we feel the pulse of spirit throbbing through it. A true seer sees in natural facts spiritual significance. The poetic temper hears the voice of spirit crying a loud in nature...Water does not merely cleanse his limbs but it purifies his heart: for it touches his soul. The earth does not merely hold his body but it gladdens his mind: for its contact is more than a physical contact, it is a living presence. When a man does not realise his kinship with the world, he lives in a prison-house whose walls are alien to him. When he meets the eternal spirit in all objects then he is emancipated, for then he discovers the fullest significance of the world into which he is born, then he finds himself in perfect truth and his harmony with the All is established. By the help of the *Gayatri* verse, the epitome of all the Vedas, we try to realise the essential unity of the world with the soul of man; we learn to perceive the unity held together by the One Eternal Spirit whose power creates the earth, sky and the stars, and at the same time irradiates our minds with the light of a consciousness that moves in unbroken continuity with the outer world' (pp. 18–19). Rabindranatha is a modern poet: the Vedic Rishis were poets of the most ancient times. 'O grant my prayer that I may never lose the bliss of the touch of the One in the play of the many' says Rabi, and the Vedic Rishi prayed ' Ever conscious of abiding in Thee may we be always of blissful, happy, joyous mind'. Rabindranatha tells men 'to meet the eternal spirit in all objects' but Vedic Rishis practised this throughout their lives meeting the Eternal Spirit in rain and sunshine, in storm and calm, in wind and fire, in rivers and mountains, in plants and waters, in the whole of Nature and beyond it. The whole trend of the Veda, the entire spirit of the Veda, and the chief purpose of the Veda is to teach man how to meet the Eternal Spirit in everything in nature, how to substitute God in the place of Nature, how to be ever conscious of the presence and power, glory and grace, beauty and benignity of God whenever he looks at the beauteous face of Nature! Yet these same ancientmost poets who were the first to perceive, proclaim and teach the Immanence of God as well as His transcendence—these great souls who by their example first showed how to see God in everything and everything in God are regarded as the most worldly while they are really the most spiritual of men by modern scholars who admire Geeta and Rabindranatha!!

PRINTED AND PUBLISHED BY V. M. PHILIP, AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS—1934. C1315

give place to one of praise and appreciation of Veda. We lay the blame of attacking Veda not upon Geeta but upon its admirers who have misinterpreted praise as scorn trying to place Geeta above Veda, Smriti above Shruti, the Word Remembered above the Word Revealed. We attribute this misinterpretation to their prejudice against Veda due to their ignorance of the real nature of that ancient-most Scripture as the most spiritual and deepest revelation of God to man. Geeta which re-echoes and amplifies the Isha and other Upanishads which themselves expound some of the spiritual truths found in Veda which from beginning to end teaches man to see and realise God in everything and everything in God—Geeta which is thus only a second-rate reflection of some Vedic Ideals is, in the eyes of these biassed interpreters of Geeta, greater and higher than Veda; just as Krishna son of Vasudeva and Devakee, a human being however great he may be, is, in their view, greater and higher than the Supreme Being, God. We have shown above that just as in the Veda many Rishis, impersonating Devas, such as Indra, speak as their representatives; so Krishna, imitating those Rishis, and impersonating God, speaks in Geeta as representing God. Not knowing this the commentators and translators of Geeta have raised Krishna, a human being after all, above God Himself just as later on Buddhists raised the Buddha above Brahma, the Supreme Being.

In section VII we have taken up for consideration the points of difference between Veda and Geeta which, although few, are of far-reaching significance and value. One point, for instance, is the unique method of condensation which we find nowhere else but in Veda alone and according to which one and the same mantra conveys four-fold meaning embracing the four planes of matter, mind, morals and spirit (or the inorganic, organic, and super-organic including the social and spiritual planes). This one point is of such great value that it has given rise to other points of difference some of which we have noticed in that section. Another important point of difference is that of outlook on Nature and world which are regarded by Veda as the necessary field serving as a proper training-ground for the discipline and development of Jeevas (individual souls) so that they may attain to perfection and divine bliss of immortality. Geeta does not appear to follow this Vedic doctrine fully and consistently as in some places it upholds it but in other places seems to go against it. We must study Nature, says the Veda, before we can learn anything about ourselves and God. Geeta is not so very clear on this point as Veda. Whereas in Veda, Nature and World are regarded as quite necessary for the full development, discipline and training of Jeevas (living beings), in Geeta they are looked down as at best something like a necessary evil to be got rid of as soon as possible—essentially a pessimistic view of life which is altogether absent in the Veda. The almost celestial freshness and glow of enthusiastic outburst of joy with which Vedic Rishis greet the sight of Nature and her brilliant phenomena called Devas (the Benign Bright Ones) is so unique and characteristic of Veda that we in vain seek for it in Geeta or anywhere else in the literature of the World. To the great havoc caused by the Flood coming in between Veda and all the other ancient remains of literature that have come down to us, may to some extent be attributed this refreshingly unique feature of Vedic Optimism. But we cannot explain it wholly in this way, for although Veda contains no reference to the great Flood and is therefore interglacial (pre-Flood) still natural calamities other than the deluge were not unknown to Vedic Rishis, as Veda refers to frequent geologic, atmospheric and seismic disturbances of great power causing loss and destruction to life and property. Thus the absence of a pessimistic view of life in Veda is to be, or rather has to be, ascribed to the pure undiluted lofty form of Monotheism which the Vedic Rishis not only professed but lived in their holy lives. For a firm belief in God cannot but be optimistic through and through in outlook. Pessimism cannot live and thrive in a mind in which is rooted a strong faith in God. The Vedic Rishis who loved God dearly did also dearly love His Work the world as also their duty towards it and God.

New Testament. But now it has been established beyond doubt that the doctrine of Bhakti, like many other Geetaic doctrines, can be traced, step by step, to the Veda, and that if there was any borrowing at all between the two, then, probably the New Testament was the borrower through Buddhism from Hinduism. In this cannettion the following quotations from Prof. Macdonel, Radhakrishnan and Dr. Bhandarkar will show how the Geetaic doctrine can be traced to Veda:—

Prof. Macdonel says—'Varuna's character in the Veda resembles that of the divine Ruler in a monotheistic belief of an exalted type.' Prof. Radhakrishnan in his Indian Philosophy says—'The Theism of the Vaishnavas and the Bhagavatas with its emphasis on Bhakti is to be traced to the Vedic worship of Varuna with its consciousness of sin and trust in divine forgiveness. The Vedas assume a very close and intimate relationship between men and gods. The life of man had to be led under the very eye of God. The Vedic religion does not seem to be an idolatrous one, there were then no temples for gods. Men had direct communion with gods without any mediation. They were looked upon as friends of their worshippers; Father Heaven, Mother Earth, Brother Agni—these are no idle phrases. Religion seems to have dominated the whole life. The dependence on God was complete. The people prayed for even the ordinary necessities of life: "Give us this day our daily bread" was true to the spirit of the Vedic Aryan. It is the sign of the truly devout nature to depend on God for even the creature comforts of existence. As we have already said we have the essentials of the highest theism in the worship of Varuna. If Bhakti means faith in a personal God, and for Him dedication of everything to His service and the attainment of Moksha or freedom by personal devotion surely we have all these elements in Varuna worship. Sin in the Vedas is alienation from God. The will of God is the standard of morality. Human guilt is shortcoming. We sin when we transgress God's Law. The gods are the upholders of Rita, the moral order of the world. The law of which Varuna is the custodian is called Rita. It stands for Law in general and the immanence of Justice'. Now we give Dr. Bhandarkar's views:—'Thus the Bhagavadgeeta is the result of the development of the religious and philosophic speculation that prevailed before the rise of Buddhism... And during the period when the Rig Veda poetry was composed love for God or gods was often an abiding sentiment in the heart of the poet as is evident from the words "Dyaus is My Father, Aditi is father, mother, son. Be gracious to us as a father to son." In this manner all the points that constitute the monotheistic religion of the Geeta are to be found in the older religious literature.' From all this we see that Geeta is pre-Buddhistic and has got most of its doctrines from Veda, as we have shown above by giving parallel ideas from both.

Thus in the first and the third sections of this paper we have set forth the great antiquity of Veda and the historic background of Geeta and in the fourth, fifth and seventh sections, the nature and chief features of Veda and Geeta, in the fifth section, under about 14 subsections have been set forth the identical ideas, similar thoughts and parallel passages found common to Veda and Geeta, proving how almost the whole field covered by the Geetaic Doctrines is Vedic in character, and showing how very little, like the concept of Avataras, in Geeta is un-Vedic. And even this concept of Avataras can be traced to those Vedic Hymns in which Rishis speak as impersonating or representing such Devas as Indra, Vak (Divine revelation), etc., Krishna impersonating Divine Inspiration and Arjuna representing the troubled human soul. Viewed in this light the entire Geetaic Teaching can be traced to Veda. How then can we consistently say that Geeta speaks of Veda in scornful terms? About this we have dealt in the following section VI, which discusses one of those passages in Geeta in which translators and commentators of Geeta see self-contradictory references to Veda. We have shown therein that, had these people followed the rules of logic and grammar strictly then the scornful tone which they see in Geeta about Veda would vanish and

Nature's resources, called Devas or Shining Ones, that modern scholars call it secular and unspiritual, not knowing the fact that Vedic spirituality is the very life and soul of Vedic secularity sustaining and uplifting it every moment. 'Be in the world, work in the world, look upon it as the sacred love-gift and handiwork of God, study and master it, but be ever conscious of His love and grace, and make this God-consciousness the very fulcrum, as it were, of thy entire being and becoming'—this we may say is the message of the Veda, noble and sublime, to humanity. Veda wants people to live in and study and master the world and thus make it a stepping-stone to ascend Godwards by developing all their faculties duly in order to become the worthy immortal sons of God. Divine communion, friendship, association and sonship is the sublime ideal Veda places before man by teaching him how to substitute God in the place of Nature and its phenomena. Veda is optimistic through and through and its noble teachings and lofty ideals bear no trace of the pessimistic idea of a conflict between secularity and spirituality. Veda in fact tells us how to have a happy blending of both these as they are complementary, aiding each other and not contradictory or antagonistic in the least. We have to live in the world if we want at all to grow spiritually. Nature affords finest opportunities for us to grow in moral strength and spiritual vigour, not to speak of intellectual power or physical might. Nature is the hand-maid of real genuine spirituality if we know how to utilise her, and Veda teaches us how to do this.

Says Sri Sankara in his commentary on the Vedanta Sutras: 'God is the revealer of the vast body of Scripture beginning with the Rig Veda which is all-comprehensive and all-enlightening.' That the Rig Veda is the oldest Scripture of mankind all learned men are practically unanimous. Says Professor Max Muller: 'In the Veda all possible shades of the human mind have found their natural reflection. It is the first word spoken by the Aryan man. It belongs to the history of the world and to the history of India. We see in the Vedic Hymns the first revelation of Deity, the first expressions of surprise and suspicion, the first discovery that behind this visible and perishable world there must be something invisible, imperishable, eternal or divine. "We have become so accustomed to . . . . that we hardly consider how mysterious is that instinct which suggested to the first poets the extraordinary variety of rhythm which we find in the Veda. But there is a charm in these primitive strains discoverable in no other class of poetry. Every word retains something of its radical meaning, every epithet tells, every thought inspite of its most intricate and abrupt expressions, is, if we once disentangle it, true, correct, and complete" (pp. 552-4 History of Anc. Sans. Literature). Whatever be the age when the collection of our Rig Veda Samhita was finished, it was before that age *that the conviction had been formed that there is but One, One Being, neither male nor female, a Being raised high above all the conditions and limitations of personality and of human nature, and nevertheless the Being that was really meant by all such names as Indra, Agni, nay, even by the name of Prajapathi, the Lord of Creation. In fact, the Vedic Poets had arrived at a conception of the Godhead which was reached once more by some of the Christian Philosophers at Alexandria, but which even at present is beyond the reach of many who call themselves Christians.*' Says Victor Cousin 'When we read with attention the poetical and philosophical movements of the East, abave all those of India which are beginning to spread in Europe we discover there so many truths, and truths so profound, and which make such a contrast with the meanness of the results at which the European Genius has sometimes stopped that we are constrained to bend the knee before the East, and to see in this cradle of the human race the native land of the highest philosophy'. From all this it is clear that the Veda is the earliest all-comprehensive universal, non-sectarian Scripture of mankind; and Geeta is only such a reflection from the Veda as the moon gets from the sun.

Many a writer from the West was struck with the similarity the Geetaic doctrine of Bhakti showed to Christianity and it was said that Geeta borrowed its Bhakti from the

We have dealt with this special feature of the Veda as well as its great antiquity in the preceding sections of this paper. We shall now see what Geeta says of Veda in this respect. 'I shall now tell thee of that state which Veda-knowers call the Imperishable and Immutable, which strivers freed from all entanglements enter, and desiring which men lead a life of Brahmacharya (a pure life devoted to the study of Brahma, Veda, Nature and God)' viii, 11. 'Only the knowledge of Nature and God I regard as true Knowledge. Hear me tell thee what Kshetra is, and of what sort it is; what changes it undergoes, whence and how it is and works; and also who its Knower is and what His powers are. This has been sung by Rishis in many and different ways, in various hymns' (of the Veda) xiii, 2, 3, 4. Here Krishna tells Arjuna in clear terms that Veda deals with the same true knowledge of Nature and God as well as the Supreme Goal of man which he is just going to briefly place before Arjuna. Then he touches upon these matters (Nature, God, and true saving knowledge of which, he says, Veda deals in various and manifold ways) and concludes the chapter thus. 'They who thus know by the eyes of wisdom and spirit the distinction between body and soul and Nature and God and also the deliverance of souls from bondage—such reach the Supreme' (xiii, 34). Again in ii, 45, 46 Krishna says: 'The Vedas deal with all sorts of conditions, high, higher and highest, but rise thou above the lower grades to the highest and be steadfast therein. For a learned and enlightened Brahmin will be able to find in all the Vedas as much use, worth and value as men do in a reservoir (of water) into which water runs from all directions.' In all these verses we see how Geeta speaks in the highest terms of Veda although there are detractors of Veda who mistranslate them. Ignorance of the real nature of Vedic revelation as the deepest spiritual treasure ever vouchsafed to mankind has given rise in their minds to a strong prejudice against that earliest sacred scripture. Their charge against it is that it deals with secular ritual and is not spiritual in character. We have shown in our books *Vedic Teachings and Ideals*, *Gospel of the Vedas* that this charge of theirs is utterly unfounded, and that the Vedas are spiritual as well as secular, leading man step by step from Nature to God. The Vedic Rishis dedicated everything to God, they prayed to Him for everything invigorating and ennobling, they clung to Him, they longed and yearned for Him, they regarded and remembered Him as their nearest Kith and Kin, as their dearest friend, father, mother, guardian, champion, path-finder, master, purifier, vivifier, comforter, and bliss-giver. God to them was a Living Reality, more real than their own lives, nearer and dearer than their earthly kith and kin and possessions. In every act, in every sound, and in every motion they remembered Him, heard His voice and saw His finger. The Veda containing ardent outpourings and yearnings of the human heart for the Universal Divine Heart, in almost every situation, fervent supplications of the human soul to the Universal Soul, is secular indeed!

But of one thing we are certain that the spirituality of so-called spiritual people who despise the world and its things is not the ideal of spirituality the Veda places before mankind. Veda bases its ideal of spirituality on a sound secular basis. The world is not a snare nor an obstacle placed in our path Godwards, but it furnishes the necessary field to serve as the best training-ground for the development of all the faculties of man so that he may thereby perfect himself and become fit for holding communion with God. We have to study and master the laws of Nature and then those relating to mind and morals and spirit before we can know anything about God. This is the Vedic Doctrine which tells us to look upon the world as the sacred handiwork of God and His Love-Gift to us, His children to be fully and duly utilised by us for perfecting ourselves. We are not to run away from the world but to be in it and master it in order to rise higher in our ascent Godwards. According to this Vedic view-point the world is too little with us and not too much. To some extent Geeta follows this Vedic Doctrine, we think, although there are persons who think otherwise. But about Veda in this respect we are quite certain. The Veda lays so much stress on the full utilisation of

and heavens etc.', (x. 119). Now Krishna's utterances when he represents God or God's Revelation in Geeta resemble remarkably the utterances of the Rishis in Veda impersonating Devas, only a few of which we have given above. If we take Arjuna to represent the noble human soul who finds himself placed in grave perplexing plight, and if we take Krishna to represent the Divine Voice of Conscience, or much better, Vak the Divine Word of Revelation, then Geetaic utterances embodying most valuable advice to a noble perplexed soul become quite intelligible without the necessity of seeking the aid of Pantheism, or Avatara. In fact we have hinted at this at the very outset. To us the charm of Geeta lies not in its fantastic notions about Avatara or Pantheism but only in its ever-memorable words of true help, aid and succour addressed to a languishing soul at the most critical juncture by one representing the Divine Voice, Word of God, Revelation, and Conscience, all combined.

VIII. Summary and Conclusion

To Philip, King of Macedon, was brought a horse which he asked his courtiers to examine. They found it very restive and went and told the king that the horse was the worst of its kind. Then the king himself tried his skill but on failing he exclaimed to the man "Away with it, it is useless; never again come to a king with such a worthless creature." Then the king's son, Alexander, a mere boy of twelve, who was near by, said to the king "Let me try, father; that horse there is the most splendid creature I have ever seen", so saying he asked the man to turn the face of the horse towards the sun; and then jumping nimbly upon its back he galloped away, to the wonder and astonishment of all present. When Alexander came back with the horse and stood before the king the latter exclaimed with joy "You are right, my son, it is the best horse I see and not the worst. We were all fools to regard it worthless, but you have proved its splendid worth and our deep folly at the same time." Just similar is the case with the Veda; for long were the Veda-Samhitas held to be of no great use until two boy-celebates (Bala-Brahmacharees) proved at the close of the last century that the Veda is the best and deepest literary monument bequeathed by the ancients to mankind. Alexander noticed that the horse was restive as his face was turned away from the sun so he asked the man to turn the face of the horse towards it so that the horse may not grow restive at seeing his own shadow. Just in the same way the two great men found that when the face of the Veda was turned away from God then Veda became unintelligible and intractable and meaningless; but when its face was turned towards God (when the chiefest purpose of Veda was found to be no other than that of leading man from Nature to God, when in fact it was found that Veda deals with the spiritual plane mainly besides dealing with the physical, psychical and moral or social planes) then the Veda revealed a beautiful meaning and purpose, noble and sublime, teaching mankind how to substitute God in place of the various agents, forces and phenomena of Nature so that they might ultimately reach Him by developing all their faculties harmoniously. They discovered that the real basis of Veda was Spritual through and through teaching man to be God-conscious whenever he looked at the face of Nature. They pointed out that the Veda wanted man to regard God as the All-in-All, looking upon Him as their dearest Father, Mother, Brother, Teacher, Friend, Guide, King, Physician, Ally, Companian, Comrade, Saviour, Healer, Shelter and Goal. Even the most superficial student of the Veda can attest to the fact how it teaches man to pray to God in an infinite variety of ways, names and circumstances. The Veda tells us to look upon Fire, Air, Water, Earth, Dawn, Sun and everything in Nature, nay Nature herself, as the manifestation of the glory, grace and greatness of God; and to see God in everything as well as to see everything in God, the Supreme Spirit.

of all.' This means that man becomes fit to reach and see God only after he hath mastered and risen above first Physical Nature and then Psychical Phenomena relating to the human soul. Man must rise above these two planes called UT and UTTARA in the Veda if he wants to know and see UTTAMA, the Supreme God. In a few verses Geeta too hints at these same ideas and so we may say that Geeta follows Veda in this respect howsoever haltingly it may be. But in vain do we search in the pages of Geeta for that glow, freshness and spontaneity of outburst of almost divine joy with which Vedic Rishis greeted and celebrated all aspects of Nature in all her moods, and freaks, and ways. To the Vedic Seers Nature throbbed and pulsated with Divine heart-beats and soul-stirrings, as she manifested the glory, grace, love and wisdom of God. To them God was All-in-All, their very breath, life, soul and spirit. They love to sing the glory of God under various names, epithets and appellations of the different manifestations of the glory of the Supreme One. The Veda wants us in fact to see everything in God as well as to see God in everything ; nay, to be conscious of God at every sight and aspect of Nature. While Veda regards Nature and world as a necessary field and training-ground for the uplift of souls (the jeevatma) Geeta regards them as a necessary evil, rather, to be got rid of as quickly as possible. Although in xvi, 8, Geeta condemns the view which regards our world as 'False without God, without moral Law, sprung from mutual combination of elements caused by lust' still in vii 13, 14, 15, 25, 27 the world is referred to in terms of illusion, delusion, magic, etc. Thus the poison of pessimism is seen to have penetrated even into the body of this noble piece of work. Elsewhere also the world is spoken of as 'wretched, miserable, bereft of all happiness'. Thus we see that Geetaic view of Nature and World is not as grand as the Vedic.

(6) Geetaic view of God becoming incarnate is un-Vedic. Divine Incarnation is possible only in Pantheism which tells us that God is All and All is God. As Geeta upholds incarnation-theory in some parts alone in which Krishna speaks of himself as the Absolute God and Supreme Spirit Incarnate, those portions might have been latest accretions grown round the original genuine Upanishadic nucleus of Geeta. Many who read pantheistic notions in the Upanishads as well as Vedas assert that these pantheistic ideas in Geeta are not later accretions but belong to the original poem itself which is the work of one author and not of more, as these pantheistic notions found in Geeta are derived from the Upanishads and Vedas themselves. These people point to two hymns, 90 and 125, of the Tenth book of Rigveda as the original from which Geeta has taken its doctrine of Pantheism and incarnation, especially what is called Vibhooti Yoga in chapter X and also Vishvaroopa Darshana in chapter XI. Although it is perfectly true that the two chapters in Geeta are to a certain extent modelled after the two hymns of Rigveda, still it is not true that the two hymns are pantheistic in character. The Veda is Monotheistic and not Pantheistic nor Polytheistic. "Mahitva eka it Raja jagato" "Adhi Deva ekah" "Bhootasya Patih ekah" "Ekam Sat vipra bahudha vadanti"—these and innumerable other Vedic phrases which mean "one sole Glorious Ruler of the rhythmically moving universe; the One Supreme God; One Lord of Beings; Him who is one sages and specialists call by many names such as Agni, Indra, Mitra, Varuna, etc." show clearly that the Veda is Monotheistic. Veda teaches that souls go through the cycle of re-births just as the Geeta teaches. Rishi Vamadeva says "I became Manu Soorya Kakshivan" (iv. 26, 1). Further on the same sage representing Indra says "I have bestowed the earth on the Arya (the noble) and rain on the pious, I guided forth the loudly-roaring waters and the Devas, the Shining ones moved at my will" (iv. 26, 2). Similarly Vak, the daughter of a Rishi, representing Divine Word says "I travel with all the Devas, I accompany them, I load with wealth the zealous, pious, I am the Queen, the gatherer-up of treasures, first of those who merit worship, I rouse all and penetrate the earth and heaven, I extend over all creatures etc." (x. 125). The Rishi Lava, representing Indra says "I greatest of mighty ones have surpassed in my grandeur all this spacious earth

few points preached to it as the highest. Suppose for instance that a certain people forgot *m, n, o, p,* out of the total *A to Z* principles of Vedic Dharma and that a great man came among that people who noticing a lack of those principles among his people preached to them *m, n, o, p.* But the people would think that *m, n, o, p,* alone are the principles of religion and the rest are of no use, and would be ready to fight with other sects who regard other principles as of equal value. In this way the sects, who appropriated only one principle out of the many principles of Karma, Jnana, Bhakti, Ahimsa, Sannyasa, etc., that Veda tells man to follow, arose. Not only principles were appropriated but out of the different names of God which we find in Veda, the Vaishnavas took Vishnu, the Shaivas selected Shiva, the Sauryas chose Soorya, the Parsis preferred Ahura (Asura), the Hindus adopted Deva, as also Romans Deus and Greeks Theos or Zeus Jupiter, the Jews took Jehova and Eli or Eloh (from Yahva and Arha), Jains and Arabs took Arhat and Arha.

(3) The unique method of condensation which we find in the Veda and nowhere else, by means of which Veda teaches at one and the same time of the four planes of body (matter), of mind, of morals (society), and of Spirt or Soul. As we have shown in our books, one and the same mantra or hymn or name such as Indra, Soorya, Vata, Apah, etc., represent all the four planes. Mantra, the product of deep thought requires deep thought to unravel its meaning. Yaska says that the Vedic verse is given the name "mantra" because the more we think and ponder on its sense the more it elevates us. Says Prof. Max Muller :—" In praying to Dawn the Vedic Rishis prayed to something within or beyond the Dawn which did not vanish, which came again day after day, which manifested itself to their senses but could never be fully grasped by them." "I maintain that when the Vedic Rishis celebrated the rivers, the dawn, the sky, Indra, etc. they did not simply mean the objects which they saw but also something beyond, call it unknown, infinite, or divine" (pp. 144-5). Thus Veda deals with all things from matter and Nature to the Supreme Spirit, God. It treats of all departments of knowledge, from the lowest, the Material, to the highest, the Spiritual. Geeta does not lay claim to such a depth of meaning nor to the unique method of condensation that we find in Veda.

(4) Another unique feature of Veda is that it teaches mankind how to substitute God steadily in the place of Nature and its forces, agents, phenomena, for, Veda teaches man to be conscious of the love, grace and glory of God whenever he looks at the face of Nature. This it does by means of that same unique method of condensation. Thus the hymns addressed to Agni, Apah, Vata, Soorya, etc., do not only teach us of these bodies (fire, water, air, the sun) but they at the same time remind us of the presence and glory of the Supreme Spirit whose glory fire, water, air and sun, etc. manifest in part.

(5) The Geeta differs from Veda in its outlook on Nature. Although Geeta does not preach a wholly pessimistic creed still it has not shaken itself free from the taint of pessimism which we find in the post-Vedic or rather post-Flood literature preceding Geeta. Nature and the world, Veda says, is the love-gift from God to us which we are taught to regard sacred and holy as the handiwork of God and which we are to use fully to develop ourselves harmonionsly in order to reach God. The pessimistic idea that "the world is too much with us" is the dominant note that we find in all post-Vedic and post-Flood Thought. 'Man suffers because he is too much taken up with the world', say all saints whether eastern or western. But Vedas teach that man suffers because the world is too little with man, because he knows but too little of it and its ways, of its agents and forces, of its processes and workings; because man cannot rise higher unless he learns about Nature. Vedic Rishis say 'We have first learnt of UT, the subtle physical Nature, next of UTTARA the subtler Psychic Phenomena, and then lastly of UTTAMA, God the subtlest Supreme Source and Ruler

In ii, 45, if we are to follow translators of Geeta, we are confronted with a logical difficulty! How is one to pass beyond *Sattva* and remain steadfast in it at the same time? and in ii, 46, *sarvatah samplutodake udapane* is one phrase known in Grammar as the locative absolute; and it yields a good sense; but translators of Geeta break it up against all rules and make out that Geeta scorns Vedas! Thus if we do not follow these translators, but follow logic and grammar and also context (as we shall presently show) the two Geetaic verses yield a beautiful natural sense not scorning, but praising, the Vedas. The three preceding verses, ii, 42–44, condemn those foolish persons who, ignorant of the real purpose of sacrifices, bent only on securing wealth and fame, urged by intense desire for low means of enjoyments, revelling in idle hair-splitting discussions of the *letter* of Veda, and lost utterly to the *spirit* thereof, say that there is nothing else to be done. That this does not amount to a condemnation of either the institution of sacrifice or of the Veda itself (for all this is praised and regarded as essential in other parts of Geeta) but that only ignorant, foolish and selfish performers of sacrifice are condemned in these verses from the point of view of selfless service and disinterested duty—yes, to guard against a possible and probable misunderstanding, Geeta expresses in the following two verses (45–46) clearly that Veda is to be regarded as of the highest value. Thus we find that context, logic and grammar are all on our side, condemning the false interpretation put upon certain Geetaic verses in order to make out that Geeta scorns the Veda and goes against its teachings.

VII. Points of Difference: How Geeta differs from Veda

These will not detain us long; for they are few; but they are of such importance that we cannot pass them over in silence. Geeta is a reflection of the Veda but only an imperfect partial reflection somewhat like the moon's reflection of sun's light. Let us see how this is briefly:

(1) The Veda is primeval and eternal, Geeta is medieval and temporary, although it teaches some eternal truths that had been almost forgotten. The Veda is the eternal Word of God renewed at the beginning of every Evolutionary period by Rishis who attain to the highest pitch of knowlege and wisdom at the end of the preceding cycle of evolution. This explains how.

(2) The Veda contains the germ root spirit essence of all knowledge and wisdom necessary for man to train and develop all his faculties harmoniously so that he may be fit to accomplish his life-purpose. Just the perfect scheme of life including the theory and practice of both the secular and spiritual aspects of life—this is placed before mankind in the Veda. Just as the sun was given at the beginning to light up our physical path and movements, so the Veda (the sun of revelations) was given at the beginning to help our reasoning faculty and light up our secular as well as moral and spiritual path and guide us in our ascent Godwards. And just as during nights when the sun is hidden from our sight the moon and other lights aid us, so during the ages when men forgot the Veda came the Brahmanas, Aranyakas, Upanishads, Geeta, Mahabharata, Ramayana, Puranas, etc. to guide man. In fact, Sankaracharya says that when the two-fold Vedic Dharma had become almost forgotten Krishna had to repreach the same to the world through Arjuna; and Geeta too says the same thing: "When irreligion ousts religion great persons come to repreach Dharma." Our world is subject to Cyclic, Periodic or Rhythmic Law of Harmony according to which periods of light and darkness, rain and drought, religion and irreligion alternate; and whenever true religion is lost sight of, some great persons make their appearance to repreach those points to the people which they have forgotten. Thus a great variety of religious sects have sprung up. And conflict among these sects arises when each of them regards the

XIV	
viii, 52, 8 ; x, 190, 3 ; i, 30, 14 ; viii, 58, 2 ; Yajus, 32, 8 ; i, 24, 1 ; x, 56, 1-2 ; x, 57, 2, 4, 5 ...	viii, 17-19 ; ii, 27, 8 ; viii, 21 ; iv, 5, 7, 8 ; vii, vi, 19 ; vi, 45 ; xvi, 20.
XV	
x, 81, 1 ; iv, 40, 5 ; x, 63, 10 ; v, 46, 1, Yajus, 18 ; x, 117, 6 ; i, 31, 15	iii, 8-20 ; iv, 25, 32 ; xviii, 5-6.
XVI	
ii, 12, 13 ; i, 103, 5 ; i, 55, 5 ; i, 102, 2 ; vii, 32, 14 ...	xvii, 2, 3, 13, 17, 28 ; ix, 3 ; vi, 47 ; iv, 40.
XVII	
Yajus, 31, 18, 21 ; Yajus, 32, 13-15, 9 ; viii, 6, 10 ; i, 164, 39 ; Atharva x, 8 ; i, 50, 10 ...	iv, 33, 36-39 ; v, 16, 29 ; vii, 17, 18 ; xviii, 20 ; viii, 9 ; iv, 41-42, 19 ; vii, 4-7.
XVIII	
x, 4, 1, 2 ; i, 175, 6 ; x, 7, 3, 7 ; vii, 31, 4 ; viii, 58, 8, 9 ; i, 150, 3 ; x, 43, 2, 1 ; x, 39, 6 ; i, 57, 4 ; ii, 20, 2 ; ii, 26, 3 ; ii, 33, 6	v, 17 ; xviii, 65 ; xiv, 26 ; xv, 19 ; xiii, 10 ; xii, 3-20 xi, 54-55 ; x, 8, 11 ; ix, 13, 14, 22, 29, 31-34 ; viii, 8, 9.
XIX	
vii, 55, 13 ; i, 34, 1 ; vii, 32, 14 ; x, 39, 6 ; viii, 1, 1 ; ii, 16, 8 ; ii, 27, 6 ; vi, 29, 1, 2 ; viii, 69. 1; i,, 11, 2 ; iv, 4	xviii, 61, 62, 56, 58, 66, 51-54, 17.
XX	
viii, 5, 6, 1, 13, 29 ; viii, 4, 7, 17 ; Yajus, 40, 6, 7, 2, 1	xviii, 2, 5, 6, 9, 49 ; v, 2 ; vi, 30 ; iv, 18, 20, 23.

VI. Geetaic References to Veda

Geeta refers to Veda in many a place ; and we have here to touch a subject which has given rise to a good deal of quite unnecessary bitterness and controversy owing to ignorance of the real nature of Vedic Revelation on the part of the interpreters of Geeta. These people have placed Geeta in a false position with regard to Veda. They go even against logic and grammar and context to show that Geeta attacks Veda directly in ii, 45, 46. Where there is praise of Veda they see scorn and nothing but scorn ! We give here the true as well as the false interpretation, side by side.

True	False
Geeta ii, 45—The chief purpose of Veda is to raise man from the lowest through the intermediary to the highest of states ; hence, O Arjuna, do rise to that highest state and be steadfast in it. *Or*, The Vedas tell man to get rid of three *Gunas* or bonds, so, O Arjuna, shatter the same (which are *adhibhautika*, physical ; *adhidaivika*, mental ; and *adhyatmika*, moral).	Geeta ii, 45—The Vedas deal with *sattva*, *rajas* and *tamas*, the three constituents of Nature ; go, O Arjuna, beyond these three, but be steadfast in *sattva* only.
Geeta ii. 46—All the Vedas are of as much use to an enlightened man as a reservoir into which water flows from all directions.	Geeta ii, 46—All the Vedas are as useful to an enlightened man as is a tank in a place covered all over with water.

ix. Need for Karma, Action

One should pass his days ever doing (good) works (selflessly); for thus alone one can hope to be freed from the bonds of acts (Yajur, 40, 2).

Thy duty is to work and lay claim to no fruit thereof. Work done as a sacrifice selflessly will not fetter thee (ii. 47 ; iii. 9.)

x. Value of Jnana, Knowledge, Wisdom

He who knows God leaves death far behind ; no other path takes one to the goal. The wise Brahman who thus knows God shall have the Devas (Nature-forces, senses) in his control (Yaj.)

Nothing purifies like wisdom. When ignorance is dispelled wisdom will shine like the sun, revealing the Supreme. All action is fulfilled in knowledge or wisdom (iv. 38 ; v. 16).

xi. Bhakti, Love, Devotion

An overflowing fountain in the desert art Thou, O Lord, to one who worships Thee (x. 4, 2) Thou hast been to us a perpetual joy and blessing like cool water to the thirsty (i. 175).

God can be reached by pure devotion and love. He who does God's work, accepting Him as his goal, adoring Him free from hatred, reaches God (xi. 54, 55).

xii. Prapatti, Self-surrender, Humility

Verily, Lord, we are Thine: we wholly depend on Thee; for there is none but only Thyself to show us grace (vii. 55, 13). We cling to Him as one clings to a cloak in winter (i. 34, 1). Without Thy aid I am unable even to move my eye-lids (ii. 27, 6).

Seek Him alone for shelter with all thy soul; by His grace shalt thou secure supreme peace as also the everlasting abode. One who takes refuge in God, although ever engaged in all sorts of work, will by His grace attain to the eternal abode (xviii. 62, 56.)

xiii. Sannyasa, Renunciation, Substitution of God in place of Nature

What mortal can dare harm the man whose sole wealth is the Glorious Lord (vii. 32, 14). Glorify naught besides, O friends, praise only the Almighty Lord; so shall no trouble beset ye (viii. 1, 1).

Surrendering thirst for the fruit of all duties, seek thou God's shelter alone, then He will release thee from all sin, evil and misery, so that you will have no cause for grief or lamentation (xviii. 66).

xiv. Miscellaneous Concepts

Thou art the Sole Ruler over all and Adorable by all; Thou hast put undecaying store of power into the sun (ii. 13, 1). Thou hast filled all the regions with Thy greatness and glory; yea of a truth there is none other like Thee, for Thou and none else hast made all things in due order (i. 52).

Great Nature is His womb, in it He places the germ, thence is the birth of all beings (xiv. 3). Of infinite power Thou holdest all. The whole world is spread out and pervaded by Thee. There is none like to Thee, Adorable Guru, guide, Teacher, Protector of all (xi.)

Numbers of Mantras and Shlokas quoted under the 20 Sections of V

Veda.	Section.	Geeta.
i, 31, 14; x, 81, 1; iii, 31, 15; i, 43, 9, 5; i, 164, 20; i, 129, 11; i, 31, 10, 16; i, 51, 8, 9. ...	X	xi, 43; v, 14–16; ix, 10; xiii, 20, 23; iv, 7, 8.
i, 51,1 5; v, 46, 1; viii, 2, 18, vii, 32, 9, 13; i, 10, 2; iv, 2, 17; viii, 47, 18; Yajus, 40, 1, 2 ...	XI	v, 10-12, 25, 26; iii, 19, 20, 25; iv, 15, 19, 20, 21.
i, 30, 10, 12–13, 6–7; i, 27, 9; i, 24, 15, 5; viii, 32, 26; iii, 43, 5	XII	v, 17, 19–21, 24–26; vi, 27–28.
x, 68, 12; i, 41, 2; vi, 5, 7; vi, 1; i, 27, 2 ...	XIII	vi, 40-47.

(A) Identical Doctrines from Veda and Geeta

i. Chief Purpose of Both is to lead man from Nature to God

VEDA-MANTRAS

Studying first the subtle physical part of Nature and then the subtler psychic phenomena relating to our souls, we have reached the subtlest Divine Light, the highest source of, and the most exalted among, all Lights (i, 50, 10).

GEETA-SHLOKAS

True knowledge is of body, Soul and Spirit (xiii. 3). Men who relying upon God strive for freedom from death and old age, learn of all evolutionary process, of Soul, and of God the Supreme (vii. 29).

ii. World-Tree, a Figurative Concept of Nature and Universe

Varuna the Supreme Lord of hallowed might sustains erect the Tree's stem in the bottomless region. Its root is high above and its shoots down below (i. 25, 13).

With roots up and shoots below, the World-Tree is eternal; its leaves are Vedic Hymns. He who knows that knows Veda (xv. 1).

iii. The Supreme Spirit, World-Soul, Pervader, Evolver, Ruler of All

He who hath eyes, faces, arms and feet as it were on all sides, He, the sole God and Ruler, evolving heaven and earth weldeth them as with bellows (x.81, 3). The All-pervading Supreme Spirit has a thousand heads, eyes, feet (X. 90).

He the Supreme Spirit has eyes, ears, hands, feet, heads and faces every side. He is other than both phenomena and noumena enveloping all. He, beginningless, is to be known to secure immortality (xiii. 13, 14).

iv. The All-in-All-ness of God

Hero of heroes, Thou art Indra and Vishnu of mighty deeds; Adorable, Brahmanaspati dealing out weal art Thou. Thou art Varuna, Mitra, Aryaman, Ansa, Rudra, Pushan, Savitar, Bhaga, Aditi, etc. (ii. 1).

He is Indra among the gods, Vishnu among the Adityas, Sun among the lights, Shankara among the Rudras, Varuna, Aryaman, Agni, Yama, Vayu Dhata, Om, Prajapati, etc. (ix. x, xi).

v. God's Love, Grace—Nature being God's Love-Gift to Creatures

In love didst Thou make the dawn glow and the sun shine—heaven with its streams of golden hue, and earth with her tints of green and gold (iii. 43, 2).

God is the friend and lover of all creatures as He accepts the sacrifice, austerities, worship and gifts from them (v. 14, 29).

vi. Disinterested duty, Selfless Service, Altruistic Activity etc.

May we, like sun and moon, pursue our path of duty that leads to bliss in full security and perfect order; so that we may be blessed by associating with One who knowing us full well harms us never but blesses us ever (v. 51, 15).

He who resigning his heart to God works selflessly is unsoiled by sin as a lotus leaf by water. A selfless man renouncing the fruit of his acts attains to perfect peace of mind. Rishis, sinless, working for the good of all, secure bliss of God (v. 10, 26).

vii. An exalted concept of Sacrifice as selfless Social Service

May my breath, speech, sight, hearing, mind, study body, work, wealth, desires, sport, abode, all be consecrated by sacrifice, may my entire life be one long continuous act of sacrifice and service (Yajur, xxxi).

With sacrifice the Lord evolved creatures and said, "With this you get all that you want." Sacrifice as prescribed by Veda comes from God. This world is fettered by work unless it is done as sacrifice (ii. 3).

(B) Parallel Concepts, Similar Ideas, Like Thoughts from both

viii. Need of Shraddha or Faith

Faith in Thee alone blesses us with complete, all-satisfying, perfect, heavenly glory and might (vii. 32, 14).

One who has no faith comes to ruin; for him there is neither this nor next world (iv. 40).

VI. Like Veda it holds up before man the sublime ideal of Divine communion, association, fellow-ship, friendship, sonship, etc.

VII. Like Veda it teaches us to do our duty with perfect equanimity and selflessness, both as a part of social service and divine worship (i.e. as Yajna).

VIII. Like Veda it teaches a broad, wholesome spirit of toleration condemning none but the most hardened, perverse evil-doers, god-less spirits.

IX. Geetaic concept of divine incarnation can be seen to be modelled after the Deity-impersonating hymns of Vedic Rishis (Rig. X, 90, 119, 125).

X. As Shri Shankara says, Geeta has boldly re-preached the old old Vedic Dharma by synthesising the different Vedic Principles which had been divided and monopolised as it were by different sects.

V. Relation between Veda and Geeta—Similarity

We now proceed to compare and contrast the two famous works, pointing out first the relation that exists between them. Let us begin by taking an illustration from human physiology, which can help us to grasp clearly the relation that obtains between the two. Physiologists tell us that the Heart sends purified red blood to all the tissues of the body through the Aorta which dividing and subdividing itself into countless smaller and smaller arteries and capilaries, irrigates as it were the entire field of the tissues of the body and supplies whatever is needed. When this work of irrigation and feeding is over, the blood, first through countless fine capillaries and then fewer and larger veins, returns to the heart, laden with waste matter and dark-blue in colour which is sent by the heart to the lungs to be purified and sent back to the heart. In a similar way the Veda sent forth the pure energising and vivifying principles of Divine Dharma to irrigate feed and energise the entire field of human life, effort and conduct, so that man may be enabled to ascend from Nature to God. Now just see how the work of assimilation, appropriation, metabolism, etc. went on throughout the body of Thought and the field of Ideas and Ideals in the post-Vedic period. Just as in the human body different organs assimilate different elements from the same blood-stream, so also in the body of Thought different groups of men appropriated different principles from the same Veda and formed themselves into different sects such as Vedantists, Sankhyas, Yogees, Yajnikas, Pravritti-margees, Nivritti-margees, Bhakti-margees, Sannyasees, Shramanas, Bhikshus, Vaishnavas, Shaivas, Shaktas, etc. So on and so forth these various sects went on to pour forth all the venomous waste matter they could generate, into the general stream of Thought-circulation and Thought-transfusion, of the post-Vedic period; and all this stuff, good and bad alike, was gathered into the Mahabharata and Puranas which together received the name "Panchama or fifth Veda" in contrast with the four Veda Samhitas. The human heart has two parts, one sending forth the red purified blood and the other receiving back the impure dark blood; just so the Veda sent forth the pure principles of Dharma while the panchama or fifth Veda (Mahabharata and Puranas) received back the impure stream of sectarian thought. Then an unknown Master-Mind purified this fifth Veda and got from it the well-known Geeta which really with the Ramayana deserves to be called the panchama or fifth Veda, because these re-preach the same pure principles of the old divine Veda. The Geeta, Ramayana and some fine portions of Mahabharata and Puranas can lay real claim to the title "Panchama Veda" if we omit the distinctly inferior matter mixed up with noble ideas in them. This is enough to help us in grasping the relation between Veda and Geeta, rightly and clearly. We now proceed to set forth the main theme of this paper, quoting mantras from the Veda and shlokas from the Geeta, on identity of concept or likeness of thought and similarity of ideas. For the sake of convenience and to save space, only a few quotations are given here from the respective books; but for the guidance of the student of the subject, references to further matter from the same texts are given in a foot-note.

to pass through this two-fold process of separation and unification. On the large scale, i.e. among peoples and vast groups of men, this swinging process is specially noticeable. The group-mind or collective intelligence of a people will for a time revel, as it were, in division and separation and then proceed to the work of unification ; provided of course it is allowed free-play and not hindered or arrested by external influences. Let us instance the condition of Indian Thought before and during the period when the Geeta was being composed. In our opinion Geeta is post-Upanishadic and pre-Buddhistic. This period is of special interest as it was characterised by great mental unrest and thought-turmoil. This unrest was due to the many and varied speculations about the meaning of the Veda (referred to in Geeta as Veda-vadas) which had become unintelligible owing to the break in tradition caused by the sudden cataclysm of the Flood. In this way a vast body of literature had grown up in the form of Brahmanas Aranyakas, Upanishads and Sutras giving rise to many a sect each of which adopting a few half-understood principles from the Veda neglected the rest and engaged in bitter sectarian warfare among themselves. One sect held up Pravritti (Forward Policy), another Nivritti (Withdrawal-policy), another Yajnas, another Jnana, another Yoga, another Sankhya another Bhakti above all the other principles found in the Veda. So on go on these sects in their mad narrow predilections indulging in bitter sectional conflict while the Veda declares that all the principles are necessary. This separatist conflict among the various followers of the Brahmanas, Aranyakas, Upanishads, Sankhya, Yoga, Bhakti Pravritti, Nivritti, etc. does but represent only one phase of the swing of the human mind in the form of division-loving forces and when these exhausted themselves, the natural reaction set in, in the opposite direction of the swing towards conciliation, co-ordination and harmony. As a result of this universal desire for consolidation in the group-mind, wiser minds began to seek order and harmony out of the then existing confusion and chaos and Geeta is the finest product we owe to the noblest efforts at syncretism and synthesis, consolidation and harmony. This same fact is hinted at by Shri Shankara in his introduction to commentary on Geeta ' Krishna repreached the long-lost two-fold Vedic dharma to Arjuna in Geeta and Vyasa put it together in Mahabharata.'

Prof. Ranade says ' Vasudevism was indeed no new religion. It was merely a new stress on certain old beliefs which had come down from the days of the Vedas. The spring of devotional endeavour which we see issuing out of the mountainous regions of the Veda, hides itself in the philosophical wood-lands of the Upanishads, until in the days of the Geeta, it issues out again, and appears to vision in a clear fashion, with only a new stress on the old way of beliefs' (p. 3, *Mysticism in Maharashtra*). Prof. Radakrishnan also is of the same opinion. Even Dr. Bhandarkar sees the roots of Geetaic Bhakti in Vedic hymns (see pp. 278–282 of our book *Vedic Teachings and Ideals*).

Now we here summarise the main Geetaic Doctrines :—

I. Geeta, like Veda, wants man to ascend from Nature to God,

II. By developing all his faculties harmoniously,

III. With the help of the several Yogas or methods of Shraddha, Karma, Jnana, Bhakti Prapatti, Sannyasa, Anasakti, Pravritti and Nivritti.

IV. Geeta, like Veda, teaches us to utilise the Forces of Nature but not to be entangled as it were in its meshes. It tells us, like Veda, to be in the world, nay even to be of the world, provided we at the same time rise above its allurements, glitter and glamour.

V. Like Veda it teaches the All-in-All-ness of God as well as the Solidarity of the universe together with the concomitant fact of the imperative sanctity of eternal, immutable Law, Dharma, Rita. It does also teach of the grand law of periodic, cyclic or rhythmic harmony, and that of Karma and Re-birth.

Vishnu became a great fish to save the Veda from the Ocean. This idea seems to be based on some dim remembrance of the Flood intervening between the Veda and later literature. From all this we conclude that the Veda is pre-historic, pre-glacial, pre-Flood or interglacial and therefore it had become unintelligible to later ages owing to a catastrophic break in tradition.

II. Nature and Features of Vedic Revelation

We have dwelt at length on this subject in our books on the Veda. So we give here a summary of the various conclusions reached therein on the nature and features of Vedic Revelation under sections IV, V and VII.

III. Historical Back-Ground of Geeta

The Geeta can be shown, from internal evidence, to be the direct descendant of the genuine Vedic Upanishads: Isha, Katha, Mundaka, Shvetashvatara, Maitree, etc. from which it quotes freely. Thus it is plain that Geeta is later than these Upanishads. Next it can be shown also from internal evidence that there is no trace of either Jainic or Buddhistic influence in Geeta. Thus we can safely place our present Geeta between the old Vedic Upanishads on the one hand, and Mahavira and Buddha on the other. Again it can certainly be placed nearer the Upanishads than Mahaveera or Buddha. In the present state of our knowledge more than this we cannot definitely assert. As regards the Upanishads again we can say definitely that Geeta comes between the old genuine Vedic Upanishads and the later sectarian so-called Upanishads, because the great merit of Geeta as an Upanishad is that it is as perfectly non-sectarian as the Vedic Upanishads Isha, Katha, etc. Thus Geeta can be held to be a late Upanishad inserted into the body of the Mahabharatha just as many other works such as the Narayaneeya section have found their way into that popular Epic. Geeta at the end of every chapter calls itself an 'Upanishad' and one of the introductory verses says that Geeta is the milk-nectar milked for the benefit of the good and wise by the expert milker Krishna by making Arjuna the 'calf' from all the Upanishad-Cows. Some scholars like Tilak see two distinct layers in our present Geeta—one in which the impersonal Brahman is spoken of in the genuine old Upanishadic style, and the other in which Krishna impersonates the Supreme.—the former being the nucleus round which the other layer grew in course of time. From all this it is pretty certain that Geeta as we now see it, is an amplified late Upanishad inserted into the great epic. Mr. Tilak thinks Geeta as a part of Mahabharata was in existence before 400 B.C. and that this Geeta was an amplified form of an earlier smaller work which formed part of an earlier Bharata called Jaya which he places at 900 B.C. and from which he says the present Mahabharata grew. He places the Brahmanas at 2,500 B.C. and the Upanishads at a period far anterior to 1600 B.C. The date of the Kuru-pandava war he accepts as about 1400 B.C. when Krishna re-preached the Karmayoga or Pravritti Dharma. Mr. Vaidya differs from him in assigning far earlier dates to both Geeta and the Bharata which he places at 1400 B.C. because he says that Geeta is Pre-Panini and Pre-Pingala (1,000 B.C.). Both like Telang think Geeta to be an integral part of Mahabharata.

IV. The Nature and Features of Geetaic Doctrines

Students of psychology know the well-known fact that the human mind is never at rest but swings and oscillates between the two poles of 'Divide and Unite'. As it is constituted our mind cannot grasp a thing unless it goes through the processes of Analysis and Synthesis. Every bit of our experience, to be genuine and complete, has

wisdom; and Hrishikesha meaning one who is the lord or master of sense-organs. Arjuna represents the colourless propensities of the human soul that stand in need of the guidance of Reason and Conscience. Mamaka and Kaurava represent the *tamasic* and *rajasic* tendencies, while Pandavas represent the white *satvic* or colourless propensities of the human soul. The three brothers Dhritarashtra, Pandu and Vidura stand for the three gunas or strands, viz. the blind *tamas* (inertia, darkness), the pale *rajas* (motion, activity), and *satva* (light, goodness). The Geeta is thus explained as the Advice offered by Reason and Conscience on the momentous occasion of every struggle that takes place between the many evil (Kaurava) and the few good (Pandava) propensities of the human soul in this world and the human body which are fitted in every way for the discharge of duty and which are therefore rightly called Dharmakshetra, Kurukshetra.

Our subject falls under the following heads :—(1) Historical considerations *re* Veda, (2) Nature and Features of Vedic Revelation, (3) Historic back-ground of Geeta, (4) Nature and Features of Geetaic Doctrines, (5) Identical Teachings, parallel thoughts, etc., common to Veda and Geeta, (6) Geetaic references to Veda, (7) How and where the two differ, (8) Summary and Conclusion.

I. Historical Considerations *re* Veda

"The Veda belongs to the history of the world and to the history of India; it is the first word spoken by the Aryan man" says Prof. Max Muller, but strangely enough he assigns a very late date to it, 1200 B.C. Prof. Buhler was for a much earlier date than that. Prof. Bloomfield inclines towards 2000 B.C. for Vedic literary production and to a much earlier date for the beginnings of institutions and religious concepts thereof. Winternitz carries the date still further back by a millennium. Jacobi arrives at 4500 B.C. from astronomical data. Tilak pushes it back to 6000 B.C. Mr. Kelker, from Jupiter's occulting the star Tishya referred to in Taittiriya Brahmana, assigns 4560 B.C. to that work thus carrying the Veda to a far greater antiquity. Astronomical references contained in the Vrisha-Kapi hymn and also in the Marriage hymn, 85, of the tenth book of Rigveda led Dr. Mukhopadhyaya and others to assign to Rigveda vast antiquity. And this is confirmed by the fact that, as we pointed out in the Vedic Magazine more than 29 years ago, there is no mention of the Flood in the Veda although all other ancient records such as those of Babylonia, Persia, Judea and even India (viz Zendavesta, Old Testament, Brahmanas) clearly refer to the Flood. Thus in our opinion the Veda is pre-historic, pre-flood or interglacial, the Flood occuring after the Veda and before the Brahmanas, Old-Testament, Zendavesta, etc. And this terrible catastrophe of Flood coming in as it did between the Veda and the Brahmanas explains well why the Veda had become almost unintelligible to all post-Vedic works such as the Brahmanas, because all post-Vedic works are really post-flood works. Oriental Vedic scholars know that a great break and gulf exists between the Veda and the Brahmanas. Dr. Peterson speaks of the "artificial system of interpretation first started by the authors of the Brahmanas who had lost all knowledge of the natural sense of the ancient Vedic hymns". Pandit C. V. Vaidya says "The Rigvedic gods had become an enigma even in the days of the Brahmanas naturally enough as hundreds of years had elapsed by their time". Thus we find both Indian as well as Western scholars freely acknowledging the fact that Veda had become a sealed book to post-Vedic works. Nothing but some such terrible calamity as the Flood could have caused this break between Vedic and post-Vedic tradition. A. C. Das has suggested that frequent mention of seismic disturbances in the Veda and its reference to the existence of four seas round about Sapta-Sindhu go to prove the great and vast antiquity of Veda. There is a well-known tradition in post-Vedic literature including Geeta that as often as Vedic Dharma had become lost (unintelligible) so often had God Vishnu come down to re-establish the same. Once, it is said,

THE VEDA AND THE GEETA

By

G. DHARESHVER

"Like the sun and the moon, may we pursue our path of Duty that leads to bliss and associate with One who knows us well, harms us never, but blesses us ever" (R.V. v, 51, 15). "O Glorious Lord to Thee do we closely cling and incessantly pray; lift us up with Thy saving grace and manifold aids" (iv, 32, 4). "Supreme Inspirer and Ruler, make our fame most excellent among all the Shining Ones the godly and the divine, most lofty as the heavens on high" (iv, 31, 15). "Yearning ardently for Thee do we ever cling to Thy friendship. Lead us, Lord, along the path of Thy Law beyond all evil and misery" (x, 133, 6). "Yearning for the All-Seeing Lord, my thoughts ever do move far far beyond the visible towards Him, as kine towards pasture" (i, 25, 16.).

AT the court of the mighty emperor Charlemagne, one day a visitor came with a piece of cloth which, he said, he wanted to present to the emperor. At this the emperor and his courtiers laughed uproariously, for the piece looked just like canvas. "A pretty present for the ruler of a mighty empire, but if you do not justify your claim, you shall be made to feel the lash on your back; now prove to us that this rag is worthy of a place on my table" said the king. Unmoved by these threats the man said coolly: "Neither water can wet nor fire can burn this cloth". Again the king and his men laughed uproariously. But when it stood the test and came out unwet and unburnt through water and fire, the man was honoured and rewarded by the emperor who had laughed at him a moment ago.

The Veda, the Upanishads, the Geeta, and the Ramayana—these books, once the laughing-stock of such great and mighty men as Lord Macaulay, have stood the test nobly and well. The Veda especially has passed through the fiery ordeal of higher criticism and come out triumphant not once but tens of times. Nihilists, Materialists, Atheists, Hermits, Sannyasis, Rationalists, Ascetics, Bhikshus, Pseudo-Vedantists, all came forward to attack the Veda, the Word of God, but to no avail. Each time that primeval Scripture of Mankind came out fresher and brighter to light up the path of man like the sun after a severely stormy dark night.

In the first issue of this Journal we showed how beautifully the Ramayana teaches us the very same harmonious culture of body, mind and soul which it is the purpose of the Veda also to teach mankind. Here in this paper we shall show how closely the Geeta too follows in the footsteps of the Veda in telling us to develop our physical, mental, moral and spiritual faculties duly and fully in a perfectly harmonious way. Before, however, we dwell on this main theme of our paper, it will not be amiss to offer a few remarks on the historic back-ground and characteristic features of the two as well as on the relation of the Geeta to the Veda. And just as the Ramayana, we saw, lends itself easily to spiritual interpretation, so Geeta too has a spiritual meaning of its own even as a part of the Mahabharata story. For, just as Ayodhya, Dasharatha, Dashamukha, Rama, Seeta, Maruti, Vali, Indrajit, Setu, Lanka, etc. in the Ramayana helped us to understand its spiritual significance, so such names in Geeta as Arjuna, Krishna, Hrishikesha, Gudakesha, Dhritarashtra, Dharmakshetra, Kurukshetra, Kaurava, Pandava, Mamaka, etc. clearly point to the fact that Geeta like Ramayana has its own spiritual significance. Here we can but briefly refer to it. Dharma-kshetra means the field which is pre-eminently fitted for the exercise of the principles of Dharma, and Kuru-kshetra, the field fit to act for mankind; these two terms clearly indicate the world and the human body. Krishna and his other names show that he represents Conscience and Reason; Krishna meaning one who draws and attracts; Govinda meaning one who possesses sight and knowledge or

In all cases the same quantity of formaldehyde was obtained in the light as in the dark. The results may be looked upon as nearly conclusive. But they seem to be in strange contrast to the results of experiments on the temperature coefficient $\left(\frac{K_{41^\circ}}{K_{31^\circ}}\right)$ which is nearly unity. This low value is most probably due to some further change undergone by formaldehyde at the higher temperature in the presence of the alkali. So far no definite evidence of such a change has been obtained, but experiments are progressing and the results will be reported in due course.

Summary

1. The reduction of aqueous solutions of carbon dioxide by means of nascent hydrogen generated by various alkali and alkaline earth metals has been investigated.

2. With sodium amalgam, potassium amalgam, calcium and barium, only formic acid is obtained, if the reaction is allowed to take place for a few hours. On prolonged reaction, however, traces of formaldehyde have also been detected.

3. Magnesium, as first found out by Fenton, reduces carbonic acid directly to formaldehyde. Experiments performed with the object of finding out the intermediate formation of formic acid in this case, fail to reveal the presence of that compound.

4. All the metals mentioned above reduce a 10% solution of formic acid to formaldehyde, fairly rapidly.

5. The sensitiveness of the method of detecting formic acid by reducing it with magnesium and afterwards testing for formaldehyde has been investigated. It is found that formic acid up to the strength of 1 in 10,000 can be easily detected by this method, using Schryver's test for the identification of formaldehyde. But the addition of hydrochloric acid along with magnesium as suggested by Ernest Waser renders the test unreliable, because even conductivity water after treatment with magnesium and hydrochloric acid, gives positive test for formaldehyde.

6. Experiments performed with the object of finding the effect of the Ultra-Violet light from a mercury vapour lamp on the reduction of carbonic acid by means of calcium and of aqueous solution of potassium bicarbonate by means of magnesium, fail to reveal any effect.

7. The temperature coefficient of the reduction of the aqueous solution of potassium bicarbonate by means of magnesium is found to be nearly unity. This indicates that the formaldehyde undergoes some further change at higher temperature in the presence of alkali. Experiments on the nature of this change are in progress and will be reported in due course.

References

1. Liebig's Annalen, 119, 251 (1861).
2. Liebig's Annalen, 135, 118, (1865).
3. Jahresbericht, S., 387, (1867).
4. Compt. rend., 70, S. 731.
5. Ber., 17, 6, (1884).
6. Monatshefte, 16, 211, (1895) and 18, 582, (1897).
7. Ber., 37, 2836, (1904).
8. J. Chem. Soc., (1907) A, II, 637.
9. Biochem, Z., 30, 432 (1911).
10. J., Chem. Soc., (1907), 687.
11. Proc. Camb. phil. Soc., (1908), 14, 385.
12. Zeit physiol. Chem., (1917), 99, 67, 85.
13. Zeit anal. Chem., (1897), 36, 18.

TABLE VI.

Temperature 41°C.

Depth of the unknown solution in the calorimeter.	Depth of the standard solution.	Strength of the standard solution in 1 cc.	Strength of the unknown solution, dark as well as illuminated.
15	22	$4{\cdot}31 \times 10^{-7}$	$2{\cdot}94 \times 10^{-7}$
20	29	$4{\cdot}31 \times 10^{-7}$	$2{\cdot}91 \times 10^{-7}$
25	37	$4{\cdot}31 \times 10^{-7}$	$2{\cdot}91 \times 10^{-7}$
			Mean $2{\cdot}92 \times 10^{-7}$

From the above, temperature coefficient of the above-mentioned reaction works out to be

$$\frac{K_{t+10}}{K_t} = \frac{K_{41^\circ}}{K_{31^\circ}} = \frac{2{\cdot}92 \times 10^{-7}}{3{\cdot}08 \times 10^{-7}} = 0{\cdot}94.$$

Discussion

The experiments on the reduction of carbonic acid with sodium, potassium, lithium, barium and calcium, of which the results are stated in Tables (I) and (III) lead to the conclusion that in all these cases only formic acid is produced, if the reaction is allowed to take place for a few hours only. But the action of the same metals on 10% formic acid which results in the formation of detectable quantities of formaldehyde within two to three hours, (vide Table II) makes it highly probable that the prolonged action of these metals on simple carbonic acid might also lead ultimately to the same result, i.e. the formation of formaldehyde. Experiments carried out with the calcium metal (vide Table III), show that such is actually the case. The action of about 10 grms. of this metal on 500 cc. of conductivity water through which a current of CO_2 was passing for about 37 hours, led to the detection of traces of formaldehyde by means of the Schryver's test. The action of magnesium in this respect, as found out first by Fenton,[8] is peculiar and still remains unexplained. It reduces carbonic acid directly to formaldehyde. Experiments, performed with the object of discovering the intermediate formation of formic acid, revealed, at the most, only traces of this substance, (vide series of experiments No. 3). Obviously, the course of this reduction is determined by many factors, of which the most important are (1) the nature of the metal which produces the nascent hydrogen, (2) the temperature and (3) the P_h value of the solution. It is very likely that the last factor which has so far been least investigated, may prove to be the most effective in determining the nature of the products. Further investigations on this point are in progress and will be reported in due course. Mention may be made in this connection, of an interesting fact discovered during these investigations. According to Ernest Waser [12] formic acid in dilute solutions may be detected by allowing magnesium and hydrocholoric acid to act on the given solution and testing for formaldehyde. This method of detecting formic acid is extremely unreliable as it has been found that even conductivity water alone when acted upon by magnesium and hydrochloric acid for a very short time gives detectable quantities of formaldehyde.

Regarding the effect of light on these reductions two series of experiments were performed, one with magnesium and the other with calcium. In both cases negative results were obtained. The experiments with magnesium and aqueous solution of potassium bicarbonate were performed with particular care and repeated several times,

by a felt-covered vessel. The outer beaker contained 500 cc. of conductivity water, through which was passed a current of CO_2 for about 6 hours. 10 grams. of calcium metal were added to this beaker in small portions at a time. During the experiment the temperature of the solution did not rise above 33°C. At the end of the experiment the solution was filtered, distilled and the distillate tested with the Schryver's reagent. No indication of formaldehyde was obtained. The remaining solution after being acidified with phosphoric acid and distilled in steam was tested quantitatively with alkaline permanganate. A control experiment performed under the same conditions, but in the dark, showed the same amount of formic acid. These experiments lead to the conclusion that Ultra-Violet light had apparently no effect on the velocity or the course of this reduction.

Experiments (7).

In these experiments the effect of Ultra-Violet light and the temperature coefficient were determined at one and the same time. The reaction chosen for the purpose was the reduction of an aqueous solution of potassium bicarbonate by means of magnesium. This was done to avoid complications due to the change of pressure in the case of aqueous solutions of carbon dioxide. The apparatus set up for the purpose is shown in the figure. Two flasks of equal capacities one of which was made of quartz and the other of pyrex glass, coated black from outside, were placed in a small thermostat, through which water at a constant temperature was kept circulating by means of a centrifugal pump. A parallel beam of light from a mercury vapour lamp after passing through the quartz window of the thermostat fell on the quartz flask containing the re-actants. 100 cc. of 1 per cent. solution of potassium bicarbonate were placed in each of the two flasks and exactly two grams of magnesium were added. The flasks were connected by means of glass and rubber tubings to small Erlenmeyer flasks, placed outside and containing 40 cc. of water which acted as a seal. After the expiry of 4 hours the amount of formaldehyde in each case was estimated with the help of a standard solution of formaldehyde. For this purpose a colorimeter of a Duboscq type, made by the Klett manufacturing company was employed. Standard formaldehyde solution was prepared by Romijin's[13] method. This was done by taking 10 cc. of formaldehyde solution of the approximate strength 1 in 1,000, adding to it 25 cc. of standard iodine solution and then a few drops of a 10 per cent. sodium hydroxide solution till the solution became yellow. After 10 minutes 1 cc. of pure concentrated hydrochloric acid was added and the liberated iodine titrated against N/10 sodium thiosulphate solution.

The experiments were first performed at 31°C. and afterwards at 41°C. The results are given below. The illuminated and the dark solution produced the same amount of formaldehyde in each case. The strength indicated in the last column of the following table, therefore, applies to the solution kept in the dark as well as to that illuminated by Ultra-Violet light.

TABLE V.

Temperature 31°C.

Depth of unknown solution in the calorimeter.	Depth of the standard solution.	Strength of the standard solution in 1 cc.	Strength of the unknown solution, dark or illuminated.
15	21	$4{\cdot}31 \times 10^{-7}$	$3{\cdot}08 \times 10^{-7}$
20	28	$4{\cdot}31 \times 10^{-7}$	$3{\cdot}07 \times 10^{-7}$
25	35	$4{\cdot}31 \times 10^{-7}$	$3{\cdot}08 \times 10^{-7}$
			Mean $3{\cdot}08 \times 10^{-7}$
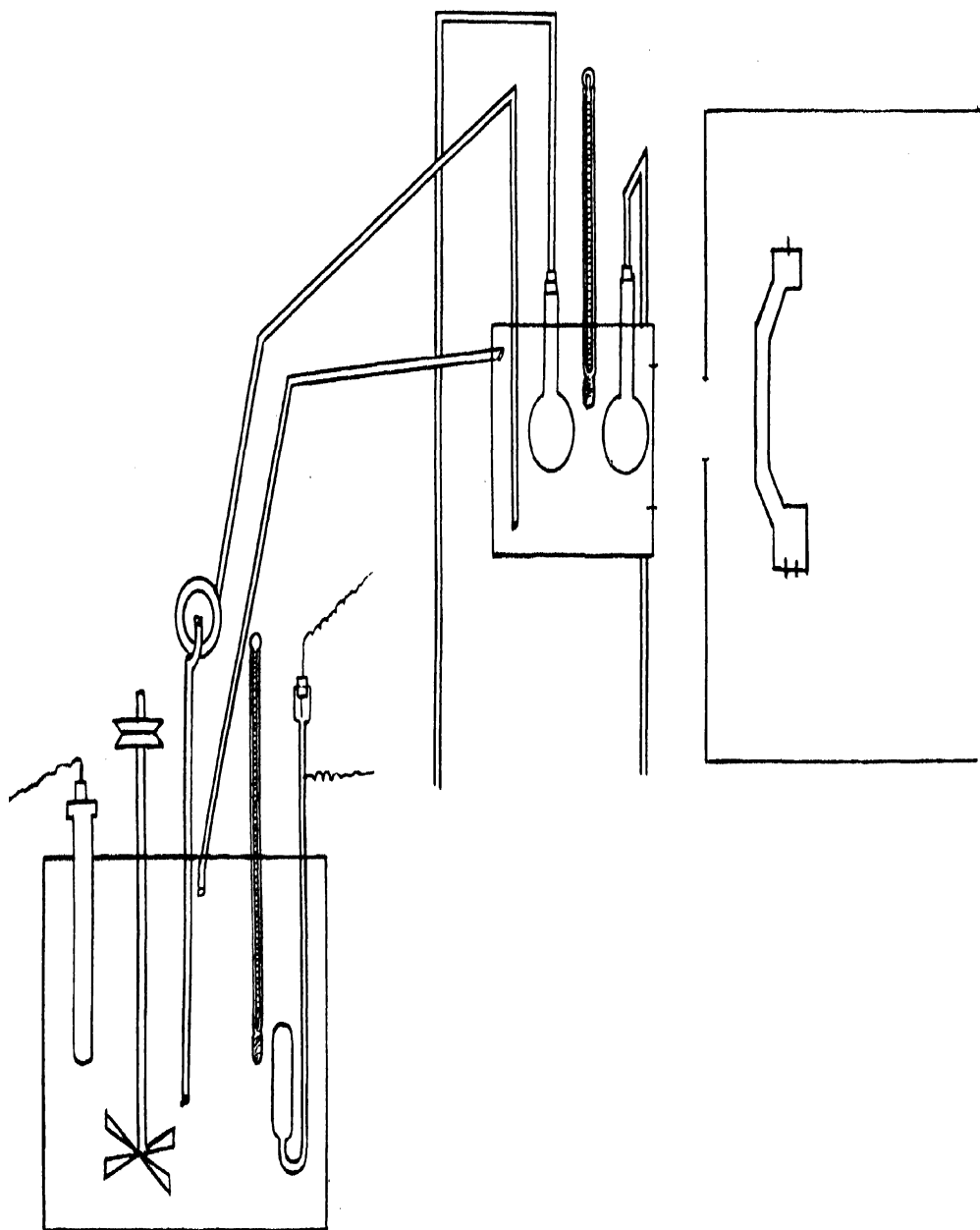
FIG

Experiments (5).

In the method for the detection of formic acid given by Ernest Waser[12] the solution under examination is treated with magnesium and hydrochloric acid for some time and then tested for formaldehyde. Experiments were performed to test the sensitiveness of this test. The results indicate that a solution of formic acid of the strength of 1 in 10,000 after being acted upon by magnesium in the absence of hydrochloric acid for an hour and a half gives a pink coloration with Schryver's reagent. Solutions weaker than these do not give test for formaldehyde unless hydrochloric acid had been added along with magnesium. But the most striking thing about this test is that even conductivity water after a few minutes treatment with magnesium and hydrochloric acid gives an immediate coloration with the Schryver's reagent. This means that E. W. Waser's test for formic acid is valid only in the absence of hydrochloric acid and in that case too its sensitiveness does not go beyond 1 in 10,000. The presence of hydrochloric acid renders the test doubtful and unreliable.

TABLE IV

Serial No.	Experiments	Duration of raction	Results.
1	50 cc. of 1/1000 formic acid + 1 grm. magnesium.	1½ hours.	Gives good pink coloration with Schryver's reagent at once.
2	50 cc. of 1/10,000 formic acid + 1 grm. magnesium.	1½ hours.	Gives pink coloration with Schryver's reagent.
3	50 cc. of 1/100,000 formic acid + 1 grm. magnesium.	4 hours.	Gives pink coloration after 15 minutes.
4	50 cc. of 1/50,000 formic acid + 1 grm. magnesium.	4 hours.	No pink coloration even after 15 minutes.
5	50 cc. of cond. water + 1 grm. magnesium.	4 hours.	No formaldehyde.
6	50 cc. of cond. water + 1 grm. magnesium + 1 cc. hydrochloric acid.	2 hours.	Filtrate gives immediate pink coloration with Schryver's reagent.
7	50 cc. of cond. water + 1 gram magnesium.	24 hours.	No formaldehyde.
8	50 cc. of saturated solution of CO_2 + 1 grm. magnesium	45 minutes.	Only traces of formaldehyde.
9	50 cc. of saturated solution of CO_2 + 1 grm. magnesium + 1 cc. hydrochloric acid.	1 hour.	Only traces of formaldehyde.
10	50 cc. of cond. water + 1 grm. magnesium + 1 cc. hydrochloric acid.	5 minutes.	Immediate pink red coloration.
11	Do. do. do.	2 minutes.	Do. do.
12	Do. do, do.	1 minute.	Do. do.

Experiments (6).

In these experiments the effect of Ultra-Violet radiations on the reduction of carbonic acid by means of calcium were investigated. For this purpose a vertical quartz mercury vapour lamp of immersion type manufactured by Hanovia Company was employed. The lamp consumed 3 amps. at 80 volts D.C. Surrounding this lamp was a jacket of quartz through which a stream of cold water was kept running. The whole dipped into the aqueous solution of carbonic acid placed in a quartz beaker surrounded

Experiments (2).

Fenton[8] had shown that formic acid is immediately reduced by magnesium to formaldehyde. It was interesting to know also the behaviour of other metals with formic acid. For this purpose a 10% solution of formic acid was treated with sodium amalgam, potassium amalgam, calcium and barium metals, for a length of time and the solutions tested for formaldehyde. The results are given below :—

TABLE II.

Serial No.	Experiments	Duration of reaction	Results
1	37·2 grms. sodium amalgam + 50 cc. of 10% formic acid.	3 hours.	Positive test for formaldehyde.
2	18·grms. potassium amalgam + 50 cc. of 10% formic acid.	,,	,, ,,
3	1·7 grms. calcium metal + 50 cc. of 10% formic acid.	,,	,, ,,
4	1·7 grms of barium metal + 50 cc. of 10% formic acid	,,	,, ,,

Experiments (3).

Fenton[8] had shown that when magnesium acts upon an aqueous solution of carbon dioxide, formaldehyde is formed. The object of this investigation was to know if formic acid is produced as an intermediate product in this reaction. For this purpose a number of experiments were performed which differed from one another with regard to duration and the temperature of the reaction. In no case any sure test for formic acid was obtained.

Experiments (4).

These experiments were conducted with the object of finding if the prolonged action of calcium metal on aqueous solution of carbon dioxide gives rise to formaldehyde in addition to formic acid, whose formation has already been confirmed (vide Table I). These experiments are successful inasmuch as they give a sure indication of the formation of formaldehyde in small quantities after the reduction has been conducted for about 30 hours. The methods of testing for formaldehyde and formic acid where the same as described before. The solution after being filtered was distilled and the distillate tested for formaldehyde. The solution remaining in the flask was then acidified with phosphoric acid and the whole distilled in steam. The distillate was tested for formic acid by Fincke's[10] method, i.e. by adding a solution of mercuric chloride when a ppt. of mercurous chloride indicated the presence of formic acid.

The results are given below .—

TABLE III

Serial No.	Experiments	Duration of reaction	Results
1	10 grms. calcium + 750 cc. cond. water + CO_2	29 hours.	Traces of formaldehyde detected, negative tests for carbohydrates and reducing sugars. Positive test for formic acid.
2	8 grms. calcium + 250 cc. cond. water + CO_2	32 hours.	Traces of formaldehyde detected. Negative test for carbohydrates and reducing sugars, formic acid found in relatively greater amount.
3	7·5 grms. calcium + 500 cc. cond. water + CO_2	37 hours.	Positive test for formaldehyde and formic acid. No carbohydrates.

The investigations mentioned above indicate that in the case of sodium, potassium and barium amalgams only formic acid is produced, whereas in the case of magnesium formaldehyde alone is formed, apparently without the intermediate formation of formic acid. These results, when carefully considered, give rise to the following qnestions.

(1) What other metals besides magnesium can reduce carbonic acid to formaldehyde?

(2) Is formic acid or any other compound produced along with formaldehyde in such cases?

(3) What is the effect of light on this reaction?

(4) How is this reaction influenced by acids, bases and salts?

(5) What is the effect of temperature?

The present investigation of which the results are given below was undertaken with the object of finding satisfactory answers to the above questions. In the following experiments Kahlbaum and Merck's chemicals were employed. In some cases the reagents were specially prepared in the laboratory. All solutions were prepared with twice-distilled conductivity water. Carbon dioxide was obtained by the action of hydrochloric acid on marble and purified by passing through chromic acid and conductivity water. No grease was employed on the joints of wash-bottles. The following methods were adopted for the detection of the various compounds :—

(1) Schryver's test for formaldehyde. For this test 10 cc. of the solution were taken in a test tube and to this were added 2 cc. of a 1% freshly prepared solution of phenylhydrazine hydrochloride and 1 cc. of 5% freshly prepared solution of potassium ferricyanide, and 3 cc. of pure hydrochloric acid (sp. gr. 1126). In the presence of formaldehyde to the extent of 1 in 10^7, a pink colour is formed immediately.

(2) Alkaline solution of potassium permanganate, Tollen's reagent and Fincke's[10] test for the detection of formic acid.

(3) Molisch test for carbohydrates.

(4) Fehling and Benedict's solutions for reducing sugars.

Experimental.

Experiments (1).

The object of this series of experiment was to find out if formaldehyde was also produced along with formic acid, when alkali and alkaline earth metals act upon carbon dioxide in aqueous solution. For this purpose a current of carbon dioxide was passed through conductivity water taken in the flask, to which portions of the amalgams of the metals were added from time to time. At the end of the experiment the contents of the flask were filtered, the filtrate distilled, and the distillate was tested for formaldehyde, while the solution remaining in the flask was examined for formic acid after acidification with phosphoric acid and distillation in steam. The results are stated below:—

TABLE I.

Serial No.	Experiments	Duration of reaction	Results
1	50·5 grms. of potassium amalgam in 100 cc. conductivity water + CO_2	4½ hours.	Negative test for formaldehyde and positive test for formic acid.
2	48·6 grms. of sodium amalgam in 100 cc. of cond. water + CO_2	,,	,, ,,
3	2·4 grms. of calcium metal in 100 cc. cond. water + CO_2	,,	,, ,,
4	50 grms. of lithium amalgam + 100 cc. cond. water + CO_2	,,	,, ,,
5	2·4 grms. of barium metal in 100 cc. cond. water + CO_2	,,	,, ,,

"THE REDUCTION OF CARBONIC ACID BY MEANS OF NASCENT HYDROGEN."

BY

M. Qureshi and N. H. Effendi.

THE problem of the reduction of carbonic acid by means of nascent hydrogen has a great interest for the chemists both from the theoretical and practical points of view, particularly in view of the fact that this laboratory reaction has some bearing on the natural process of the reduction of carbon dioxide that takes place in the plants under the influence of the solar radiations. It may be recalled here that Von Baeyer, while advancing his famous hypothesis concerning Photosynthesis in 1870, postulated the existence of hydrogen in the leaf, as a condition necessary for the reduction of carbon-monoxide to formaldehyde. Although later hypotheses have discarded the original idea of Baeyer concerning the production of hydrogen in the plants during the process of assimilation, the question cannot be regarded as finally settled at this stage. It is still highly interesting to investigate all the possible manners in which carbonic acid is reduced by means of nascent hydrogen under different conditions. Even though ultimately this laboratory reaction may not be found to have any counterpart in the natural process, the investigations might yield other results of theoretical and practical importance.

As far back as 1861, Kolbe and Schmidt[1] had observed that formic acid was produced by the reduction of carbonic acid by means of nascent hydrogen in the presence of alkalis. Later, Maly[2] performed a number of experiments in which carbonic acid and hydrogen were prepared simultaneously by the action of acid on marble and zinc. No formic acid was detected. When, however, sodium amalgam reacted with $(NH_4)_2\ CO_3$ solution or when warm KOH reacted with zinc and zinc carbonate, formic acid was produced. Dupre[3] found that zinc and carbonic acid in aqueous solution did not produce formic acid. Royer[4] observed that when nitric acid in the porous cell of a Bunsen's battery was replaced by distilled water and a stream of carbon dioxide passed through it, formic acid was formed. Ballo[5] found that bicarbonates of sodium, potassium and calcium in aqueous solutions were reduced to formates by the action of sodium and potassium amalgams. Platinised magnesium did not yield formic acid. Lieben[6] carried this investigation further by employing different metals in the presence of various metallic salts. Sodium amalgam, potassium amalgam and barium amalgam gave rise to formate with and without the presence of salts. Aluminium amalgam alone did not reduce, but in presence of salts such as sodium phosphate, potassium sulphate, sodium-carbonate, etc. formic acid was produced in more or less quantities. Magnesium or platinised magnesium gave only traces of formic acid, even though sodium phosphate was present in the solution. He also found that light had no effect on the reduction. Coehn and Jahn[7] made an extended study of this reduction by the electrolytic method by varying the nature of the salt electrolysed and the electrode. The best results were obtained with a cold saturated solution of $K_2\ SO_4$ using an amalgamated zinc cathode. No formaldehyde was obtained. Normal carbonates or carbon dioxide in presence of strong acids gave negative results. From this they concluded that formic acid was formed by the reduction of HCO_3 ions. Fenton[8] made the important discovery that when magnesium was used in the form of a rod or powder, both formic and carbonic acid-were reduced to formaldehyde, the carbonic acid doing so apparently without passing through the formic acid stage. This was the stand of the subject in 1909 at the time of the appearance of the paper by Fenton referred to above, and as far as the present authors are aware, nothing important has since been contributed to the subject except perhaps the observations of Stoklasa and Zdobnicky[9] according to which formaldehyde is obtained when aqueous carbon dioxide is subjected to Ultra-Violet radiations in the presence of nascent hydrogen and potassium hydroxide.

The statistics of this Icelandic cataclysm are fearful, the lava outflow covering an area of 18 square miles, and over 200,000 head of cattle, horses and sheep being destroyed.

I do not know whether any records of a more scientific nature were kept than those of Benjamin Franklin and Gilbert White, but after a much less intense eruption in Iceland, in 1875, the ashes were falling on the coast of Norway in less than twelve hours and in Stockholm in fifteen hours.

The 1783 eruption, and the accompanying climatic aberrations which clearly and deeply stirred the child-mind of Coleridge, are referred to in many places, especially in the Letters of Horace Walpole, who actually felt the shaking of the earth in his home near London. There is nothing curious, then, in the fact that this catastrophic and world-wide volcanic upheaval, so destructive in the islands of Japan, Sicily, and Iceland, and so ominously synchronizing with the beginnings of the European political upheaval, which was for long such a terrible obsession in England, should have been one of the main factors in the production of a poem whose strange suggestiveness has for over a century exercised such fascination over readers of English Poetry.

As Mr. T. S. Eliot has pointed out: 'The ways in which the passions and desires of the creator may be satisfied in the work of art are complex and devious. In a painter they may take the form of a predilection for certain colours, tones, or lightings; in a writer the original impulse may be even more strangely transcendental.'

We may safely say that the ways in which the poet responds to the emotion caused by awe-inspiring celestial phenomena are even more complex and devious, and may even be so abnormal as to produce effects which are unique. In addition to tone-colour or rhythm we must include unprecedented locutions and allocations; the erratic is likely to be prominent, and if the poem be of a longer kind we are likely to have lapses from the ecstatic into the commonplace, which is quite in accordance with Coleridge's own theory of poetry, and is also characteristic of *The Ancient Mariner*.

When all other explanations of the poem are given a hearing, what is still mysterious is just this rare emotional effect which the memory of a startling cosmic experience would be likely to induce. It was no brief experience: it was repeated the whole summer and autumn, and was followed by a winter of whose severity we can read in contemporary letters and diaries.

Do we not feel in reading *The Ancient Mariner* an intensity over and above that which we derive from the incidents? Something deeper and of another kind than that in any ballad poetry but such salient poems as Sir Patrick Spens?

Francis Bacon in his *Silva Silvarum* wrote a sentence which might be taken as the warrant of much of later scientific procedure:

'It is therefore a subject of a very noble enquiry, to enquire of the more subtle perceptions.'

This enquiry has in recent times been extended to the rhythm of speech, which in the physics laboratory is likely to reveal curious and meaningful reactions, whereby much that is dimly perceptible to transient consciousness may assume conformation as easily measurable, shall we say, as the chemical changes of the blood under various kinds of excitement. It is there we are likely to discern to what extent *The Ancient Mariner*, quite apart from its direct references, is indebted to the terrible events of 1783.

What Mr. Harold Nicolson has finely said of Swinburne's *Atalanta in Calydon*, that it is an event in the ~~history of~~ mind, is just as true of *The Ancient Mariner*.

Fortunately we had in England in Gilbert White a conscientious and vivid chronicler of meteorological changes; and in his *Natural History of Selborne* there is more than one reference to the events of 1783. In Letter 66 he says:

'The summer of the year 1783 was an amazing and portentous one, and full of horrible phenomena; for, besides the alarming meteors and tremendous thunderstorms that affrighted and distressed the different counties of this kingdom, the peculiar haze of smokey fog, that prevailed for many weeks in this island, and in every part of Europe, and even beyond its limits, was a most extraordinary appearance, unlike anything known within the memory of man. By my journal I find that I had noticed this strange occurrence from June 23 to July 20 inclusive, during which period the wind varied to every quarter without making any alteration in the air. The sun, at noon, looked as blank as a clouded moon, and shed a rust-coloured ferruginous light on the ground and floors of rooms; but was particularly lurid and blood-coloured at rising and setting. All the time the heat was so intense that butchers' meat could hardly be eaten on the day after it was killed; and the flies swarmed so in the lanes and hedges that they rendered the horses half frantic. The country people began to look with a superstitious awe at the red, louring aspect of the sun; and indeed there was reason for the most enlightened person to be apprehensive; for, all the while, Calabria and part of the Isle of Sicily were torn and convulsed with earthquakes, and about that juncture a volcano sprang out of the sea on the coast of Norway.'

By Norway he evidently means Iceland.

He also speaks of the myriads of wasps that year and the slimy substance, which with innumerable black aphides, or smother-flies, ruined his honeysuckles.

Coleridge was born in 1772 and so would be likely to remember such impressive phenomena, which have left their clear traces in *The Ancient Mariner*, in such verses as these:

All in a hot and copper sky,
The bloody sun, at noon,
Right up above the mast did stand,
No bigger than the moon.

* * * *

The very deep did rot: O Christ!
That ever this should be!
Yea, slimy things did crawl with legs
Upon the slimy sea.

The psychology and atmosphere of *The Ancient Mariner* have always been a puzzle to me; no ordinary account of Coleridge and his life seeming adequate to explain its unique nature. But if it was conceived and written in the memory of such an appalling derangement of nature it becomes easier to understand.

Now before I went further into the matter I greatly enjoyed fancying that the awful eruption of Asama in 1783 was the cause of these strange happenings in Europe, just as Krakatoa a century later filled me with romantic thoughts through the wonderful sunsets I saw looking across the valley to the home of the Brontes in Airedale. Even now I have not given up the belief that Asama had a share in it, though I have come to learn that vast as was the devastation of that mountain's outburst, it has far exceeded by that of the Skaptar Jokul in Iceland, whose eruptions did not cease for two years. The first and greater eruption of Asama took place on June 24th, a day later than the beginning of Gilbert White's observations. The lava outflow of the crater of Skaptar Jokul took place on June 11th.

Concerning this, Prof. Omori kindly sent me the following quotation from Lyell's Principles of Geology:

'About a month previous to the eruption of Skaptar Jokul, a submarine volcano burst forth in the sea at a distance of 30 miles in a south-west direction from Cape Reykjanaes, and ejected so much pumice that the ocean was covered with that substance to a distance of 150 miles, and ships were considerably impeded in their course. A new island was formed, from which fire, smoke and pumice were emitted at different points. This island was claimed by his Danish Majesty, who denominated it Nyoe, or New Island; but before a year had elapsed the sea resumed its ancient domain, and nothing was left but a reef of rocks from five to thirty fathoms under water.'

'Hence the surface was early frozen. Hence the first snows remained on it unmelted, and received continual additions. Hence the air was more chilled, and the winds more severely cold. Hence perhaps the winter of 1783-4 was more severe than any that had happened for many years.

'The cause of this universal fog is not yet ascertained. Whether it was adventitious to this earth, and merely a smoke proceeding from the consumption by fire of some of those great burning balls or globes which we happen to meet with in our rapid course round the sun, and which are sometimes seen to kindle and be destroyed in passing our atmosphere, and whose smoke might be attracted and retained by our earth; or, whether it was the vast quantity of smoke long continuing to issue during the summer from Hecla in Iceland, and that other volcano which arose out of the sea near that island, which smoke might be spread by various winds over the northern parts of the world, is yet uncertain.'

With this clue in hand I began to search for evidence in literature of this remarkable climatic aberration. It came, of course, a little too early for the Romantic poets to have seized upon it, though some of them experienced it in their childhood. Blake was 26 years old at the time, and it is quite probable that in his prophetic books of a decade later there are reflections of the impressive visions of 1783. A very curious fact is that Scott, who was only 12 at the time of the strange fog, had already written the following piece the previous year, treasured by his mother as his first writing :

In awful ruins Etna thunders nigh,
And sends in pitchy whirlwinds to the sky
Black clouds of smoke, which, still as they aspire,
From their dark sides there bursts the glowing fire ;
At other times huge balls of fire are toss'd.
That lick the stars and in the smoke are lost :
Sometimes the mount, with vast convulsions torn,
Emits huge rocks, which instantly are borne
With loud explosions to the starry skies,
The stones made liquid as the huge mass flies,
Then back again with greater weight recoils,
While Etna thundering from the bottom boils.

It does not detract from the prophetic nature of these lines to say that they are a translation, and a very good translation for a boy of eleven, from the third book of the *Æneid.*

But it is in Cowper's *Task*, published in 1785, that we meet with direct reference to the various disasters of 1783. At the beginning of the second book occur these lines.

When were the winds
Let slip with such a warrant to destroy ?
When did the waves so haughtily o'erleap
Their ancient barriers, deluging the dry ?
Fires from beneath and meteors from above,
Portentous, unexampled, unexplained,
Have kindled beacons in the skies, and the old
And crazy earth has had her shaking fits
More frequent, and foregone her usual rest.
Is it a time to wrangle, when the props
And pillars of our planet seem to fail,
And Nature with a dim and sickly eye
To wait the close of all ?

What a contrast all this makes with the calm stoicism of the younger Pliny in those wonderful letters in which he describes the great eruption of Vesuvius, letters whose disciplined Latin speech has to be translated into some other tongue before we can feel the tremor and the fright of those awful days and nights.

like a living seismograph in that land of rapid barometric changes, of sudden and appalling thunderstorms, floods, tidal waves and constant earth-tremors. In July 1921, two years before the Great Earthquake, I wrote in a Tokyo journal:

"There are signs of disaster of a volcanic nature brewing in the bowels of the earth, as this ominous summer goes by. First we had the report that certain of the Swiss lakes were drying up; now come telegrams telling of protracted heat in England and France. These things were long ago recognized as signs of great disturbance of the earth's surface; Pausanias enumerated them and Sir J. G. Frazer has translated his words as follows. 'The heavy rains or long droughts, in winter the sultry weather, in summer the haze through which the sun's disc looms red and lurid, the sudden gusts, the springs of water drying up, the rumbling noises under ground.' A beginning has been made by the eruptions of Tarumai and Asama; but we are assured that Japan is not likely to be the scene of a great volcanic outburst. Where it will be no one can tell; in previous years of catastrophe Stromboli, Asama, Hekla, Krakatoa, Martinique, Mauna Loa and Sakurajima have taken turns to terrorize the world. It may be that the disturbance proves to be seismic, not volcanic."

The last evening I was in Japan I was dining with Prof. Omori, the famous seismologist and Dr. Miura, the Emperor's private physician, and I said to them: 'A great disaster is coming, and very soon; I have felt it approaching all the year.' For we had had many shocks, thirty-seven in one night, and once a strange leaping of the earth.

But Prof. Omori laughed and said: 'There is no use in arguing with a poet.'

All the same, it was with an unaccountably deep sadness that I left Japan, bearing with me a precious gift from him of his six-volume study of the awful outburst of Sakurajima, whose lava-bombs I had often handled in his laboratory.

A week after I left Tokyo for India in May 1923, Prof. Omori left for Australia, and on that fatal first of September he was actually looking at the seismometer in the University of Sydney, when it went out of order, as the result of the earthquake in Japan. He hurried home, and I can imagine his distress on realizing that he was not at his usual post to assist during the disaster. A few days after his arrival in Japan I received a cable to say that he had died from lesion of the brain.

In one conversation with Professor Omori, I was more than interested to hear him say that the great eruption of Asama, a constantly active volcano about ninety miles from Tokyo, in the summer of 1783, by which the lava beds were produced, may have had an influence on the climate of Europe in that and the following years. Remembering the deep impression made upon me in my childhood by the sunsets which the dense belt of ashes thrown round the world by the great eruption of Krakatoa caused, I was not surprised. For having spent two summers in Karuizawa under Asama, when eruptions were frequent and sometimes fatal, and having day and night watched with fascination those huge columns slowly rising to a height of several miles to be slowly borne ocean-ward by the westerly winds, I knew that an intensification and prolongation of them would be enough to cause the formation of a similar belt of fine ash, reaching at any rate over a large portion of the world's circumference.

The origin of Dr. Omori's suggestion I found in certain *Meteorological Imaginations and Conjectures* by Benjamin Franklin, in a letter of May 1784, which read as follows:

'During several of the summer months of the year 1783, when the effect of the sun's rays to heat the earth in these northern regions should have been the greatest, there existed a constant fog over all Europe. This fog was of a permanent nature; it was dry, and the rays of the sun seemed to have little effect towards dissipating it, as they easily do a moist fog arising from water. They were rendered so faint in passing through it, that when collected in the focus of a burning-glass they would scarce kindle brown paper; of course their summer effect in heating the earth was exceedingly diminished.

A.E., from a mind nourished on Indian thought, has spoken of this harmony as an ideal:

'We shall be repulsed perpetually until we have made perfect in ourselves those elements out of which both we and the universe are fashioned and which, made pure, will relate us to the vaster life of the cosmos.'

Man, by association with man, learns to repeat himself; by association with Nature, he is renewed and learns fragments of the secret of the world, and can say with Swinburne:

'My song is in the mist that hides thy morning,
My cry is up before the day for thee.'

In the most memorable poetry of Coleridge and his friend Wordsworth we have some of the supreme examples of this recognition of our dependence upon what the world has been pleased to regard as subhuman forces,—dependence not only for our physical being, but for the welfare of the soul. Many of these passages are the treasures of memory with lovers of poetry,—such as Wordsworth's:

'I held unconscious intercourse with beauty
Old as creation.'

'The floating clouds their state shall lend
To her; for her the willow bend;
Nor shall she fail to see,
Even in the motions of the storm,
Grace that shall mould the maiden's form
By silent sympathy.
The stars of midnight shall be dear
To her; and she shall lean her ear
In many a secret place
Where rivulets dance their wayward round,
And beauty born of murmuring sound
Shall pass into her face.'

In these passages, I hold, the secret of the incantation of poetry is revealed, transmitted directly from the external world to the poet who is, as Coleridge himself says:

To the influxes
Of shapes and sounds and shifting elements
Surrendering his whole spirit, of his song
And of his fame forgetful! so his fame
Should share in Nature's immortality,
A venerable thing! and so his song
Should make all Nature lovelier, and itself
Be loved like Nature!

If asked to name one poem among the rich legacy of the Romantic poets of England which bears most lastingly this inexplicable sense of incantation, I think I should choose Coleridge's *Ancient Mariner*.

Much of Wordsworth, and of Coleridge, too, is linked with thoughts which have been powerfully expressed in prose, especially in German philosophy.

The *Ancient Mariner* throbs with something very different: it is uncanny, and seems to be the result of some great disturbance of feeling not to be explained by the usual account of its genesis.

It was when I was in Japan, that by accident I discovered what I take to be the clue to the unique emotional effect of this poem.

In that country I had constant experience of the impressive influence on the mind of natural forces which man can do little to counteract. During the years I was lecturing in the Imperial University of Tokyo I never felt safe. My body had become

books were written which above all I know reveal the power to recognize a higher station of consciousness for man in the vision of the universe. One is Herman Melville's *Moby Dick*, a truly epic work primarily depicting the soul of man with the immensity of the Pacific as background. It is one of the great books of the world, unparalleled in description of the force and beauty of the ocean. Written during the heyday of the American Transcendental movement it was long neglected. Now it has been made easily accessible and our younger critics are enthusiastic about it, declaring that everything Melville mentions is touched with light and that to read *Moby Dick* and absorb it is the crown of one's reading life.

Here is one passage, part of an account of the Pacific Ocean which led Conrad to write a similar one on the Mediterranean :

> 'That serene ocean rolled eastwards from me a thousand leagues of blue.
>
> There is one knows not what sweet mystery about this sea whose gently awful stirring seem to speak of some hidden soul beneath. And meet it is, that over these sea-pastures, wide-rolling, watery prairies, and Potter's Fields of all four continents, the waves should rise and fall, and ebb and flow unceasingly ; for here, millions of mixed shades and shadows, drowned dreams, somnambulisms, reveries,—all that we call lives and souls, lie dreaming, dreaming, still ; tossing like slumberers in their beds ; the ever-rolling waves but made so by their restlessness.'

Seven years ago I edited for Messrs. Longmans a school edition of Richard Jefferies' *The Story of My Heart*, another great book of the nineteenth century, thinking that Indian undergraduates would enjoy making acquaintance with a spirit that felt itself so much one with Nature and intensely longed to share the life of the sun, the sea and the air. The book is one long prayer for the larger life.

> 'I was utterly alone with the sun and the earth. Lying down on the grass, I spoke in my soul to the earth, the sun, the air, and the distant sea far beyond sight. I thought of the earth's firmness —I felt it bear me up ; through the grassy couch there came an influence as if I could feel the great earth speaking to me. I thought of the wandering air—its pureness, which is its beauty ; the air touched me and gave me something of itself. I spoke to the sea : though so far, in my mind I saw it green at the rim of the earth and blue in deeper ocean ; I desired to have its strength, its mystery and glory. Then I addressed the sun, desiring the soul equivalent of his light and brilliance, his endurance and unwearied race. I turned to the blue heaven over, gazing into its depth, inhaling its exquisite colour and sweetness. The rich blue of the unattainable flower of the sky drew my soul towards it, and there it rested, for pure colour is rest of heart. By all these I prayed ; I felt an emotion of the soul beyond all definition ; prayer is a puny thing to it, and the word is a rude sign to the feeling, but I know no other.'

This book, which is the counterpart in prose to much of the best of Wordsworth, Shelley and Swinburne, has had a much wider influence than is generally recognized, and has helped to intensify the sense of kinship with Nature—to revive the love of outdoor life which the Romantic poets brought about during the Napoleonic wars, and to which Carlyle referred in his study of Shakespeare :

> 'It is Nature's highest award to a true simple great soul, that he get thus to be *a part of herself*. Such a man's works, whatsoever he with utmost conscious exertion and forethought shall accomplish, grow up withal unconsciously, from the unknown deeps in him ;—as the oak-tree grows from the Earth's bosom, as the mountains and waters shape themselves ; with a symmetry grounded on Nature's own laws, conformable to all Truth whatsoever.'

I have long been convinced that the final and supreme criterion of poetry is *ascension*, a rising from appearance to higher meaning, a transfiguration of the familiar by arresting and mysteriously chosen expression. 'Suddenly, in a song, in a sonnet, in a speech,' says Sir Henry Newbolt, "the words, though simple in themselves, are felt to be ranged in a magical order, and to convey an emotion that is beyond their intellectual meaning."

How this is done may be felt but not told ; but I cannot help feeling that the finest passages in imaginative literature owe their beauty to subtle harmony with forces outside the self of the writer, with his greater self which we call Nature.

Rabindranath, in his beautiful modern paraphrase of Kabir, has given a world-wide public access to one of the classical instances of this recognition of the relation between the soul and the cosmos.

> What a wonderful lotus it is that blooms at the heart of the spinning wheel of the Universe!
>
> Receive the waves in your body. What splendour is in the region of the sea!
>
> Where the rhythm of this world rises and falls, thither my heart has reached. There the hidden banners are fluttering in the air.

And Rabindranath himself is steeped in this sea of cosmic emotion:

> 'Never before had these two witnessed such a dawn. Never before had the light touched them in such a way. For the first time they realised that the sky is not empty, but gazes, filled with a silent joy of wonder, at each fresh unfolding of creation. The consciousness of each of them was so stimulated that it also became alive to its own close touch with the grand consciousness underlying the universe. And so it was that neither of them could utter a word.'

But it is remarkable that Western criticism has ignored this relation except when under the influence of Eastern thought, as in the momentous examples of Emerson and A.E. This larger aspect of Emerson moved Francis Thompson to refer to him as 'a great eagle, sailing in noble and ample gyres, with deliberate beat of the strong wing, round the eyrie where his thought is nested.'

And A.E. in his creative and critical writing always maintains conscious association with what he calls the ethereal currents. He believed that 'we and all things swim in an ether of deity.' He thus bears out what was said nearly a century ago by James Martineau;

> 'That which awakens poetry and art, the invisible light that bathes the world,—the nameless essence that fills it,—the devout, uplifted look of all things,—is the personal effusion of God's spirit, by which the secret spreads of what he is.'

A.E. tells us that in his youth he haunted the mountains, 'finding in the high air vision become richer and more luminous.'

The literature of mountain climbing, where the climber is face to face with the glory and the terror of visions of heaven and earth beyond all description, gives us ample proof, in books like Tindall's *Glaciers of the Alps*, of the exaltation of mind induced by such experience, an exaltation giving lasting life to the books written under its influence, which is so different a matter from the momentary exaltation which produced De Quincey's hectic masterpieces.

Creative literature presents many a record of this direct influence of physical phenomena upon mind and spirit. Perhaps the best known in our English poetry is Henry Vaughan's vision of the universe, truly 'poetry running along the verge of infinity!'

> I saw Eternity the other night,
> Like a great ring of pure and endless light,
> All calm, as it was bright;
> And round beneath it, Time in hours, days, years,
> Driv'n by the spheres
> Like a vast shadow mov'd, in which the world
> And all her train were hurled.

Fechner, Thomas Hardy and Maxim Gorki in later days have recorded almost celestial visions in terms of planetary emotion, which yet fall behind these verses of Henry Vaughan, giving us another instance of the truth so finely stated by the great Japanese thinker Okakura Kakuzo: 'Art, like the diamond net of Indra, reflects the whole chain in every link.'

In these lines we have gone far from the famous saying of Pascal that he was terrified by the eternal silence of the infinite spaces. During the nineteenth century two

A NOTE ON THE ANCIENT MARINER

BY

E. E. SPEIGHT

IN recent literary criticism there are two utterances of a startling nature which are original to the extent of finding expression for ancient facts of life. One is by Mr. Claude Bragdon, the author of *Four-Dimensional Vistas*, where he speaks of 'the increasing pressure upon consciousness from a new direction'. The other is a remark by the late Prof. W. P. Ker:

> 'There are some very strange occurrences in the tradition of modern verse, where the regular succession of modes is interrupted as by electrical or ethereal messages from outside.'

I call these ancient facts of life for the reason that there are no new directions from which pressure can be brought upon consciousness: the directions and perhaps the pressure have been there from the beginning. It is the conscious response of man that is a new thing. And Prof. Ker's diagnosis is clearly a case of scientific terms applied to a process which has accompanied the advance of poetry from tribal days.

Shelley, over a century ago, said almost the same thing:

> 'It is impossible to read the compositions of the most celebrated writers of the present day without being startled with the electric life which burns within their words.'

Bragdon and Ker were right in so far as they drew attention to the change in human response to cosmic influences.

It is not many years since Michel Brèal could say:

> 'If we cared to examine the methods used by modern literature to renew the resources and the character of its style, we should be convinced that it still has recourse to those same abstractions, the first specimens of which were contemporaneous with the Vedas and with Homer.'

Since these words were written a revolution has broken out in literature, a flight from the centre, a determination to avoid the traditional abstractions, to establish new relations and effect new associations in the most unexpected ways, so that to read some of our contemporary poets with the old truisms still ringing in our ears is a positive nightmare, an exercise comparable in some cases to an attempt to understand Lewis Carroll.

A tree, a poet observing that tree, and the poem he writes as a result, are all organisms dependent for their existence in part, and probably in large part, upon sustenance of further as well as nearer origin. Shelley speaks of

> The Poet's blood,
> That ever beat in mystic sympathy
> With Nature's ebb and flow.

Poetry, as all other rhythmic movements, partakes of the cosmic radiation which conditions all our life, and still more probably forms a vital part of what we term the unknown, the subconscious, the mystical.

This, in particularly engaging forms of expression, is a conviction familiar in Indian philosophy and poetry, from the Vedic Hymns onward.

In the Bhartrihari it is written:

> 'Oh Mother Earth, Father Wind, Friend Sunshine, Kinsman Water, Brother Sky, for the last time I clasp my hands in reverence before you. The night of all error is overthrown in me by the stainless radiant knowledge from the rich store of good works born of your companionship, and I sink into the supernal spirit.'

PLATE II

FIGURE 4
NUMBER OF COINCIDENCES
6
4
2
b ab b ab a
b b
ab ab
a a
MANOMETRIC HEIGHTS
33
34
35
36
37
38
39

A
D
B
C
Number of coincidences
6
4
2
Manometric Heights
33 34 35 36
31 32 33
33·5 34·5 35·5 36·5
34 35 36 37
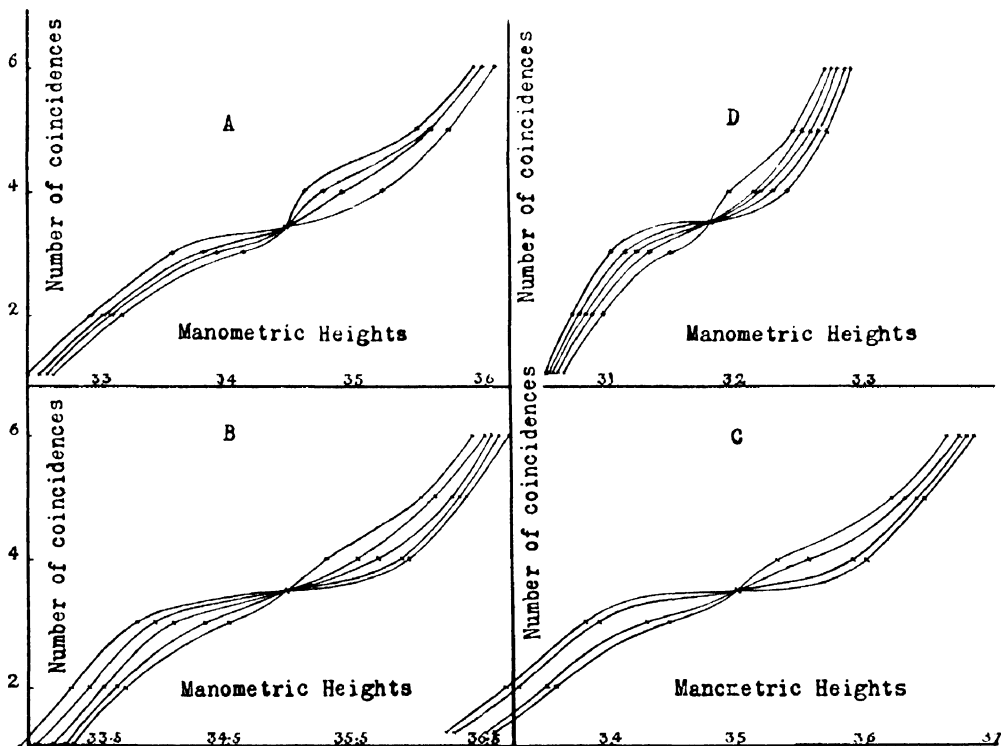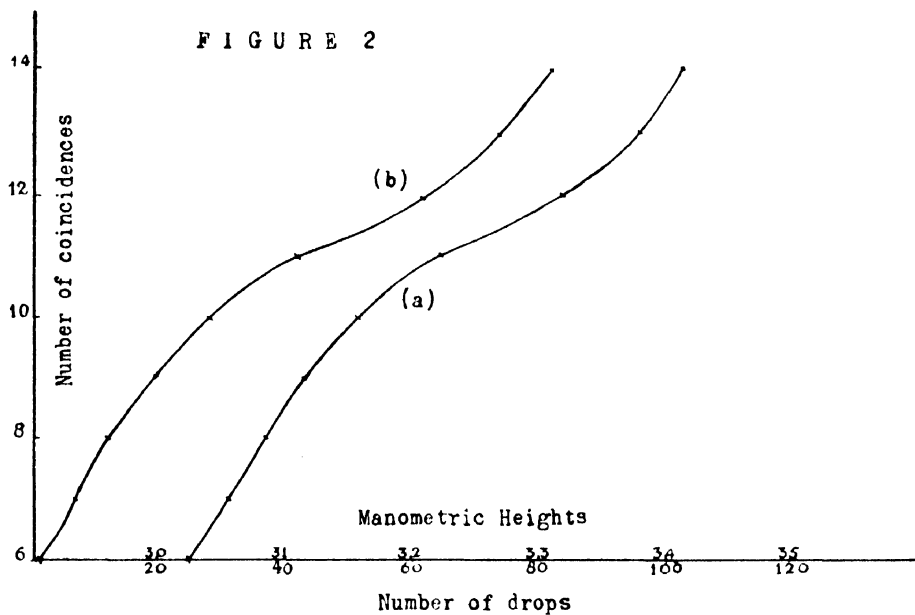
FIGURE 3
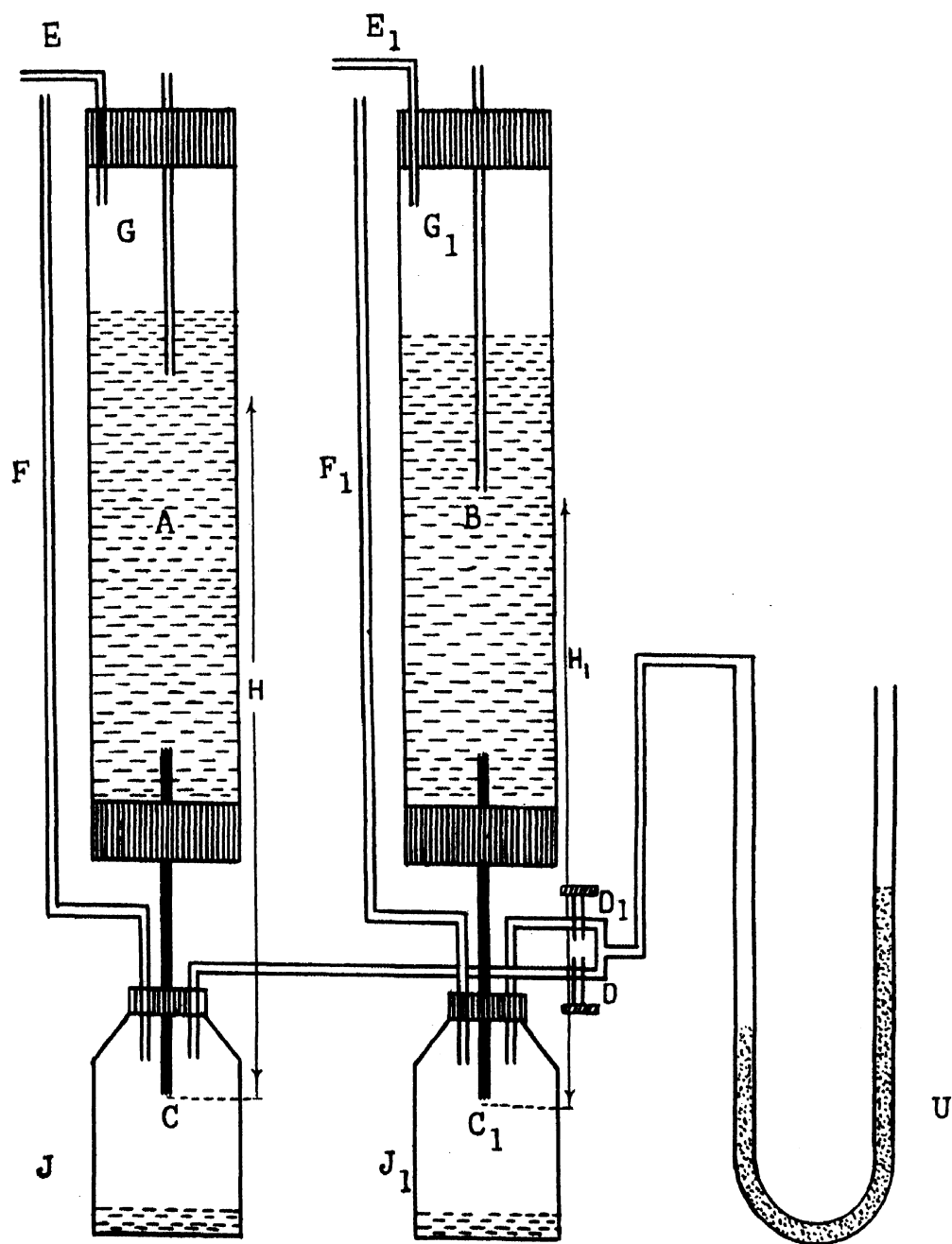
F I G I

manometric height h. This also gives us a method for finding h without actually plotting the graphs. The bracketed quantities indicate the two heights h_{n-1} and h_n.

The correct determination of h will be of much importance for comparing the kinematic viscosities of two liquids by a better method than is generally employed. Starting from Poiseuille's Law with kinetic energy correction a simple relation may be established between the viscosities of two liquids in terms of the pressure heights h, H and H_1. If two identical capillary tubes of equal lengths and cross-sectional areas are used, the results will depend entirely on the accurate measument of the pressure heights.

TABLE I

Curves.	Value of h.	Arith. mean.
A	34·45	34·37
B	34·92	34·86
C	35·00	34·90
D	31·82	31·70

TABLE II

	a	a'	b	b'
	39·60	39 70	32·40	32·50
	39·10	39·20	32·80	32·90
	38·50	38·70	33·25	33·35
	37·80	38·10	33·85	33·90
	36·60	37·20	{ 34·60 }	{ 34·75 }
	35·20	34·65	{ 36·70 }	{ 36·58 }
	34·20	33·95	37·40	37·30
	33·60	33·40	37·85	37·80
	33·12	33·00	38·20	38·10
	32·70	32·60	38·50	38·45
Total ...	360·42	360·50	355·55	355·63

	ab	$a'b$	ab'	$a'b'$	h from Fig. (4).	Arith. Mean.
	360·42	360·50	360·42	360·50		
	355·55	355·55	355·63	355·63		
Total ...	715·97	716 05	716·05	716·13		
Average for one coincidence.	35·798	35·802	35·802	35·806	35·89	35·65

Suppose the drops from C and C_1 are falling at constant intervals T_c and T_{c_1} respectively and also let $T_{c_1} < T_c$. After the coincidence of the drops falling through C and C_1 a second drop will fall from C_1 in time T_{c_1} and a second drop from C in time T_c. The time interval between these drops will be $(T_c - T_{c_1})$. A third drop from C_1 will fall in time $T_{c_1} - (T_c - T_{c_1})$ after the fall of the second drop from C: and likewise a third drop from C will fall in time $T_c - [T_{c_1} - (T_c - T_{c_1})]$, after the fall of the third drop from C_1. Thus the time interval between the third fall of drops will be $2\,(T_c - T_{c_1})$.

If n is the number of falls, the time interval will be $(n-1)\,(T_c - T_{c_1})$.

Now it is clear that for a coincidence to occur this time interval must be equal to T_{c_1}).

i.e. $\quad (n-1)\,(T_c - T_{c_1}) = T_{c_1}$

$$\text{or} \quad n = \frac{T_c}{T_c - T_{c_1}} \qquad \ldots\ldots\ldots\ldots (1)$$

It should be noted that n is the number of drops counted from the first coincidence, and the expression $\frac{T_c}{T_c - T_{c_1}}$ denotes one coincidence for every n fall of drops.

Experimental Details:—

The heights H and H_1 are adjusted in such a manner that the rate of fall of drops through C_1 appears to be slightly higher than those falling through C. Opening F and D and closing F_1 and D_1 the fall of the drops just at the end of the two capillary tubes is observed very carefully. After every coincidence point, when a drop through C_1 appears to be just advancing over that through C, the corresponding manometric height is noted. The heights h_{n-1} and h_n are also likewise observed. Next the number of coincidences against the number of drops falling from C_1, counting from the first concidence, are plotted as shown in Fig. 2 (a). In Fig. 2 (b) a similar curve is obtained which shows the relation between the total number of concidences and the corresponding manometric heights. The experiment is repeated several times under identical working conditions and the set of curves are plotted on the same scale as in Fig. 3. The tubes F and D are then closed and F_1 and D_1 opened, thus making C_1 the reference tube. The pressure in J is lowered by suction in such a manner that the rate of fall through C appears to be greater than that through C_1. As before, the number of coincidences against the manometric heights are plotted. The right portions of the curves a, a', b, b', of Fig. 4 are the reflections of the actual curves when C and C_1 are taken as reference tubes alternately. Curves ab and $a'b$ are drawn as the mean of the curves a and b, and a' and b, respectively.

General Discussion:—

Equation (1) has been verified experimentally and has been found to be correct for our practical use. Since the experiment is not repeated under ideal conditions the curves of a particular set in Fig. (3) are separated from one another except at the point of inflexion. These cutting points, however, indicate that the drop intervals of two liquids have become equal. The values of the manometric heights obtained from these curves are compared with arithmetic mean of h_{n-1} and h_n, in Table I. It will be seen that the values of h obtained from these curves are greater than the arithmetic mean.

In Fig. 4 the curves ab, $a'b$, $a'b'$, and ab' (the two latter are not shown) are symmetrical about a common axis passing through the points of inflexion. This axis gives the manometric pressure height necessary for making the drop intervals of C and C_1 equal. It also indicates that the sum total of the manometric pressure heights corresponding to the coincidences of a and a' must separately be equal; and similarly the sum totals of b and b', as shown in Table II. If the average for one coincidence be obtained from any of the four combinations of a, a', b, b', it will correspond with the

ON THE EQUALISATION OF THE INTERVAL OF LIQUID DROPS FALLING THROUGH TWO CAPILLARY TUBES*

By

S. M. A. KHAN and K. S. IYENGAR

Physics Dept., Osmania University College.

IN the experiment the liquid drops through two different capillary tubes are observed at the same time. The manometric pressure is self-adjustable and at a certain stage it helps the drops through the two capillary tubes to fall simultaneously for a short time. The complete apparatus is immersed in the thermostat and thereby accuracy of work at a definite temperature ensured. Various sets of curves are plotted and interesting results obtained.

In Fig. 1, the two large glass tubes A and B, which are placed side by side, are of length about 30 cms. each, and of diameter 2·5 cms. C and C_1 are two capillary tubes of equal lengths and cross sections, chosen for symmetry and are connected to A and B by means of small rubber corks. Pure water is kept in A and B and through each of them ordinary glass tubes G and G_1 are inserted by means of rubber corks. The flow of liquid through C and C_1 keeps the liquid surfaces at the ends of G and G_1 at atmospheric pressure. The lower ends of C and C_1 are fixed inside the glass bottles J and J_1 by means of rubber stoppers. E and E_1 are two side tubes which are kept opened when liquids are to be introduced through G and G_1; and afterwards are closed. The manometer U also contains pure water and is so connected that the pressures in J and J_1 could be measured separately by closing either tube which connects the bottles. Pinch-cocks D and D_1 are provided for the purpose. F and F_1 are tubes by which the bottles J and J_1 could be kept at atmospheric pressure when desired.

Theory—

When the drops are falling through C and C_1, suppose that the rate of fall through C_1 is more than through C. If the manometer is connected to J_1, the pressure in it gradually increases and hence the rate of fall through C_1 decreases proportionately. At a certain pressure in J_1, the drops through C and C_1 fall simultaneously, and finally the rate through C_1 decreases when compared to that through C. Suppose a drop of of each liquid from the ends of C and C_1 appears to be falling at the same time when U is connected to J_1. Also suppose that after a time at a certain manometric height h_1 a drop of liquid at the mouth of C_1 just advances after balancing with liquid drops at the mouth of C. After the disturbance of this balance a second coincidence point appears, indicating that the liquid through C_1 has advanced by one or more complete drops over that of the other. Now at this stage let h_2 be the manometric height when a drop through C_1 appears to be just advancing after balancing with the drops through C.

Proceeding in this way, we get different pressure ranges say from h_1 to h_2, from h_2 to h_3, from h_3 to h_4 and so on. Let h_{n-1} be the manometric height when after coincidence a drop of liquid through C_1 appears to be just advancing over that of the other: and h_n be the height for the next successive balance when a drop of liquid through C just advances over that of the other. The correct height h at which the interval of the liquid drops should be equal, lies somewhere between h_{n-1} and h_n. In this particular range from h_{n-1} to h_n the total number of drops falling through C_1 is equal to the total number falling through C. If this range is small then h is approximately the arithmetic mean of h_{n-1} and h_n. We shall now see how far this assumption is true.

described it as a 'waste paper'[1]. It passed through several editions, and has been translated into Latin and Hebrew several times. Just recently Gruner has translated Book I of this book into English. In the XVth century a great mass of commentaries collected round it, the whole of which were printed by Guinti of Venice in 1523 under that title *Maximus Codex totius scientiae medicinae etc.*[2] After this great work comes his *'al-Adwiyyat-'ul-Qalbiyyah* (الادوية القلبيه) of which the British Museum has several fine old MSS[3], but it remains to be published.

Besides the philosophical and the scientific works he was the author of the philosophical romances of *Ḥayy 'ibn-i-Yaqzân* (حي ابن يقظان) (which, as Browne rightly insists, should not be confused with the more celebrated treatise of the same name by 'Ibn-i-Ṭufail (ابن طفيل))[4], and *Salâmân wa Absâl* (سلامان و ابسال). This later romance was taken by the Persian poet Jâmî as the subject of a poem. A Hebrew translation of the former romance was edited by D. Kaufmann in 1887.

III. CONCLUSION.

It will be noted that in the forgoing pages no attempt has been made to form even a rough estimate of 'Ibn-i-Sînâ's services to Logic. Nor has judgement been passed on his doctrine of the abstract ideas, on his contribution to the development of the science and the practice of medicine and surgery, on his theory of knowledge, on his philosophical exposition of theological dogmas, and on other kindred subjects, which can be more easily dealt with by a student of philosophy than by any one else. The reason is obvious—all these topics are beyond the limits set by the present writer. They are, no doubt important in themselves—and for this very reason each one of them demands a careful and a penetrating study. The present paper claims to be a biographical notice of the great philosopher and nothing more. The present writer eagerly looks forward to the opportunity of presenting the various aspects of Ibn-i-Sînâ's philosophy in the form of separate papers. The foregoing pages, it is hoped, will form a sort of an introduction to these papers.

M'UTAZID WALÎ-'UR-REḤMÂN, M.A.,
(*Dept. of Philosophy*),
Osmania University College.

[1] See Campbell, p. 79.
[2] *Ibid.* pp. 80–81.
[3] Browne, *Arabian Medicine*, p. 61.
[4] This treatise has been published at Oxford in 1671 and 1700 with a Latin Translation by Pococke. See Browne, *Lit. Hist. of Per.*, Vol. II, p. 108.

'al-Qifṭî's, and comprises 68 books on Theology and Metaphysics, 11 on Astronomy, and Natural Philosophy, 16 on Medicine, and four in verse—99 in all[1].

In Philosophy the greatest of his works is *'Ash-Shifâ.* As he mentions in his autobiography, the Shaikh composed it bit by bit at his different residences during his wanderings. This is an Encyclopædia of Physics, Metaphysics and Mathematics, and comprises 18 volumes. M. Forget has edited it, and has been published at Leyden in 1892. When this Encyclopædia was finished he made an abridgement of it, and called it *'an-Najât.* This abridgement, 'written in a very concise, clear and logical language, is suitable for study'[2]. It 'shows the influence of 'al-Farabi on his Logic, the dynamism of his Physics, the empirical tendency of his Phychology, and his systematisation of Aristotle, coloured by a Neo-Platonic theory of the production of the world'[3]. Another famous philosophical work is *Kitâb-'ul-Ishârât wât-Tambîhât* (كتاب الاشارات والتنبيهات) This book has also been edited by M. Forget, and published in 1892. The pupil and the biographer of 'Ibn-i-Sînâ—'Abu 'Ubaid—considered this to be his master's best work, and the author himself put a high value on it. It has been commented on by Nasîr-'ud-Dîn Tûsi and Fakhr-'ud-Din 'ar-Razi[4]. His other philosophical treatises are the *Philosophy 'al-'Arûḍî*, and *Philosophy 'Alâî* so called after the names of the patrons to whom they are dedicated; *Guide to Wisdom*, composed by the Shaikh when in prison; an epistle on the *Fountains of Wisdom*, *On the Soul*, a poem on the *Soul*, the full text of which has been preserved in the biographical notes of 'Ibn-i-Khallikân[5] and 'Ibn-i-'abî 'Usaibiah[6]. Browne has given an English transtation of the whole poem in his *Literary History of Persia*[7]. It was also translated by van Dyck, and published in Vienna in 1906. In Psychology he is said to be the author of *'al-Mabhath ' an Q'uw'an Nafsâniyyah*, (المبحث عن قوي النفسانيه), which has been edited by van Dyck and published at Cairo in A.H. 1325[8]. In addition to this Dr. Landauer has published a treatise on his Psychology with an introduction and a German translation in the Z.D.M.G. for 1875[9].

Among his books on Medicine *'al-Qânûn f'it Tibb* (القانون في الطب) is the most important. It is excessively divided into major and minor sections, and the whole is divided into five Books. The first Book deals with the general principles of Medicine, the second with simple drugs, the third with the diseases incident to man from 'the head to the foot', the fourth with the diseases that cannot be localised in any organ of the body, and the fifth is a meteria medica[10]. 'This work was the final edification of all Graeco-Arabic medicine, and formed half of the medical curriculum of the European universities in the later part of the XVth. century, and continued as a text-book upto about 1650 in the Universities of Montpellier and Louvain'[11]. 'Ibn-i-Zuhr (ابن زهر), however,

[1] *Geschichte der Arabischen Literatur*, Vol. I, pp. 452-581.

[2] *Ency. of Rel. and Ethics*, art. Avicenna.

[3] *Ency. Brit*, art. Avicenna.

[4] *Ency. of Islam.* De Boer's art. on 'Ibn-i-Sînâ.

[5] Egyp. Ed., Vol. I., p. 153.

[6] *'Uyûn-'ul-Ambâa fî Tabaqât-'il-Aṭibbâa*, (عيون الانباء فی طبقات الاطباء), Egyp. Ed., Vol. II, p. 10.

[7] Vol. II, pp. 110-111. But he quotes it from *Kharâbât* (خرابات) of Ziya Bey, Vol. I, pp. 283-284, which, as he says, towards the end differs somewhat from the text cited by others.

[8] De Boer, *Ency. of Islam*, art. 'Ibn-i-Sînâ.

[9] And not 1876 as Carra de Vaux refers to in his article on Avicenna in th *Ency. of Rel. and Ethics*, Vol. II, p. 276.

[10] *Canon*, 1593 Rome Ed. According to Campbell 'the first two deal with Physiology and Hygiene, based on the writings of Aristotle and Galen, the third and the fourth with treatment and the fifth is on materia medica'. See his *Arabian Medicine*, Vol. II, p. 79.

[11] *Ibid.* p. 79. It will be of interest to note that in the year 1898 a long Medical document was found at Meshaikh (Egypt), which is assigned to the 9th or the 10th century A.D. It is written in Coptic, the language of the Christian Egyptians. This Coptic, papyrus is a collection of recipes only, some of which show Greek influence, especially one for black bile (No. 70). This is evidently influenced by 'Ibn-i-Sînâ. See W. R. Dawson's *Magician and Leech*, p. 85.

health now. But he was so sure of his strength that he never paid any attention to it. The result was that he had a very severe attack of colic. The same year 'Alâ-'ûd-Dawlah was leading a campaign, and 'Ibn-i-Sînâ was accompanying him. So to expedite the cure he had eight enemas in one day, with the consequence that his intestines got affected. So he had to return to Îzaj (ايذج), where he had an attack of epilepsy, which usually follows the colic. During all this illness he was treating himself. One day he ordered two *dâniqs* of *Karafs* seeds to be put into his enema. The physician in attendance put five *dâniqs* instead of two. Whether it was by mistake that he did so, or whether it was done intentionally, could not be ascertained. Then he was taking some medicine for his epilepsy. But one day his servant put a large quantity of opium into it. The motive of this poisoning is stated to be the fact that they had smuggled a large amount of money from his safe, and they feared that if their master got over his illness they were sure to be brought to book. These incidents aggravated the malady, so that he had to be brought back to Iṣfahân in that same condition. He was so weak that he could not stand upright. But by his own treatment he had improved so much that he came to see 'Ala-'ud-Dawlah walking. But inspite of this serious condition he would not give up his licentious habits. The result was that he relapsed many times. During this journey he had another attack of colic, leaving him absolutely weak and incapacitated. He was in this condition for some days, and then he died at the ripe age of 58[1], on Friday the 1st, of Ramaḍân A.H. 428 (A.D. 1037), and was buried at Ḥamadân[2]. At his death one of his contemporaries wrote:—

رأيت ابن سينا يعادي الرجال – و بالحبس مات اخس الممات
فلم يشف ما ناله بالشفا – ولم ينج من موته بالنجاة

But Shaikh Kamâl-'ud-Dîn bin Yûnus (شيخ كمال الدين بن يونس) says that in later years he had incurred the disfavour of his patron, who imprisoned him, where he died. So somebody said:—

رأيت ابن سينا يعادي الرجال – و في السجن مات اخس الممات
فلم يشف ما ناله بالشفا – ولم ينج من موته بالنجاة

II. WORKS.

'Ibn-i-Sînâ was an encyclopædic author and a prolific writer. He is said to be the author of about a hundred voluminous books and small treatises, a number of which are still extant. 'Al-Qifṭî mentions the names of twenty-one major and twenty-four minor works on Philosophy, Medicine, Theology, Geometry, Astronomy, Philology, and the like[3]. Most of these are in Arabic. In Persian, his native language, he wrote one big book named *Dânish Nâma-i-'Alâî* (دانش نامۀ علائي), and a small treatise on the pulse. The former is represented by a fine MS. in the British Museum[4]. There is also a lithographed edition of this work published in India in 1891[5]. The list given by Brockelman, which includes only the extant works, is, however, more extensive than

[1] According to one reading 53. A Persian poet has given, mnemonically, the dates of 'Ibn-i-Sînâ's birth, completion of his studies, and death in the following:—

حجة الحق بو علی سینا – در شجع آمد از عدم بوجود
در شصا کرد کشف جمله علوم – در تکز کرد این جهان بد رود

[2] According to 'Ibn-'ul-Athîr at Isfahân. See Ibn-i-Khallikân, Egyp. Ed. Vol. I, p. 154.
[3] *Tarîkh-'ul-Hukamâ* a Lippert's Ed. p. 418.
[4] Or. 16830, Rieu's *Cat. of Per. MSS. in Br. Mus.*, pp. 433-434.
[5] Browne, *Arabian Medicine*, p. 60.

philosopher. One day he was in the presence of the Amîr and 'Abû Manṣûr 'al-Jabbân (ابو منصور الجبان) was also present. By chance the commpany began to talk about lexicography, and 'Ibn-i-Sînâ was the last man to keep quiet. As he interfered 'Abû Manṣûr said "You are a philosopher and a physician. You have not studied this subject So you cannot pose as an authority." 'Ibn-i-Sînâ did not relish the remark, but kept quiet. Then for three subsequent years he studied lexicography, for which purpose he sent for the book, *Tahzîb-'ul-Lughat* (تہذیب اللغۃ) by 'Abû Manṣûr 'al-Azharî, from Khurâsân. After three years of study he had acquired so much of this science that he composed three *qasidâs* containing many unfamiliar and seldom-used words. Then he wrote three books on Lexicography, one of them being after the style of 'Ibn 'ul-'Amîd, (ابن العمید), the second after that of 'aṣ-Ṣâbî (الصابی), and the third after that of 'aṣ-Ṣâhib (الصاحب). Then he got all these three books bound into one volume, and besmeared the binding with mud and dust, so that it might look like an old book. He presented this "old" book to the 'Amîr, with the request that it be handed over to 'Abû Manṣûr 'al-Jabbân, saying that it had been found in the desert while the 'Amîr was out hunting, and that the 'Amîr wanted to know what the book contained. When the book reached him, 'Abû Manṣûr read the book through, but was unable to understand most of it. Thereupon 'Ibn-i-Sînâ said:—"Whatever part of the book you do not understand is given in such and such books on Lexicography," and he gave the names of the books on Lexicography from which he had memorised those parts. Now 'Abû Manṣûr guessed that the book was by 'Ibn-i-Sînâ, and was the result of the taunt that he had offered to him the other day. So he apologised. After this incident 'Ibn-i-Sînâ wrote a lexicon named *Lisân-'ul-'Arab* (لسان العرب), the fair copy of which was made after the death of the author. Now by this time he had acquired much experience in the treatment and the curing of the diseases. So he thought of incorporating all these experiences in his *'al-Qânûn* (القانون). With this idea he took down notes, but all of them were destroyed before he could finish it. The following two anecdotes speak very clearly of his therapeutical skill. One day he felt an headache. He diagnosed that the "matter" (مادہ) was going to fall the حجاب of the head, so that an inflammation would result. He ordered a large quantity of ice, pounded it, put it in a piece of cloth, and covered his head with it. The result was that he got over the disease. The other anecdote runs as follows:—In Khwârazm there was a woman suffering from tuberculosis. He asked her not to take any medicine except جلنجبین السکر . She took it in large quantity and was cured.

When at Jurjân 'Ibn-i-Sînâ had written *'al-Mukhtaṣar-'ul-Aṣghar f'il Manṭiq* (المختصر الاصغر فی المنطق), which he included in his *'an-Najât*. A copy of this book travelled to Shîrâz, and fell into the hands of a party of scholars. This party read it through and objected to certain portions of it. They recorded their objections on a piece of paper, and sent this piece, along with a covering letter, to 'Ibn-i-Sînâ at Iṣfahân. 'Ibn-i-Sînâ got all these papers at dusk. He sat down there and then to write the reply. He was busy writing the reply the whole night, and at dawn sent down a complete and a comprehensive reply in five folios to 'Ab'ul Qâsim 'al-Kirmânî (ابوالقاسم الکرمانی) to be forwarded to Shîrâz. When 'Ab'ul Qâsim saw the whole thing he was simply wonder-struck. After this 'Ibn-i-Sînâ wrote *Kitâb-'ul-Inṣâf* (کتاب الانصاف). But a short time afterwards Sultân Masûd invaded Iṣfahân, and his armies plundered the whole of the city, carrying away all the belongings of 'Ibn-i-Sînâ, which included this book. Thus the book was lost for ever.

'Ibn-i-Sînâ was physically a very strong and a passionate man. He used to indulge in excesses in his sexual relations, and these excesses were telling upon his

exposition of his Philosophy. Thus he began with Physics as a part of his bigger book *'Ash-Shifâ* (الشفا). Before this he had already written the first book of his famous *al-Qânûn* (القانون). The students assembled at his house every night and 'Abû 'Ubaid used to read out from *'Ash-Shifâ* and another from *'al-Qânûn*. After finishing these lessons musicians were called and a joyful time began. This went on until Shams-'ud-Dawlah marched with his armies towards Ṭârim (طارم), and during this campaign died of colic. Now Shams-'ud-Dawlah's son ascended the throne, and was asked by his advisers to retain 'Ibn-i-Sînâ on the wizarat, but he refused. In the meantime 'Alâ-'ud-Dawlah was carrying on a secret correspondence with him, because he wanted him in his court. After having been dismissed by Shams-'ud-Dawlah's son, 'Ibn-i-Sînâ stayed with 'Abû Ghâlib al-Aṭṭâr (ابو غالب العطار) *incognito*. Here 'Abû 'Ubaid asked him to finish *'Ash-Shifâ*. So he asked for pen and paper, and, on about twenty pieces of paper, wrote down the chief problems, and after two days he started writing the book. His method was that he would take up a piece of paper, look at the problem, and dictate his own explanations thereof. Thus he would dictate fifty pages every day,[1] until he finished Physics and Metaphysics. He had begun Logic when Tâj-'ul-Mulk (تاج الملک) accused him of carrying on a secret correspondence with 'Alâ-'ud-Dawlah, and threw in prison. He was in prison for four months. Then 'Alâ-'ud-Dawlah ransacked Ḥamadân and defeated Tâj-'ul-Mulk. But soon after 'Alâ-'ud-Dawlah left Ḥamadân 'Ibn-i-Sînâ was again set free. Now he took up *'Ash-Shifâ* again, and finished Logic. During his prison life he had already written and finished two books, namely, *Kitâb-'ul-Hidâyah* (کتاب الهدایة) and *Risâla-i-Ḥayy ibn-i-Yaqzân* (رسالہ حي ابن يقظان). The book *'al-'Adwiyyatt-'ul-Qalbiyyah* (الادوية القلبية) he compiled when he first went to Ḥamadân. Now once again 'Ibn-i-Sînâ left Ḥamadân in the garb of a Ṣûfî, taking his brother, 'Abû 'Ubaid, and two of his slaves with him. Thus he reached Ṭibrân (طبران), on the gates of Iṣfahân. Here he received a warm welcome from 'Alâ-'ud-Dawlah, and found a patron in 'Abd'ullâh bin Bâbî (عبد الله بن بابي). 'Alâ-'ud-Dawlah used to hold here a literary meeting every Friday, at which different scholars, including 'Ibn-i-Sînâ, gathered together, and had scholarly discussions. During his stay at Iṣfahân he finished *'Ash-Shifâ*, *Logic Almageste*, a summary of *Euclid*, *Arithmetic*, and *Music*. At about the same time he produced *Kitâb-'un-Najât* (کتاب النجاة). Now 'Ibn-i-Sînâ had become one of the companions of 'Alâ-'ud-Dawlah.[2] One night it was stated in the presence of 'Alâ-'ud-Dawlah that there was a discrepancy in the current calendars, which were compiled according to the old observations. Thereupon the Amîr asked the philosopher to investigate it, and by way of help he set up an observatory, and spent as much as the observations demanded. 'Ibn-i-Sînâ took 'Abû 'Ubaid as his assistant and began the research. This research cleared up many problems. Out of these researches grew his *Kitâb-'ul-'Alâî* (کتاب العلائي).

'Abû 'Ubaid says that he was with him for twenty-five years, and during this long period of companionship and service he never saw 'Ibn-i-Sînâ reading the whole of any book that reached his hands. He would turn to the different parts of the book, read them and formed an idea about the scholarship of the author. 'Abû 'Ubaid mentions a very interesting incident, which testifies to the versatility of our

[1] According to Dr. Browne he used to write "some two pages" only (p. 97). Here again he relies upon *Chahâr Maqâlâ* (See Qazwînî's Ed. p. 82) and goes astray.

[2] Browne once again follows *Chahâr Maqâlâ* blindly and asserts that 'Alâ-'ud-Dawlah appointed 'Ibn-i-Sînâ his wazîr (p. 97). Khwand Mîr also alludes to this fact (p. 61). But it is not true, as is pointed out by Qazwînî. It was Shams-'ud-Dawlah who appointed him wazîr twice (*Chahâr Maqâlâ*, p. 251). Khwand Mîr corroborates this statement also. See *Ḥabîb-'us-Siyar*, Vol. II, p. 61.

After this digression we return to the topic we were discussing. After leaving Kurkânj 'Ibn-i-Sînâ reached Jurjân. Here he wanted to see Qâbûs [1], but in the meantime the Amîr had been imprisoned in one of the forts, where he eventually died. So he had to leave for Dahistan (دہستان), but here he fell sick, and so perforce returned to Jurjân. It was here and at this time that he admitted 'Abu 'Ubaid 'al-Juzjani into the circle of his disciples. This same 'Abu 'Ubaid was later to become his biographer. Under these trying circumstances he composed a *qasîdah* about his own self, in which he very touchingly says :—

لما عظمت فليس مصرٌ واسعي – لما غلا ثمني عدمت المشتري

After returning to Jurjân he found a very hospitable host in 'Abû Muḥammad Shîrâzî (ابو محمد شيرازي), a rich man and a patron of scholars. This 'Abû Muḥammad rented a house for him in his own neighbourhood. It was here that he wrote many of his books.

Having stayed here for a considerable period of time he shifted to Rayy (ري), and joined the services of Majd-'ud-Dawlah (مجد الدولہ) and his mother, who knew him through his books. During his stay here he wrote his book named *al-Ma'âd* (المعاد). He was with Majd-'ud-Dawlah until Shams-'ud-Dawlah (شمس الدولہ) turned his attention this side after the murder of Hilâl bin Badr bin Ḥasanwaih (ہلال بن بدر بن حسنویہ) and the defeat of the Baghdâd army. Now 'Ibn-i-Sînâ had to leave for Qazwîn, and then for Ḥamadân. It so happened at this time that Shams-'ud-Dawlah was suffering from acute colic. 'Ibn-i-Sînâ was asked to treat him, which he did quite successfully. Thus he was brought into the royal favour, but he enjoyed this privilege for forty days only. Eventually, however, Shams-'ud-Dawlah appointed him his wazîr. But it was not long before he fell into disfavour. His property was confiscated, and he was thrown into prison, some of the campanions of the 'Amîr having advised him to put him to death. The Amîr, however, was not prepared to take the matters so far. Sometime afterwards he was set free, but he had to hide himself in the house of one Shaikh 'abû Sa'ad (or Sa'îd) bin 'ar-Rakhdûk (شیخ ابو سعد ' یا سعید ' بن الرخدوك) for forty days. But a few days later the 'Amîr was again down with colic and 'Ibn-i-Sînâ had to be called again to treat him. Now the 'Amîr apologised, and appointed him his wazîr a second time.

One day 'Abû 'Ubaid asked him to write a commentary on Aristotle, which request he declined saying that he had no time, but agreed to write an uncritical

[1] Browne says that 'Ibn-i-Sînâ was 'liberally entertained by Shams'ul Ma'âlî Qâbûs'. (*Lit. Hist. of Per.*, Vol. II, p. 107), Now in this connection 'Ibn-i-Sînâ's own words are :—

" ثم دعت الضرورت الى الانتقال الى فسا و منجعا الى باورد .... و منجعا الى جرجان ' وكان قصدى الامير قابوس. فاتفق فى اثناء هذا اخذ قابوس ' وحبسه فى بعض القلاع ' و موته ' هناك ".

('al-qiftî, p. 417, also '*Uyûn 'ul-Ambâa fi Tabaqât 'il-Aṭibâa*, by 'Ibn-i-Abî 'Usaibi'ah, Egyp. Ed. Vol. II, p. 4). 'Ibn-i Khallikân also corroborates this statement though his wording is a bit different :—

" وكان يقصد حضرة الامير شمس المعالى قابوس بن وشمكير فى اثنا هذا الحال فلما اخذ قابوس ' وحبس فى بعض القلاع حتى مات .... وذهب ابو على الى دهستان ".

(Vol. I, p. 153). In these quotations the words " وكان قصدى " and " وكان يقصد " and واتفق فى اثناء هذا الحال and فى اثناء هذا الحال are important. The first two words mean that he 'intended', or he 'desired' to go to, or that he had started for, Qâbûs, but had not yet actually reached him. The last two words connote that 'during' his wanderings Qâbûs was captured and imprisoned in one of the forts, where he eveutually died. This obviously means that Qâbûs was dead before 'Ibn-i-Sînâ reached him. Then again Browne forgets, that according to his own statement it was 'shortly *after* (Italics mine) 1017 that Maḥmûd demanded the immediate despatch of the several men of letters' including 'Ibn-i-Sînâ, who 'with the connivance of Mâmûn made good his escape' and reached Jurjân. All this means that 'Ibn-i-Sînâ reached Jûrjân after 1017. But Qâbûs, as Browne himself records, was killed in 1012 (pp. 96-97)—more than five years before 'Ibâ-i-Sînâ could see him ! ! So naturally he could not have been 'liberally entertained' by Qâbûs, as Browne conjectures. Apparently this is another point where Browne has been misled by *Chahâr Maqâlâ*. Qazwînî has also adopted this same line of argument to refute this story, ;which finds favour with every careless biographer of 'Ibn-i-Sînâ. See his Ed. of *Chahâr Maqâlâ*, pp. 250-251.

As luck would have it his father died, and left him in very straitened circumstances. Then, owing to the Sâmânid dynasty having finally collapsed, he had to leave Bukhârâ for Kurkânj (كركانج), where 'Ab'ul Ḥasan 'as-Sahlî (ابو الحسن السهلي), the minister of 'Amîr 'Alî bin Mamûn (امير علي بن مامون), was staying. 'As-Sahlî was a great lover of learning. So he took him to the Amîr, who granted him a pension. But a short time afterwards he was obliged to leave Kurkânj, and wandered from place to place until he reached Jurjân.

The circumstances under which he had to leave Kurkânj, as stated by his different biographers, are highly doubtful. Legend has misled the ancient and the modern scholars alike. Among the modern Orientalists a scholar of even Dr. Browne's standing, reputation and erudition has given credit to a story, that does not hold water when scrutinised historically. Dr. Browne has given currency to the story that shortly after 1017 A.D., Sulṭân Maḥmûd of Ghazna sent to Mâmûn, the Prince of Khwârazm, by the hand of one of his nobles, Ḥusain bin 'Alî bin Mîkâîl (حسين بن علي بن ميكائيل), a letter demanding the immediate despatch of all the several men of letters in attendance on Khwârazm Shah. The Prince of Khwârazm was much afraid of Maḥmûd. So he understood this letter to be a command. He, therefore, summoned the men of learning and read out the letter to them, adding that he dare not refuse to obey, or to be disobedient to, his mandate. Three of them, namely, 'al-Berûnî (البيروني), the historian and the chronologist, 'Ab'ul Ḥasan Khammâr (ابو الحسن خمار), the physician, and 'Abû Naṣr 'Arraq (ابو نصر عراق), the mathematician, moved by the accounts they had heard of the Sulṭân's generosity, were willing to go, but 'Ibn-i-Sînâ and 'Abû Sahl Masîḥî (ابو سهل مسيحي), the philosopher, were unwilling. So with the connivance of Mamûn they made good their escape. Overtaken by a dust storm in the desert Masîḥî perished, while 'Ibn-i-Sînâ, after experiencing terrible hardships, ultimately reached Jurjân, over which Shams'ul Ma'âlî Qâbûs bin Washmgîr (شمس المعالي قابوس بن وشمگير) (killed 1012 A.D.), held sway [1]. Now Browne takes this story from *Chahâr Maqâlâ* of Nizâmî 'Arûḍi of Samarqand (نظامي عروضي سمرقندي) [2], and gives credit to it inspite of the fact that he seems to agree with Qazwînî's judgement that Nizâmî 'Arûdi 'is not always accurate in his statements, and is *especially weak in history and chronology*' [3]. Now it is a curious fact that the chief biographer of 'Ibn-i-Sînâ, 'Abû 'Ubaid 'al-Jûzjâni (ابو عبيد الجوز جاني), who was with him for twenty-five years until 'Ibn-i-Sînâ died, does not make even a passing reference to this episode of his teacher and master's life. If it had been true he would not have failed to notice it, because the matter was of no mean importance. To my mind 'Abû 'Ubaid's account of his life carries more weight historically than all the "anecdotes" of *Chahâr Maqâlâ* put together. Jamâl'uddîn 'al-Qifṭi, 'Ibn-i-'Abî Uṣaibi'ah, Shams'uddîn Shahzûrî, and even 'Ibn-i-Khallikân, on whom Browne bases his account of 'Ibn-i-Sînâ's life, have not a single word about it in their respective biographical dictionaries. This means that we should take this story of the "kidnapping of scholars" by Maḥmûd with a grain of salt. It is a curious fact that for a biographical account of 'Ibn-i-Sînâ Browne refers to 'Ibn-i-Khâllikan and Shahrastânî, and to second-hand authorities like Brockelman and Carra de Vaux, and entirely overlooks Jamâl'uddîn 'al-Qifṭi or 'Ibn-i-'abî Uṣaibi'ah, which contain his auto-biography, as he dictated it to his pupil, 'Abû 'Ubaid, and as such is more authentic than any of Browne's authorities.

[1] *Lit. Hist. of Per.* Vol. II, pp. 96–97.

[2] Anecdote xxxv, pp. 118–124 of his own translation. See also Qazwînî's Ed., pp. 77–78. Khwand Mîr also makes a reference to it. See *Ḥabîb-'us-Siyar*, Vol. II, p. 60.

[3] Browne's Preface to Qazwînî's Ed. of *Chahâr Maqâlâ*, p. xx (Italics mine). In his Persian Intr. and Notes Qazwînî has pointed out good many 'egregious errors' made by Nizâmî, 'Arûḍî.

doctors and physicians turned to him for help in cases of difficulty, although they were far advanced in years and experience. Then for a year and a half he studied Philosophy and Logic intensively. During this period he did not have full sleep in the night, nor any other engagement during the day. He would reduce every argument to the form of a logical syllogism, and whenever he failed in this, he would go to the mosque, and would pray to God "to open the gates of knowledge for him". At night he would pour over his books, and whenever drowsiness overtook him, he would take a cup of wine, and so return to his books and work. If he could not resist sleep, he would dream about the problems he was working on in the hypnogogic state. As he himself says, he solved a good number of metaphysical problems in his dreams. He continued this intensive study until he knew "what a human being can possibly know". After this he took up Aristotle's *Metaphysics*, but here a grim failure awaited him. He read the book forty times until he could repeat the whole book by heart[1], still he was not able to "understand the purpose of the author". So, naturally he gave it up as hopeless. But one day he happened to pass by the shop of a book-seller, and was shown a book on Aristotle's *Metaphysics*. He had already got disgusted with the book, so he threw it away with contempt. The book-seller, however, forced it on him. When he began to study it, it proved to be a commentary on Aristotle by 'al-Fârâbî[2]. This book cleared up all the doubts and the difficulties, and thus he got through this final test also.

Now at this time Nûḥ 'ibn Manṣûr, the king of Bukhârâ, fell sick, and all the court physicians had failed to cure him. This young physician had already made a name for himself. So he was invited to try his medical skill. He treated the king, until he got over the disease. This success brought him into the royal favour, and within a short time he easily got access to the royal library, where he studied many works of Aristotle unknown to his contemporaries. It so happened that some time afterwards the Library caught fire, so he was regarded as the sole transmitter of the doctrines contained in those books[3]. It was due to such strenuous labour and intensive study that by the time he was eighteen years of age he had exhausted all the sources of knowledge, so that nothing was left for him to learn, and to the last day of his life he could add nothing new to what he had so far acquired.

Thus there begins a new period in his life—a period of authorship. A neighbour of his, 'Ab'ul Ḥasan by name, once asked him to compile a comprehensive book on Prosody. So he immediately began the compilation of *'al-Majmu'* (المجموع), but, when he finished it, it was found that the treatise contained every branch of knowledge except Mathematics. Similarly another neighbour, 'Abû Bakr 'al-Barqî 'al-Khwârazmî (ابوبكر البرقي الخوارزمي), once asked him to explain a certain book. In reply to this request he wrote a book named *'al-Ḥâṣil w'al Maḥṣûl* (الحاصل والمحصول) in about twenty volumes, and another book on Ethics, *'al-Birr w'al Ithm* (البر والاثم), in one volume. Both of these books were supposed to be the property of the author. At this time he was only twenty-one years of age.

[1] The author of the article on 'Ibn-i-Sînâ in the *Ency. Brit.* (name not mentioned) writes :—"His philosophical ability was such that he memorised the *Metaphysics* of Aristotle, though its meanings remained obscure". It is a wrong statement of facts to say that he "memorised the *Metaphysics* of Aristotle". The real fact is that in his attempt to understand it he read the whole book "forty times" (See 'al-Qifṭî, p. 413), and so he was able to repeat it by heart. The above statement is a fine example of giving a thing with the right hand and taking it away with the left—or of what is called in Arabic هجو مليح i. e. the panegerical satire!

[2] Muḥammad 'ibn Muḥammad 'ibn Ṭarkhân abû Naṣr 'al-Fârâbî was born at Fârâb, and travelled widely. He died in 950 A.D. Incidentally he was the first Oriental scholar to comment on Aristotle's *Logic*. For the details of his philosophy see my article on "*'Al-Fârâbî and his Philosophy*", in the *Indian Philosophical Review*, Baroda (now extinct), for January 1920.

[3] 'Ibn-i-Sînâ's enemies accused him of having purposely set fire to it, so that he might be the sole depository of Knowledge which he had gleaned from some of the rare books it contained. See 'Ibn-i-Khallikân, Egyp. Ed. Vol. I, p. 153 and also Khwand Mir's *Ḥabîb-us-Siyar*. Bombay (1857) Ed. Vol. II, p. 60.

'IBN-I-SINA

BY

M'UTAZID WALÎ-'UR-REḤMÂN, M.A.,

(Dept. of Philosophy)

I. LIFE.

'Abû 'Alî 'al-Ḥusain bin 'Abd'ullâh 'ibn-i-Sînâ, generally known as Shaikh-'ur-Raîs, or Bû 'Alî Sînâ, was born in the month of Ṣafar A. H. 376[1]. His father, 'Abd'ullâh, belonged to Balkh, but in the reign of Nûḥ'ibn Manṣûr, the Sâmânid, he migrated to Bukhârâ. Later on he was appointed a governor of Kharmaithan (خرميثن), a suburb of Bukhârâ. Near Khurmaithan there was a small village called Afshanah (افشنه). Here he married a girl Satârah (ستاره) by name[2], who was to become the mother of 'Ibn-i-Sînâ and his brother. After the birth of these two sons the family again shifted to Bukhârâ. Like all other staunch Muslims, 'Ibn-i-Sînâ's education began the Qurân and *belles-lettres.* By the time he was ten years of age he could repeat the whole of the Qurân from memory, and was a master of *belles-lettres.* During his youth some Ismâ'îlian missionaries arrived from Egypt, and his father was counted among their converts. Now these missionaries and his father very often talked about the Soul and the intellect in the presence of this budding philosopher. This was how he got his early training in Philosophy, Geometry, and Arithmetic. Then one day his father took him to a green-grocer, Maḥmûd Massâḥ (محمود مسّاح) by name[3], who taught him Arithmetic regularly. At the same time a "so-called" philosopher[4], named 'Abû 'Abd'ullah 'an-Nâtilî (ابو عبد الله الناتلي), arrived at Bukhârâ. 'Abd'ullâh, the father of our philosopher, lost no time in having this new 'Abd'ullah as his guest, thinking that he would make a good teacher for his son. So according to this plan 'Ibn-i-Sînâ began *Isagoge* with him. It so happened one day that 'an-Nâtilî told him that genus was a predicable, which was applicable to a number of species diverse in nature. Hearing this the pupil began to discuss the nature of genus, and the whole discussion proved to be beyond the understanding of the teacher. This clearly brought home to the mind of the teacher that the pupil had far surpassed him in scholarship, and that the pupil could conceive the logical problems in a better way than the teacher. Now that the teacher had proved to be incapable of guiding the pupil, the precocious child began to study Logic with the help of commentaries, and eventually mastered it. Then he turned his attention towards *Euclid* and *Almageste* and mastered them very soon too.

At this juncture 'an-Nâtilî left him, but 'Ibn-i-Sînâ continued his studies in Physics and Metaphysics. Having gained a thorough knowledge of these he took up Medicine, in which he made so great and rapid a progress that at the age of sixteen he was one of the most successful medical practitioners, and most of the contemporary

[1] Ibn-i-Khallikân, Vol. I., Egyp. Ed., p. 154.
[2] *Ibid.* p. 152.
[3] Khwaud Mîr's *Habîb-us-Siyar*, Bombay (1857) Ed. Vol. II., p. 59.
[4] *Tarîkh-'ul-Ḥukamâa* by Jamâl-'ud-Dîn 'al-Qifṭî, Lippert's Ed. p. 413. His original words are :—
"وكان يدعى الفلسفة"

The keto-ester V (5 grams) was heated with methyl-amine acetate (25 grams) at 130° for 15 minutes. The product while hot was poured into cold water. The thick solid which was percipitated in a few minutes was filtered off, washed with alcohol and ether, and dried. It separated out in fine needles from ethyl alcohol m.p. 188–89° (dec). (Found: C, 62·8; H, 6·6; N, 9·1; $C_{16}H_{20}N_2O_4$ requires C, 63·1; H, 6·6; N, 9·2.)

7. Acid hydrolysis product of the dimethyl-imino compound XIV.

```
                         NCH3
                        /    \
                      CO      CO
                      |       |
CH2—CH2           C ———————CH
|        \      /  |         |
|         C     |         |
|        /      \  |         |
CH2—CH2           CH ——————CO
```
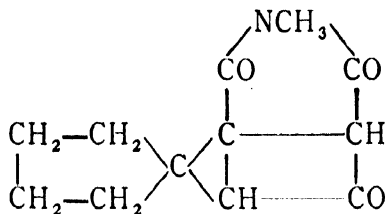
The dimethyl-imino compound XIV (1 gram) was treated with 20% hydrochloric acid (20 c.c.) and refluxed for about 5 hours on a sand bath, cooled, and extracted with ether. The ether was evaporated under reduced pressure. The crystals separated out from ethyl alcohol in beautiful needles m.p. 143° (turns brown) (Found: C, 65·6; H, 5·9; N, 6·3; $C_{12}H_{13}NO_3$ requires C, 65·7; H, 5·9; N, 6·4.). The identity of this compound with that of the compound XIII was obtained by the method of mixed melting point which was 143° (turns brown).

8. The action of potash on the di-imino compound VII in cold.

```
                         NK
                        /  \
                      CO    CO
                      |     |
CH2—CH2           C ——— CH
|        \      /  |     |
|         C     |     |
|        /      \  |     |
CH2—CH2           C ——— C: NH
                      |
                      CO2Et
```
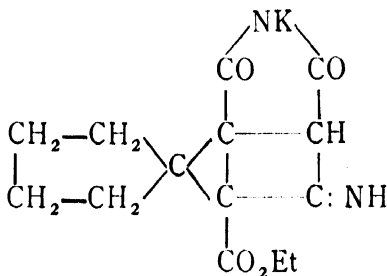
The di-imino compound (1 gram) on treatment with 5% solution of potassium hydroxide (20 c.c.) went into solution, and after a short time a thick precipitate of the potassium salt settled down. It was filtered off, washed with a small quantity of ethyl alcohol and then with ether and dried. (Found: K, 12·3; N, 8·5; $C_{14}H_{15}N_2O_4K$ requires K, 12·5; N, 8·9.)

The author desires to thank Professor C. K. Ingold., F.R.S. under whose guidance most of the work described above was carried out at the University College, London.

The di-imino compound VII (1 gram) was treated with 20 per cent. hydrochloric acid (20 c.c.) and refluxed for about five hours on a sand bath. The solution was cooled and extracted with ether. On evaporating the ether under reduced pressure a white solid was obtained. This was recrystallised from Xylene. It forms white needles m.p. 208° (decomposes). (Found: C, 64·3; H, 5·3; N, 6·8; $C_{11}H_{11}NO_3$ requires C, 64·4; H, 5·3; N, 6·8.)

4. Methylation product of the di-imino compound VII

```
                    N·CH3
                  /       \
                CO         CO
                |           |
CH2—CH2\      /C-----------CH
|        >C<   |            |
CH2—CH2/      \C-----------C: NH
                |
              CO2Et
```
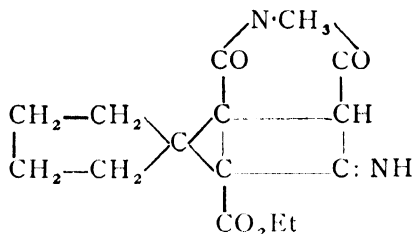
The di-imino compound VII (1 gram) was dissolved in 7 c.c. of sodium ethoxide (prepared by dissolving 5 grams of sodium in 100 grams of ethyl alcohol) and 2 grams of methyl-iodide was then added. The whole mixture was refluxed on a water bath for about three hours, and cooled, when white long needles of the methylated compound separated out. These were recrystallised from ethyl alcohol m.p. 145°. (Found: C, 61·9; H, 6·2; N, 9·5; $C_{15}H_{18}N_2O_4$ requires C, 62·0; H, 6·2; N, 9·6.)

5. Hydrolysis product of the methylated compound XII.

```
                    N·CH3
                  /       \
                CO         CO
                |           |
CH2—CH2\      /C-----------CH
|        >C<                |
CH2—CH2/      \CH----------CO
```
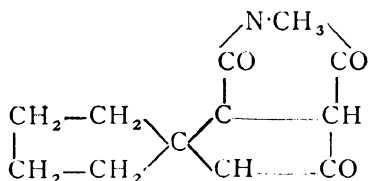
The methylated compound XII (1 gram) was treated with 20 per cent. hydrochloric acid (20 c.c.) and refluxed for about five hours on a sand bath. The solution was extracted with ether twice, and the ether evaporated under reduced pressure. The product was crystallised from ethyl alcohol when prismatic needles were obtained m.p. 143° (turns brown). (Found: N, 6·1; $C_{12}H_{13}NO_3$ requires N, 6·3.)

6. Product obtained by the fusion of keto-ester V with methyl-amine acetate.

```
                    NCH3
                  /      \
                CO        CO
                |          |
CH2—CH2\      /C----------CH
|        >C<   |           |
CH2—CH2/      \C----------C·NCH3
                |
              CO2Et
```
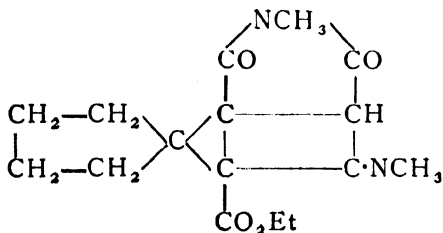
This ester was prepared by the method of Ingold, Lanfear, and Thorpe (J.C.S., 1923, **123**, 3147.,). The ester thus obtained was then distilled under reduced pressure. b.p. 195°/0·06 m.m. It was a colourless oily liquid. (Found: C, 61·8; H, 6·9; $C_{18}H_{24}O_7$ requires C, 61·4; H, 6·8.)

2. Ethyl-5-cyclopentane-spirodicyclopentane-1:2-dicarboxyimide-3-ketimino-4-carboxylate.

```
                     NH
                   /    \
                 CO      CO
                 |        |
CH2—CH2\       /C———————CH
|        \C<   |          |
CH2—CH2/       \C  ·····  C: NH
                 |
                CO2Et
```
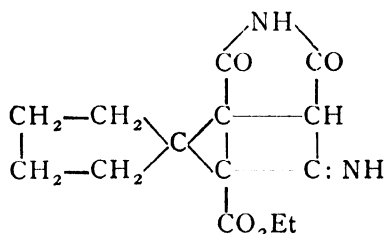
The keto-ester (5 grams) was slowly added to ammonium acetate (25 grams) at 130°. After keeping at this temperature for 15 minutes the mass was poured into cold water. The precipitate solidified in a few minutes and was filtered off. A blue coloured solid was obtained m.p. 221° (dec) separating from ethyl alcohol in white needles m.p. 225–27° (dec). (Found: C, 60·5; H, 5·7; N, 10·01; $C_{14}H_{16}N_2O_4$ requires C, 60·8; H, 5·8; N, 10·0.)

3. Products obtained by hydrolysing the di-imino compound VII with hydrochloric acid.

(*a*) **Ethyl-5- cyclopentane-spirocyclopentane-1:2-dicarboxyimide-3-one-4- carboxylate :—**

```
                     NH
                   /    \
                 CO      CO
                 |        |
CH2—CH2\       /C———————CH
|        \C<   |          |
CH2—CH2/       \C  ·····  CO
                 |
                CO2Et
```
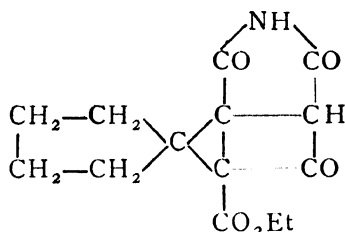
The di-imino compound (1 gram) was treated with 20 per cent. hydrochloric acid (20 c.c.) and refluxed for about 10 minutes on a sand bath, cooled, and extracted with ether. The above compound crystallised from water in white needles. m.p. 196–97° (decomposes). (Found. C, 60·8; H, 5·4; N, 5·1; $C_{14}H_{15}NO_5$ requires C, 60·6; H, 5·4; N, 5·0.)

(*b*) **Ethyl-5-cyclopentane-spirodicyclopentane-1 : 2-dicarboxy-imide-3-one.**

```
                     NH
                   /    \
                 CO      CO
                 |        |
CH2—CH2\       /C———————CH
|        \C<   |          |
CH2—CH2/       \CH—————CO
```

```
                                  NCH3
                                 /    \
                               CO      CO
                                |       |
           CH3i    CH2—CH2      C.......CH   Hydrolysis
VII.      ----->   |        >C<  |       |   ---------->
                   CH2—CH2      C.......C : NH
                                |
                               CO2Et
                          XII.
```

```
                                  NCH3
                                 /    \
                               CO      CO
                                |       |
 Hydrolysis        CH2—CH2      C-------CH
 --------->                 >C<  |       |
                   CH2—CH2      CH------CO
                          XIII.
```

```
                                  NCH3
                                 /    \
                               CO      CO
                                |       |
     on fusion with  CH2—CH2    C-------CH   Hydrolysis
V.   ------------->          >C< |       |   --------->
      Methylamine    CH2—CH2    C-------C : NCH3
        acetate                 |
                               CO2Et
                          XIV.
```

```
                                  NCH3
                                 /    \
                               CO      CO
                                |       |
                   CH2—CH2      C.......CH
                   |        >C<  |       |
                   CH2—CH2      CH......CO
                          XV.
```
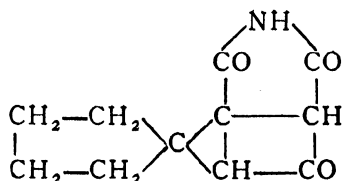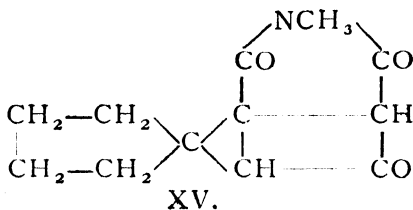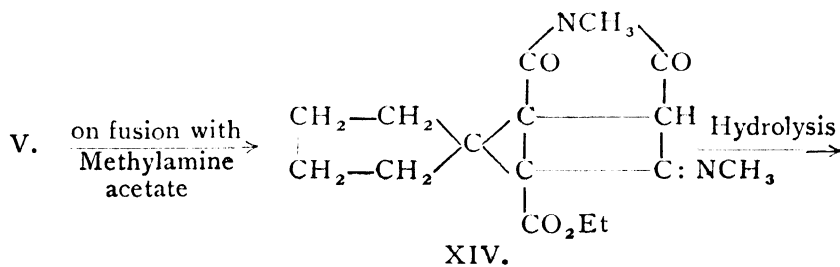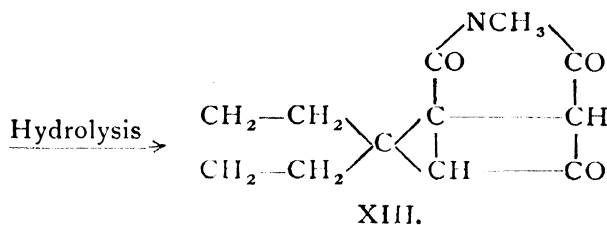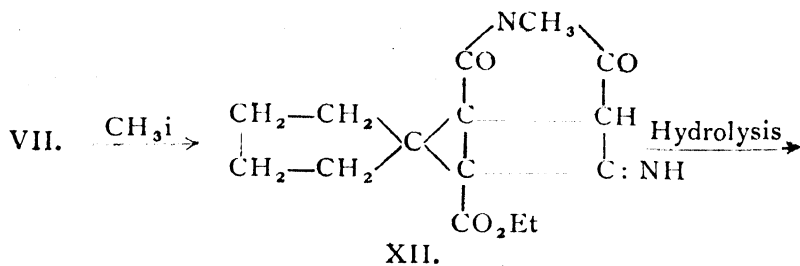
Compounds XIII and XV are identical.

EXPERIMENTAL

Ethyl-5-cyclopentane-spirodicyclopentane-3-one-1:2:4-tricarboxy-late.

```
                       (1)           (2)
CH2—CH2              C (CO2Et)—CH.CO2Et
|        \  C  /                   |
CH2—CH2  / (5) \     C (CO2Et)—CO
                       (4)           (3)
```
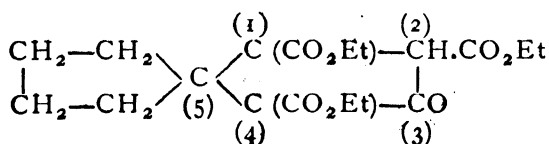
On the basis of the results of Goss (loc. cit.) it was considered interesting to investigate similar compounds but with slightly modified structure, such as the imino derivative of the keto-ester V. Fusion of the keto-ester with ammonium acetate yielded a crystalline compound containing two nitrogen atoms to which constitution VII was assigned. With cold concentrated aqueous potash it gave a mono potassium salt VIII.

$$\begin{array}{ccccc} & & & NH & \\ & & CO & & CO \\ & & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & CH \\ | & >C< & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & C:NH \\ & & | & & \\ & & CO_2Et & & \end{array} \qquad \begin{array}{ccccc} & & & NK & \\ & & CO & & CO \\ & & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & CH \\ | & >C< & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & C:NH \\ & & | & & \\ & & CO_2Et & & \end{array}$$

VII. VIII.
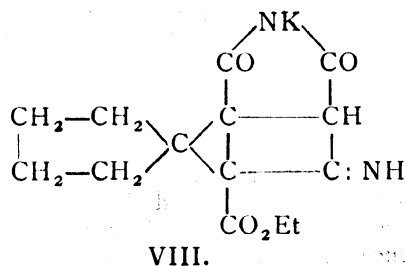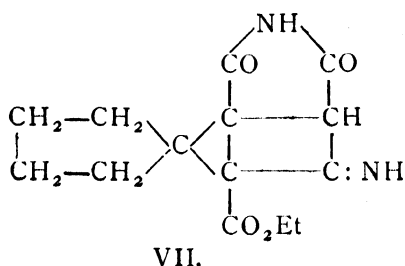
Despite many attempts varying the ratio of keto-ester and ammonium acetate and the conditions, the derivative of the type IX corresponding to an imino group in place of the keto group could not be obtained. With smaller amounts of ammonium acetate the only recognised products were the di-imino compound VII and the unacted-upon keto-ester V.

$$\begin{array}{cccc} CH_2—CH_2 & & C\,(CO_2Et)— & CH.CO_2Et \\ | & >C< & | & | \\ CH_2—CH_2 & & C\,(CO_2Et)— & C:NH \end{array}$$

IX.
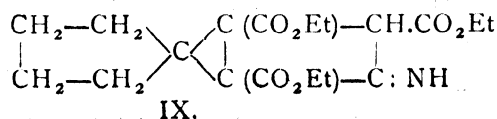
This fact may at once cause a serious divergence in structure between the present series of compounds and the keto-ester owing to the top ring closure.

Confirmation of the constitution of VII was obtained by a study of its hydrolysis and methylation products. On acid hydrolysis of the di-imino compound VII for a short time one of the imino groups is hydrolysed to a keto group and on prolonged hydrolysis loss of a carbethoxyl group results in accordance with the following scheme.

$$VII \longrightarrow \begin{array}{ccccc} & & & NH & \\ & & CO & & CO \\ & & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & CH \\ | & >C< & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & CO \\ & & | & & \\ & & CO_2Et & & \end{array} \longrightarrow \begin{array}{ccccc} & & & NH & \\ & & CO & & CO \\ & & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & C & —— & CH \\ | & >C< & | & & | \\ CH_2—CH_2 & & CH & —— & CO \end{array}$$

X. XI.
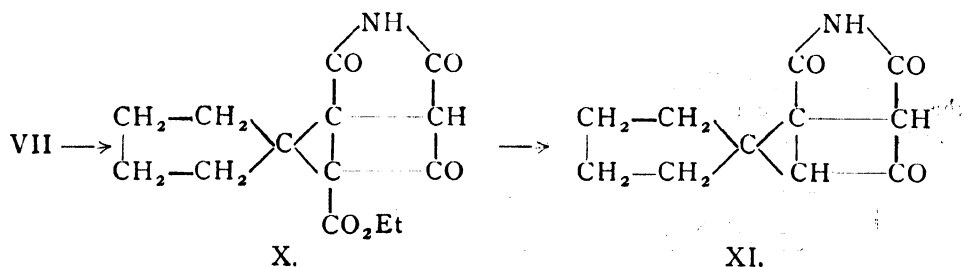
The course of the methylation experiments is shown in the following scheme. The position of the alkyl group was checked by prolonged hydrolysis of the methyl derivative obtained by substituting methylamine acetate for ammonium acetate.

A NITROGEN DERIVATIVE OF THE CYCLOPENTANE SERIES. SYNTHESIS AND CONSTITUTION OF ETHYL-5-CYCLOPENTANE-SPIRODICYCLOPENTANE-1: 2-DICARBOXYIMIDE-3-KETIMINO-4-CARBOXYLATE.

BY

KAZI MOINUDDIN

Farmer and Ingold (J.C.S., 1920, **117**, 1362) studied certain bridged ring compounds such as the derivative I and II of dicyclopentene (cyclopentadiene) first prepared by Perkin and Thorpe (J.C.S., 1901, **79**, 729) and noticed that under the influence of certain reagents they are capable of reacting as if they were unsaturated

```
CH3\    /C (CO2Et)—C.CO2Et           CH3\    /C (CO2Et)  C.CO2Et
    >C<  |         ||         --->        >C<            |
CH3/    \C (CO2Et)—C.OH       <---   CH3/    \C (CO2Et)=C.OH
   I.                                    II.
```
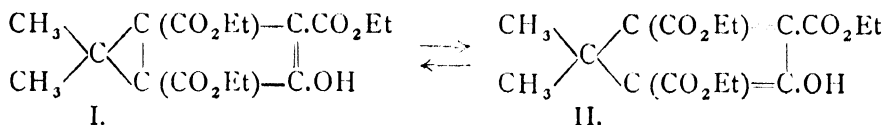
isomerides. They called this phenomenon Intra-annular tautomerism as it involves a valency exchange across and within the cyclopentane ring and no transmigration of hydrogen atom takes place.

Later on Ingold, Seeley, and Thorpe (J.C.S., 1923, **123**, 853) reduced the stability of the bridged phase by replacing the gem-dimethyl group in esters I and II by the cyclohexane ring and studied the effect of different oxidising agents and proved the presence of the bridged phase.

```
     /CH2—CH2\    /C (CO2Et)—C.CO2Et       --->
CH2<           >C<  |         ||
     \CH2—CH2/    \C (CO2Et)—C.OH          <---
               III.

                 /CH2—CH2\    /C (CO2Et)=C.CO2Et
  --->    CH2<           >C<              |
  <---           \CH2—CH2/    \C (CO2Et)=C.OH
                          IV.
```
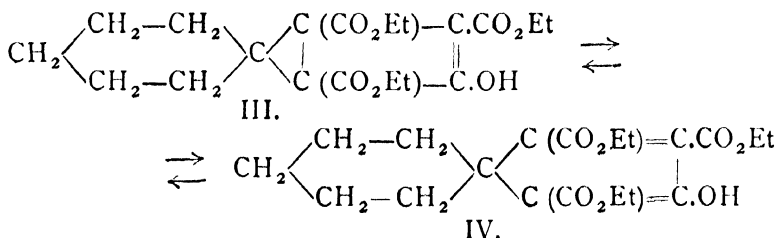
Further Goss (J.C.S., 1928, 1306) investigated the reactions and degradations of the following system in which the importance of the bridged phase has been shown to be greater than amongst the corresponding cyclo-hexane spiro-compounds.

```
CH2—CH2\    /C (CO2Et)—C.CO2Et      --->
 |       >C<  |         ||
CH2—CH2/    \C (CO2Et)—C.OH         <---
        V.

          CH2—CH2\    /C (CO2Et)=C.CO2Et
  --->     |       >C<              |
  <---    CH2—CH /    \C (CO2Et)=C.OH
                    VI.
```
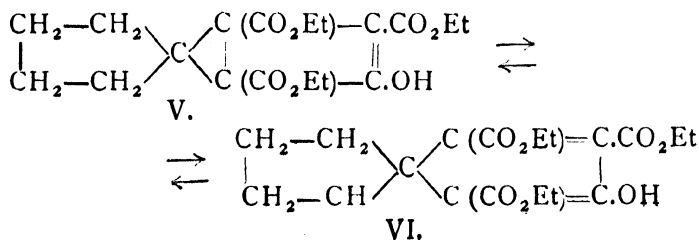
4. Tanatar's compound has the composition

Na : CO_2 : O (active).

2·71 ; 1·21 : 1 Therefore its formula would be Na_2CO_4, $1\frac{1}{2}$ H_2O.
As the compound practically liberates no iodine from a neutral solution of potassium iodide, it is not a true percarbonate but an additive compound of hydrogen peroxide and sodium carbonate with half a molecule of water of crystallisation

(Na_2CO_3, H_2O_2, $\frac{1}{2}$ H_2O).

Properties of the Compounds.—These compounds are white in colour, possessing alcohol of crystallisation. They are stable, but lose oxygen slowly and are completely decomposed in a few months. They liberate hydrogen peroxide when heated cautiously. Ether extracts hydrogen peroxide from these compounds and the ethereal solution gives characteristic reactions of hydrogen peroxide. The compounds do not liberate any appreciable amount of iodine from a neutral solution of potassium iodide even in 24 hours.

Conclusions

The experiments of Wolffenstein and Peltner were repeated. It was found that the two compounds $Na_2C_2O_6$ and Na_2CO_4, $1\frac{1}{2}$ H_2O are mixtures of sodium carbonate and bicarbonate in various proportions with a slight amount of active oxygen probably due to the presence of traces of sodium peroxide or sodium hydroperoxides; the third compound $Na_2C_2O_6$, H_2O_2 appears to be $Na_2CO_3 + NaHCO_3 + H_2O_2, xC_2H_5OH$. They have alcohol as alcohol of crystallisation in their composition. The formula of the Tanatar's compound Na_2CO_3, H_2O_2, $\frac{1}{2}$ H_2O is confirmed by the present investigation.

References

1. Constam and Hansen, Z. Elektrochem., 1896-7, **3**, 137.
2. Tanatar, Ber., 1899, **22**, 1544.
3. Wolffenstein and Peltner., Ber., 1908, **41**, 280.
4. Riesenfeld and Reinhold, Ber., 1909, **42**, 4377.
5. Riesenfeld and Mau, Ber., 1911, **44**, 3495.
6. Riesenfeld and Mau, Ber., 1911, **44**, 3589; Riesenfeld, Ber., 1910, **43**, 566.
7. Hansen, Z. Elektrochem., 1896-7, **3**, 455; Brown, J. Amer. Chem. Soc., 1905, **27**, 1222.

PERCARBONATES

By

RANGNATH RAO KAMTIKAR AND SYED HUSAIN

Potassium and rubidium percarbonates were prepared by Constam and Hansen[1] by electrolysing concentrated solutions of carbonates at low temperatures.

$$2MCO'_3 + 2\oplus = M_2C_2O_6$$
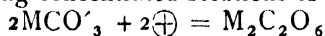
where M represents an alkali metal.

Tanatar[2] found that when sodium carbonate is dissolved in cold, 3 per cent hydrogen peroxide and the solution precipitated with alcohol a white precipitate is obtained, which has a formula Na_2CO_4, $1\frac{1}{2}$ H_2O. But this was later proved to be Na_2CO_3, H_2O_2, $\frac{1}{2}$ H_2O. Wolffenstein and Peltner[3] obtained a new series of percarbonates by the action of carbon dioxide on sodium peroxide or on sodium hydro-peroxide. To these new compounds they assigned the formulæ Na_2CO_4, $Na_2C_2O_6$, and $Na_2C_2O_6$, H_2O_2. The compound $K_2C_2O_6$ prepared by electrolysis has the same formula as $Na_2C_2O_6$ of Wolffenstein and Peltner and yet they act differently towards a neutral solution of potassium iodide, i.e. electrolytically prepared $K_2C_2O_6$ liberates iodine quantitatively[4] whereas Wolffenstein and Peltner's $Na_2C_2O_6$ liberates 50 per cent. of iodine only.[5] When Tanatar's salt is added to a neutral solution of potassium iodide practically there is no liberation of iodine.[6]

Some hold that the compounds prepared electrolytically are true percompounds and those prepared by the action of hydrogen peroxide are additive compounds. Hence the present work was undertaken with a view to find out the nature of the salts of Wolffenstein and Peltner and that of Tanatar.

Experimental

Great care was taken to ensure the purity of the materials used. They were all obtained pure from Merck or Kahlbaum.

Altogether 4 compounds were prepared carefully according to the methods given by their authors, and analysed. The active oxygen was determined by titrating with potassium permanganate solution,[7] and sodium and carbon dioxide by titrations with hydrochloric acid, using phenolphthalein and methyl orange respectively as indicators.

1. The compound $Na_2C_2O_6$ was found to have the composition

Na : CO_2 : O (active).

6·3 : 4·3 : 1 So that its formula would be $Na_6C_4O_{13}$ or in a simple from $2Na_2CO_3 + 2NaHCO_3$ with some alcohol of crystallisation and a little active oxygen.

2. The compound $Na_2C_2O_6$, H_2O_2 has the composition

Na : CO_2 : O (active).

3·3 : 2·4 : 1 So that its formula would be $Na_3C_2O_7$ or in a simple from $Na_2CO_3 + NaHCO_3 + H_2O_2$. This compound liberates very little iodine when treated with a neutral solution of potassium iodide.

3. The compound Na_2CO_4, $1\frac{1}{2}$ H_2O possesses the composition

Na : CO_2 : O (active).

26·3 : 15·5 : 1 So that its formula would be $Na_{26\cdot3}C_{15\cdot5}O_{45}$ or in a simple form $4Na_2CO_3 + NaHCO_3$.

does when he makes, for example, a sketch of a tower of Notre Dame . . . For the real and internal organisation of the thing he substitutes, then, an external and schematic representation."[1] Compare further the resemblance in expression; when applied to reality the intellect "goes all round it, taking from the outside the greatest possible number of views of it, drawing it into itself, instead of entering into it."[2] The point is the same, that is to say the intellectual attempt to reconstitute the objects by external means, by the juxtaposition of rigid and superficial concepts, does not enable us to grasp the inner life and essence of the things. Concepts cannot grasp what is unique and absolute in the object but divide its "concrete unity into so many symbolical expressions." What constitutes the reality of things "cannot be perceived from without"[3] nor "can it be expressed by symbols being incommensurable with everything else."[3] In this way, then, Bergson like Schopenhauer, maintains that if philosophy is to be saved from degenerating into a "play of ideas", "it must transcend concepts in order to reach intuition;"[4] it must do away with rigid and "ready-made" abstractions or concepts; it must go beyond them to feel the heart of things and the pulse of life by a way or method of its own which is strictly *not* scientific or conceptual but instinctive or intuitional. It is concepts that divide philosophy into distinct schools each of which "carries on with other a game that will never end."[5] A complete and radical change in the method of philosophy is thus suggested by Bergson in the same way as it was urged by Schopenhauer himself.

[1] *Intro. to Metaphysics*, pp. 22, 23.
[2] *Creative Evolution*, p. 186.
[3] *Intro. to Metaphysics*, p. 4.
[4] *Ibid.*, p. 18.
[5] *Idem.*

*

instead of penetrating into the inner being of things, places us outside and thus gives us an artificial and phenomenal knowledge. We take snapshots, as it were, of the reality. Thus, adds Bergson, "perception, intellection, language, so proceed in general." [1]

The limitations of this method of symbolism which gives us only an "artificial reconstruction of the object" are insisted upon by Bergson in several different passages in all his writings. By juxtaposing artificial static concepts it is useless to believe that "we can seize a reality of which they present to us the shadow alone." [2] Besides producing this sort of illusion they are liable to a great danger. They are misleading for they generalise at the same time as they abstract.[2] It is by making the particular property of an object common to an infinite number of other objects that the concept can symbolise it and in this way it deforms the property by the vast extension that it gives to it,[3] so that it no longer coincides with the object. It is this "artificiality," this "generality" and rigidity" of the concepts that makes them incapable of replacing "intuition" which comprehends by a simple act the very life and reality of the object, that which is "essential and unique in it."

This criticism of conceptual knowledge in general is applied to science in particular, for "positive science is the work of pure intellect." [4] Bergson agrees in effect with Schopenhauer that all positive sciences working with conceptual analysis and synthesis can give us only a symbolical and relative knowledge. "All analysis," Bergson points out, "is a translation, a development into symbols, a representation taken from successive points of view from which we note as many resemblances as possible between the new object which we are studying and others which we believe we know already." [5] Thus in order to complete its representation analysis multiplies its points of view indefinitely but then it can never give us a perfect representation of the real. Being merely a translation of the reality into conceptual symbols, it always remains imperfect and incomplete. Bergson makes this point clear by the use of various striking examples which all bring out forcibly the "unoriginality," the "relativity," the "superficiality" and "the artificial construction" of scientific or conceptual analysis and furnish him with a strong proof of its character as practical and instrumental, a mere convenient aid to action but without metaphysical significance, the object of metaphysics being to grasp the reality, not its representation, the original, not its translation.

It was also in reference to conceptual or scientific knowledge (which was to him nothing more than an indirect knowledge useful for the sake of action) that Schopenhauer had said; "Wir sehen schon hier, dass von aussen dem Wesen der Dinge nimmermehr beizukommen ist; wie immer man auch forschen mag, so gewinnt man nichts, als Bilder und Namen. Man gleicht einem, der um ein Schloss herumgeht, vergeblich einen Eingang suchend und einstweilen die Fassaden skisserend. Und doch ist dies der Weg den alle Philosophen vor mir gegangen sind." [6] The way from without ("von aussen") is the way of conceptual knowledge which, as Schopenhauer points out, has been followed by all the philosophers before him. Schopenhauer, as we have seen, attributes the failure to attain the end that each philosopher set out with the intention of reaching to the method which they all adopted. For the intellectual apprehension which is the method of science he substitutes intuitive method. It is remarkable that Bergson in pointing out the artificiality and symbolical externality of concepts (which are to him nothing but "cadre intellectual" or "rubrique") expresses himself in the very same manner. The simile which he makes use of in expressing the idea that it is a vain attempt to try to arrive at the reality and life of things with the help of concepts is, indeed, very similar. Thus he writes; "It is like what an artist passing through Paris

[1] *Creative Evolution*, p. 323.
[2] *Intro. to Metaphysics* (Eng. Trans.), p. 16.
[3] *Ibid.*
[4] *Creative Evolution*, p. 206.
[5] *Intro. to Metaphysics*, pp. 6-7.
[6] *G.* i. 150.
Haldane and Kemp, i. 128.

special "work that is being accomplished." This, then, accounts also for the incapablity of the intellect to grasp reality, i.e. Duration, for "reality appears as a ceaseless upspringing of something new which has no sooner arisen to make the present than it has already fallen back into the past." Our intellect being accustomed to think the moving by means of the immovable is thus incapacitated to grasp true duration which is the "very substance of things." "It has no direct vision of reality." Its proper object is that which is singled out of reality for *practical interest.* Thus what the intellect grasps of the real is *static*, *relative*, *mechanical*, *symbolical.* And this Bergson points out is the "natural metaphysic of the human mind" against which, however, we should be strictly on our guard. Otherwise we shall be committing the fallacy of the intellectualist philosopher, that is, of importing into speculation a procedure made for practice.

The genuine anti-intellecutualism of Bergson is then the result of this metaphysics of life and duration, as the anti-intellectualism of Schopenhauer was that of the metaphysics of the Will. This materialising or spatialising by the intellect of what is in its very nature opposed to all spatial categories, distinguishes Bergson's treatment of the intellect from that of Schopenhauer. But the result of the investigation in both cases seems to establish the same thesis. The intellect is condemned by both and is shown to be merely a practical tool which, for the interest of action, *falsifies reality.* But in both cases as it is clear, the doctrine of the essentially instrumental office of the intellect *alone* need not have any radical anti-intellectualistic consequences for on the mere ground of instrumentalist epistemology one cannot maintain that besides the knowledge which our intellect affords, the reality is known, in a quite different way, to have a definite quality other than what our intellect reveals. But this latter, as has been amply proved, is exactly the procedure adopted by Schopenhauer and Bergson alike.

IV

From Bergson's treatment of the nature of the intellect and its operations we are enabled to understand the nature of the concept. "Concepts are, in fact, outside each other, like objects in space and they have the same stability as such objects on which they have been modelled. Taken together, they constitute an 'intelligible world' that resembles the world of solids in its essential characters but whose elements are lighter, more diaphanous, easier for the intellect to deal with than the images of concrete things; they are not, indeed, the perception itself of things, but the representation of the act by which the intellect is fixed on them.[1] The concepts are, thus, mere symbols derived from the consideration of solid bodies and express the relations that exist between them; they remain distinct and external like the solids on which they are modelled.[2] They are formed into a system but the system itself like its component parts is stereotyped and fixed. The intellect is thus shown to carry a 'latent mechanism of geometry' within itself which shapes itself into logic, and that "logic and geometry engender each other."[3] It is, therefore, why "our logic triumphs in . . . . geometry."[3] Conceptual knowledge, thus, can at best be only external and symbolical. It reduces the non-spatial creative reality to "a geometrical diagram."

Bergson thus repeatedly tells us that concepts (idees abstractes) can never give us the reality of things which on account of its 'uniqueness' always escapes from the grip of all conceptual analysis. To illustrate conceptual knowledge Bergson compares it to the mechanism of the cinematograph.[4] Just as there is no movement in the snapshot views on the screen *themselves* but only in *the machine* which gives us not real movement itself but an *imitation* by making the snapshots replace each other very rapidly, so also the "mechanism of our thought" works in the same manner and

[1] *Creative Evolution*, p. 169.
[2] *Ibid.*, p. 169.
[3] *Ibid.*
[4] *Ibid.*, pp. 322–33.

speculation, he insists, that is responsible for many of the "difficulties hitherto inherent in all metaphysics, the antinomies which it raises, the contradictions into which it falls, the division into antagonistic schools and the irreducible oppositions between systems". Following his instrumentalist epistemology Bergson like Schopenhauer (and the pragmatists, of course) declares that the intellect gives us truths only 'relative to our faculty of action",[1] but with Schopenhauer, again, leaves pragmatism behind, and once more like him (Schopenhauer) is determined by his own metaphysical conclusion when he asserts that one can grasp the reality absolutely (instead of knowing it relatively) if one turns *away from* the intellect and *towards* intuition which dispenses with symbols and seizes (directly and immediately) the reality in its purity and perfection. In proportion as we compel ourselves to "transcend pure intelligence", Bergson emphasises, we shall get back more and more completely to the reality which is the essence of all phenomenal existence.[2] Thus Bergson (like Schopenhauer) would free philosophy from "the last traces and symptoms of scientific rationalism" by ascribing to it a function according to which "we must break with scientific habits which are adapted to the fundamental requirements of thought, we must do violence to the mind, go counter to the natural bent of the intellect."

In effect, then, Bergson's anti-intellectualism, like that of Schopenhauer, is mainly determined by his metaphysical position. But to understand Bergson's metaphysical position and to differentiate it from that of Schopenhauer we have to recall the result of our previous discussion. Bergson maintains as hinted above, that the genesis of intellect and the genesis of matter are correlative inasmuch as "both are derived from a wider and a higher form of existence."[3] This higher form of existence or the absolute (which Bergson calls 'Duration' or "elan vital" and which is "revealed very near us and in a certain measure in us" by means of "intuition") is a "flow", a "tendency", not a being; it is becoming and is "the very life of things, the fundamental Reality." Bergson holds further that this reality whose evolution presents "a ceaseless upspringing of something new" is "momentarily interrupted",[4] or "arrested" or "distends" (no one knows why, and M. Bergson does not tell us why) and as such is the principle of matter and extension. Matter is thus nothing but the relaxation or diminution or detention[5] of the life-current. The interruption or relaxing of the life-current causes it to congeal and the congealed parts are matter. And just as matter and mind are of the same nature, so also as we have seen above, matter and intellect are in their turn of the same nature. The life-current turning its attention "on the matter it was passing through" turned in the direction of intellect just as it turned in that of 'instinct' or 'intuition' when it fixed its attention on its own movements. It had, thus, to go in "two opposite ways."[6] And so we are told that "intellectuality and materiality are of the same nature and have been produced in the same way" inasmuch as the life-current cannot pass through matter without settling on it without adapting itself to it, and this adaptibility is what we call intellectuality.[7]

And now we can see more clearly why matter is determined by intelligence and why there is between them an evident agreement; why the moulds of intellect are fashioned on matter, why "its chief object is the unorganised solid"; "it is never at home except when working on inert matter. It is extended; it presents to us objects external to other objects, and in these objects, parts external to parts." "Its habits and views are static." Constructed from the very beginning as an instrument of action on matter, it acts and knows that we are acting and is guided and ruled by the

[1] *Creative Evoluion*, p. 206.
[2] *Ibid.*, p. 210.
[3] *Ibid.*, p. 197.
[4] *Ibid.*, p. 253; also p. 222.
[5] *Ibid.* pp. 222, 250 ff.
[6] *Ibid.*, p. 281.
[7] *Ibid.*, p. 285.

the common postulate that "perception has an entirely speculative interest, it is pure knowledge." But as has been shown, this postulate—according to which "to perceive" is "to know"—is contradicted by the study of the nervous structure in the entire animal series. The office of perception is not to supply us with knowledge but the conditions that are necessary for action. Perception is thoroughly practical and utilitarian in character and has reference to bodily action alone. Perception is nothing but selection from reality. We select those objects which have a practical interest for us and discard those that have no interest for our needs or, more generally, for our functions and perception results "just from the omission of that in the totality of matter which has no interests for our needs"; and the means of this selection is our body which is organised to exclude those influences that have no practical concern.[1]

The practical and utilitarian aspect of perception is an important teaching of Bergson and is much emphasised by him. "What I see and hear of the outer world" he writes in *Laughter* (p. 151.) "is purely and simply a *selection made by my senses to serve as a light to my conduct*; what I know of myself is what comes to the surface, what participates in my actions. My senses and my consciousness, therefore, give me no more than a practical simplification of reality in the vision they furnish me of myself and of things, the differences that are useless to man are obliterated, the resemblances that are useful to him are emphasised, ways are traced out for me in advance along which my activity is to travel. These ways are the ways which all mankind has trod before me. Things have been classified with a view to the use I can derive from them." This agrees with Schopenhauer's contention that those things only are known which have some interest to the individual, that is, are related to the will to live.[2] We perceive in Nature what interests us in the way of our vital needs. It further follows that all those concepts which are detached from the needs of life and serve no practical purpose are of little value or significance. Schopenhauer also protests against this "systematic misuse of concepts", and the pragmatic reference of a concept to its perceptual terminus in order to prove its validity, seems to be simply another proof of its vital connection with the perceptual order. Bergson holds that all the fundamental concepts of science and common sense have only a relative and practical character and are meant for particular use; they do not serve any general or final purpose. They minister to the utilitarian and practical needs of life. Thus, the whole knowledge of the world is necessarily a knowledge in terms of our practical purposes. Our whole mental life is again purposive and what we think about and what we believe is determined more largely than we realise by our interests and desires. The world of our experience is coloured by our practical aims. Our perception, as we noted above, reveals to us only those aspects of the world which are in some way related to our practical needs and interests. Thus Bergson by emphasising the fact that perception consists in the omission of that which has no interest for the vital needs of our life, has brought out forcibly a very valuable truth which, as we know, is the soul of pragmatism.

III.

In all this the pragmatist tendencies of Bergson's thoughts are manifestly clear. But, like Schopenhauer Bergson seems to transcend pragmatism when he points out that the supreme mistake of the philosopher lies in importing to the realm of philosophy a method of thinking that was originally designed for the sake of action. The function of the intellect is "to *act* and to know that we are acting"[3], it is not its function to *speculate*. It is the intrusion of the practical intellect in the sphere of

[1] Cf. *Matter and Memory*, pp. 28–29; "They (living beings) allow to pass through them, so to speak, those external influences which are indifferent to them, the others isolated, become 'perceptions' by their very isolation."
[2] Cf. Haldane and Kemp, Vol. 1, p. 229.
[3] *Creative Evolution*, pp. 201–202.

of tools and instruments, in manufacturing artificial objects which minister to the practical and utilitarian purposes of human life. It has been evolved for the maintenance and furtherance of our lives, to utilise the means that promote our practical welfare, to show us the way out of difficult circumstances, in a word, to be of every practical use to us. And it is only for the purpose of practical action that it materialises the world covering it with three-dimensional homogeneous space, rendering arbitrary divisibility possible in order to deal with reality instrumentally. It is for the same purpose that the intellect 'spatializes' time, conceiving it as something homogeneous and then splitting it up into discontinuous units and thus manipulating reality for its own practical needs. Thus each and every function of the intellect shows that by its nature it is a thoroughly practical tendency fashioned as a tool for the pragmatic purpose of life.

II

There is one more important point in Bergson's anti-intellectualism which is distinctive of him and is to be found neither in Schopenhauer nor in the pragmatists, but nevertheless supports the general doctrine as regards the practical nature of consciousness. This is the striking truth that Bergson emphasises in his *Matiere et Memoire* that the brain is an organ of action rather than an organ of thought and that the "body is an instrument of action" only. Bergson endeavours to establish this truth by a consideration of the nervous system from one end of the animal series to the other. The structure of the nervous system, as even a superficial examination of this will disclose, is designed for action and action alone. He points out that the difference between what is called the perceptive faculty of the brain and the reflex functions of the spinal cord, is only a difference of degree, and not of kind. There is only a difference of more or less complications. In the case of a reflex action, what happens is that the centripetal movement which is excited by the external stimulus is "reflected at once by the intermediary of the nerve centres of the spinal cord, in a centrifugal movement determining a muscular contraction".[1] The function of the cerebral system is a little more complicated than this. The movement communicated by the stimulus instead of directly proceeding to the motor cells of the spinal cord and thus causing a contraction "mounts first to the brain and then descends again to the very same motor cells of the spinal cord which intervened in the reflex action." Here the stimulus has choice of one or more systems of centrifugal movements. The brain is thus no more than a kind of "central telephonic exchange" whose office is to allow communication or to delay it but it adds nothing to what is received. It is only an "instrument of analysis in regard to the movement received and an instrument of selection in regard to the movement executed."[2] Thus in both cases its office is only the transmission and division of movement; neither in the cortical nor in the spinal cord do the nervous elements work with a view to knowledge.[3]

Thus our bodily structure and nervous organisations are directed towards action alone; our nervous system is an instrument of movements, and in it there is no apparatus to prepare representations. As the structure of the nervous system develops, becomes more and more complicated, the choice between different movements becomes wider and wider and thus an ever-increasing variety of conduct becomes possible. But if it is constructed from one end of the animal series to the other in view of action which becomes less and less necessary or automatic, must not perception which progresses with the nervous structure be also entirely directed towards action and not towards pure knowledge?[4] If we take this view of perception it becomes clear why idealism and realism fall into a sterile discussion. Both of these doctrines are based on

[1] *Matter and Memory* (Eng. Tr.), p. 18.
[2] *Ibid.*, p. 20.
[3] *Ibid.*, p. 20.
[4] *Ibid.*, p. 21.

of our intelligence is that of practical utility and "it is in view of practical utility that it has made its appearance in the world."[1] Hence intelligence is thus regarded as relative to the needs of action. And starting from action Bergson lays down that the intellect aims first of all at constructing and this construction or fabrication is exercised exclusively on inert matter, and of inert matter itself fabrication deals only with the solid.[1] "Our intelligence as it leaves the hand of Nature has for its chief object the unorganised solid."[2]

But it is natural to ask why does the intellect move about freely in solids? What is the general property of the material world which makes it appear to Bergson practically fit for the operation of the intellect? It is due to the *homogeneity* of the material world that the intellect acts so easily upon it. The intellect following the suggestions of the needs and wants of our practical life cuts up arbitrary parts in the continuity of the extended world and regards those parts as provisionally final.[3] This procedure facilitates the pragmatic purpose for which the intellect has come into existence. It is because of the homogeneity of space that arbitrary divisibility (or "the possibility of decomposing the matter as much as we please") is realised and this helps the intellect to fulfil its natural function; it 'affords a hold to our action'.[4]

But as we shall see presently, it is more on account of his conception that matter and intellect are of the *same* nature that Bergson is able to explain the adaptability of intellect to matter; for he maintains that "an identical process must have cut out matter and intellect at the same time from a stuff that contained both."[5] Thus intellect is a product, a "deposit" of the evolutionary process, "a flame perhaps accidental", "an emanation" or an "aspect" of life; for it is "a more precise, complex and subtle adaptation of the consciousness of living beings to the conditions of existence that are made for them."[6] And hence "intellect and matter have progressively adapted themselves one to the other in order to attain a common form."[7] The purpose of the adaptation is, as we said above, "to secure the perfect fitting of our body to its environment," "to represent the relation of external things among themselves", i.e. to "think matter." This explains why the intellect is "at home among inanimate objects, more especially among solids," and "traces the general configuration of matter."[8]

The pragmatic nature of the intellect is shown in still another different way. Intellect in its natural state, says Bergson "aims at a practically useful end."[9] Now from the practical point of view, the important thing in an object on which we are acting is not the progress by which it passes from one position to another, but its *actual* or future *positions*, its end. Our attention is mainly directed on the plan of execution. This serves our practical purpose. Our intellect gains nothing by dealing with the mobility itself, therefore it always starts with immobility. This is what it requires for its useful action. Its proper goal or natural destiny is action, and not speculation. It is meant for practical purposes only and, hence by virtue of its natural disposition, it is concerned with the stable and the unchangeable. Hence it forms a clear idea of what is immobile alone in the same manner as it forms a clear idea of the discontinuous.[10]

To sum up the pragmatist elements in the philosophy of Bergson, we might say that his anti-intellectuation rests ultimately upon his contention that the human intellect is designed for the sake of action and therefore it is related in the main to the needs of action; that our intellect finds itself at home in the domain of the physical and the mathematical sciences, and its skill is displayed in the mechanical construction

1 *Creative Evolution*, p. 159.
2 *Ibid.* p. 161 ff.
3 *Matter and Memory* (Eng. Trans.), p. 278.
4 *Creative Evolution*, p. 162.
5 *Ibid.* p. 199.
6 *Ibid.* Intro., pp. ix, xiii.
7 *Ibid*, p. 217.
8 *Ibid.* Int., xiv.
9 *Ibid.* p. 163.
10 *Ibid.* p. 164.

THE PRAGMATIST ELEMENTS IN THE PHILOSOPHY OF BERGSON

By

MIR VALIUDDIN

I

The pragmatist tendency of Bergson's thought is evident from the fact that according to him the original purpose for which our intellect is intended is " to represent the relations of external things among themselves ", to fulfil the utilitarian and practical purposes of life, to enable us "to secure the perfect fitting of our bodies to our environment. It is the "faculty of constructing unorganised, that is, artificial instruments"; it helps us "to distinguish in any circumstances whatsoever the means of getting out of a difficulty ", and thus to preserve our lives. It is thus essentially a practical instrument directed upon matter for the sake of action and, if it deals with the real nature of things, it does so only symbolically, being inherently incapable of grasping it in its essence. This view of the nature and function of the intellect is, as we know, in *essential* agreement with the view taken by Schopenhauer who may be considered as the forerunner of the pragmatists in this particular respect. In what follows I shall examine this view more closely and try to bring out clearly the affinities of Bergson's conception with that of Schopenhauer and the pragmatists.

Bergson considers *intellect* from the point of view of evolution and points out that it is "an appendage of the faculty of action" prompted by interest for practical utility. Its destination is thus entirely practical. Its business is to enable the organism to act successfully upon its environment. " Its function is to preside over action." An empirical study of evolution shows that since the appearance of man on the face of the earth the essential feature of human intelligence has been mechanical construction. From this point of view man might more fittingly be called *Home Faber* than *Home sapiens*. Thus considered in what seems to be its original feature, *intellect*, says Bergson, is " the faculty of manufacturing artificial objects, especially tools, and of indefinitely varying the manufacture."[1] If Nature has not endowed man with " organic instruments" to serve the purposes of his life, it is because it has fitted him with intelligence which enables him to vary the construction of the instruments according to the needs and circumstances of life. Unintelligent animals also possess tools or machines but here the instruments form a part of the body; they are 'organic instruments' and are invariable structures whose objects are also specific. But the needs of man are multifarious and their objects are also changing and variable. Therefore Nature has provided man with intelligence the main purpose of which is to help him to adapt himself to his environments in his struggle for existence. "The essential function of the intellect" says Bergson like Schopenhauer and the pragmatists, " is, therefore, to see the way out of a difficulty in any circumstances whatever, to find what is most suitable, what answers best to the question asked. Hence it bears essentially on the relations between a given situation and the means of utilising it."[2] And Bergson proceeds to point out that " what is innate in intellect, therefore, is the tendency to *establish relations.*" Knowledge necessarily bears on relations. Thus the knowledge which is characteristic

[1] *Creative Evolution* (Eng. Trans. by A. Mitchael 1911), p. 146.
[2] *Ibid.*, p. 158.

Now suppose that

$$(51) \quad \sum_n |w_n(t)| = c < 2c,$$

then we get from (50) on account of 22, (24) and (34):

$$(52) \quad \sum_n |\bar{w}_n(t) - \overset{(m)}{w}_n(t)| \leq \frac{M\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} r(r+1)^2(2c)^r . \sum_n |\bar{w}_n(t) - \overset{(m-1)}{w}_n(t)|,$$

$$< \frac{12M\pi^2 c}{1-36c} . \sum_n |\bar{w}_n(t) - \overset{(m-1)}{w}_n(t)| .$$

Repeating this inequality m-times we get:

$$(53) \quad \sum_n |\bar{w}_n(t) - \overset{(m)}{w}_n(t)| < \left(\frac{12M\pi^2 c}{1-36c}\right)^m \sum_n |\bar{w}_n(t) - \overset{(o)}{w}_n(t)| .$$

But $\sum_n | \bar{w}_n(t) - \overset{(o)}{w}_n(t) |$ is easily seen to be uniformly convergent for all t, and from (42) $\frac{12M\pi^2 c}{1-36c} < 1$, therefore

$$(54) \quad \lim_{m \to \infty} \sum_{n=1}^{\infty} | \bar{w}_n(t) - \overset{(m)}{w}_n(t) | = 0,$$

so that for all $t \geq 0$

$$\bar{w}_n(t) = \lim_{m \to \infty} \overset{(m)}{w}_n(t) = w_n(t) \qquad (n = 1, 2, \ldots)$$

The solutions $\bar{w}_n(t)$ and $w_n(t)$ are thus seen to be identical, which establishes the uniqueness of the solution (49).

Finally we remark that instead of taking the differential equation (1) to be of order 4, we can take it to be of any even order, and the method of this paper holds without any essential changes.

References—

I. M. R. Siddiqi: 'Zur Theorie der nicht-linearen Partiellen Differentialgleichungen vona para - bolischen Typus.' Math. Zeitschrift, Vol. 35 (1932).

II. M. R. Siddiqi: 'On an infinite system of non-linear integral equations.' Bulletin Calc. Math. Soc., Vol. 24 (1932).

From (21) we get then on making $m \longrightarrow \infty$:

$$(46)\quad w_n(t) = d_n \bar{e}^{n^4 t} + n^4 \int_0^t \bar{e}^{n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1,\ldots,l_r}^{1\ldots\infty} \frac{\overset{(n)}{a_{l_1,\ldots,l_r}}}{l_1^4 \ldots l_r^4} \times$$
$$\times\, w_{l_1}(s)\, w_{l_2}(s) \ldots w_{l_r}(s)\, ds,$$
$$(n = 1, 2, 3, \ldots).$$

We write again for all $n \geq 1$:

$$(47)\quad v_n(t) = \frac{1}{n^4} w_n(t),\ c_n = \frac{d_n}{n^4},$$ then we get from (46) :

$$(48)\quad v_n(t) = c_n \bar{e}^{n^4 t} + \int_0^t \bar{e}^{n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1,\ldots,l_r}^{1\ldots\infty} \overset{(n)}{a_{l_1,\ldots,l_r}} \times$$
$$\times\, v_{l_1}(s)\, v_{l_2}(s) \ldots v_{l_r}(s)\, ds.$$

We see therefore that $v_n(t)$ satisfies the integral equations (17) and therefore the differential equation (16). The series $\sum_{n=1}^{\infty} \sum_{r=2}^{\infty} |\overset{(r)}{z_n}(t)|$, $\sum_{n=1}^{\infty} n^4 |v_n(t)|$ and $\sum_n \left|\frac{dv_n}{dt}\right.$ are also readily seen to be uniformly convergent. Thus

$$(49)\quad u(r, t) = \sum_{n=1}^{\infty} v_n(t) \sin nx$$

is the required solution of the differential equation (1) which satisfies the given boundary conditions (3) and (4).

We have to prove now that this solution is unique, that is to say that (49) is the only solution which can be represented as a uniformly convergent series of the form $\sum_n v_n(t) \sin nx$, and which is such that the series $\sum_n n^4 |v_n(t)|$ and $\sum_n \left|\frac{dv_n}{dt}\right|$ also converge uniformly.

For this purpose it is sufficient to prove that the integral equations (19) have no other solution $\bar{w}_n(t)$ which is such that the series $\sum_n |\bar{w}_n(t)|$ is uniformly convergent.

If possible, suppose that $\bar{w}_n(t)$ is another such solution. Then we have

$$(50)\quad \bar{w}_n(t) - \overset{(m)}{w_n}(t) = n^4 \int_0^t e^{-n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1,\ldots,l_r}^{1\ldots\infty} \frac{\overset{(n)}{a_{l_r}}}{l_1^4 \ldots l_r^4} \times$$
$$\times \left\{ \bar{w}_{l_1} \ldots \bar{w}_{l_r} - \overset{(m-1)}{w_{l_1}}\, \overset{(m-1)}{w_{l_2}} \ldots \overset{(m-1)}{w_{l_r}} \right\} ds$$
$$= n^4 \int_0^t e^{-n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1,\ldots,l_r} \frac{\overset{(n)}{a_{l_r}}}{l_1^4 \ldots l_r^4} \times$$
$$\times \left\{ w_{l_1} \ldots \bar{w}_{l_{r-1}} (\bar{w}_{l_r} - \overset{(m-1)}{w_{l_r}}) + \ldots \right.$$
$$\left. + \overset{(m-1)}{w_{l_r}}\, \overset{(m-1)}{w_{l_{r-1}}} \ldots \overset{(m-1)}{w_{l_2}} (\bar{w}_{l_1} - \overset{(m-1)}{w_{l_1}}) \right\} ds.$$

$$+ \overset{(m-1)}{w}_{l_r} \overset{(m)}{w}_{l_1} \dots \overset{(m)}{w}_{l_{r-2}} \left(\overset{(m)}{w}_{l_{r-1}} - \overset{(m-1)}{w}_{l_{r-1}} \right)$$

$$+ \quad . \quad . \quad . \quad . \quad . \quad .$$

$$+ \overset{(m-1)}{w}_{l_r} \overset{(m-1)}{w}_{l_{r-1}} \dots \overset{(m-1)}{w}_{l_2} \left(\overset{(m)}{w}_{l_1} - \overset{(m-1)}{w}_{l_1} \right) \Bigg\} ds,$$

where all the w's under the sign of integral are understood to be functions of s.

From (36) we get

$$(37) \qquad \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m+1)}{w_n}(t) - \overset{(m)}{w_n}(t) \mid \leq \frac{M\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} r\,(r+1)^2\,(2\,c)^{r-1} \times$$

$$\times \sum_{n=1}^{\infty} \overset{(m)}{w_n}(t) - \overset{(m-1)}{w_n}(t) \mid .$$

It can be easily proved that for all $r > 2$,

$$(38) \qquad r\,(r+1)^2 \leq 18\, r - 1,$$

therefore from (37) we get

$$(39) \qquad \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m+1)}{w_n}(t) - \overset{(m)}{w_n}(t) \mid < \frac{M\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} (36\,c)^{r-1} \cdot \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m)}{w_n}(t) - \overset{(m-1)}{w_n}(t) \mid .$$

We assume that $36\,c < 1$, i.e. $c < \frac{1}{36}$; therefore

$$(40) \qquad \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m+1)}{w_n}(t) - \overset{(m)}{w_n}\,t) \mid < \frac{M\pi^2}{3} \; \frac{36\,c}{1 - 36\,c} \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m)}{w_n}(t) - \overset{(m-1}{w_n}(t) \mid .$$

Applying this inequality m-times we get- :

$$(41) \qquad \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m+1)}{w_n}(t) - \overset{(m)}{w_n}(t) \mid < \left(\frac{12M\pi^2 c}{1 - 36c} \right)^m \cdot \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(1)}{w_n}(t) - \overset{(0)}{w_n}(t) \mid .$$

We assume finally that

$$(42) \qquad \frac{12M\pi^2 c}{1 - 36c} < 1, \text{ i.e. } c < \frac{1}{12M\pi^2 + 36},$$

then from (41) we have, on summing over m,

$$(43) \qquad \sum_{m=0}^{\infty} \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(m+1)}{w_n}(t) - \overset{(m)}{w_n}(t) \mid < \sum_{m=0}^{\infty} \left(\frac{12M\pi^2 c}{1 - 36c} \right)^m \cdot \sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(1)}{w_n}(t) - \overset{(0)}{w_n}(t) \mid .$$

But both $\sum_{m=0}^{\infty} \left(\frac{12M\pi^2 c}{1 - 36c} \right)^m$ and $\sum_{n=1}^{\infty} \mid \overset{(1)}{w_n}(t) - \overset{(0)}{w_n}(t) \mid$

are easily seen to be convergent, and the later series uniformly so, therefore we conclude that the double series (35) is uniformly convergent.

From this, it follows that all the limits

$$(44) \qquad \lim_{m \to \infty} \overset{(m)}{w_n}(t) = \overset{(t)}{w_n} \qquad (n = 1, 2, \dots)$$

exist, and that the functions $w_n(t)$ are continuous for all t. Moreover, we see that for all t:

$$(45) \quad \sum_n w_n(t) = \sum_n \left(\lim_{m \to \infty} \overset{(m)}{w_n}(t) \right) < 2\,c < 1.$$

But, it can be easily verified that $(r+1)^2 \leq 3^r$ for all $r \geq 2$, therefore, for $3c < 1$, we have

$$(28) \quad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(1)}{w}_n(t) | < c + \frac{M\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} (3c)^r = c + \frac{M\pi^2}{3} \frac{9c^2}{1-3c}.$$

We assume that

$$(29) \quad \frac{3M\pi^2 c^2}{1-3c} < c, \text{ i.e. } c < \frac{1}{3(1+\pi^2 M)},$$

then we have

$$(30) \quad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(1)}{w}_n(t) | < 2c < 1.$$

We substitute this value again in (25) for $m=2$, and get on assuming $c < \frac{1}{6}$

$$(31) \quad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(2)}{w}_n(t) | < c + \frac{M\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} (r+1)^2 (2c)^r$$
$$< c + \frac{M\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} (6c)^r = c + \frac{M\pi^2}{3} \frac{36c^2}{1-6c}.$$

We assume further that

$$(32) \quad c < \frac{1}{12 M\pi^2 + 6},$$

and get from (31)

$$(33) \quad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(2)}{w}_n(t) | < 2c < 1.$$

Thus reasoning step by step, we see that for all $m \geq 1$

$$(34) \quad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(m)}{w}_n(t) | < 2c < 1.$$

We shall prove further that the doubly infinite series

$$(35) \quad \sum_{m=0}^{\infty} \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(m+1)}{w}_n(t) - \overset{(m)}{w}_n(t) |$$

also converges uniformly for all t.

We have from (21):

$$(36) \quad \overset{(m+1)}{w}_n(t) - \overset{(m)}{w}_n(t) = n^4 \int_0^t e^{-n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1,\ldots,l_r} \frac{\overset{(n)}{a}_{l_r}}{l_1^4 \ldots l_r^4} \times$$
$$\times \left\{ \overset{(m)}{w}_{l_1}(s) \overset{(m)}{w}_{l_2}(s) \ldots \overset{(m)}{w}_{l_r}(s) - \overset{(m-1)}{w}_{l_1}(s) \overset{(m-)}{w}_{l_2}(s) \ldots \overset{(m-1)}{w}_{l_r}(s) \right\} ds,$$
$$= n^4 \int_0^t e^{-(n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1,\ldots,l_r}^{1\ldots\infty} \frac{\overset{(n)}{a}_{l_1,\ldots,l_r}}{l_1^4 \ldots l_r^4} \left\{ \overset{(m)}{w}_{l_1} \ldots \overset{(m)}{w}_{l_{r-1}} \left(\overset{(m)}{w}_{l_r} - \overset{(m-1)}{w}_{l_r} \right) \right.$$

and for all m > 1

$$(21)\qquad \overset{(m)}{w_n}(t) = d_n e^{-n^4 t} + n^4 \int_0^t e^{-n^4(t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_r} \frac{\overset{(n)}{a}_{l_r}}{l_1^4 \dots l_r} \overset{(m-1)}{w}_{l_1}(s) \dots \overset{(m-1)}{w}_{l_r}(s)\, ds,$$

where for convenience we have written $\overset{(n)}{a}_{lr}$ for $\overset{(n)}{a}_{l_1, \dots, lr}(t)$. Now we must show that the sequence $\overset{(m)}{w_n}(t)$ really tends to a limit as $m \to \infty$. To prove this, we remark first that for all $t > o$ and all $n \geq 1$:

$$(22)\qquad \left| \int_0^t e^{-n^4(t-s)} ds \right| = \left| e^{-n^4 t} \int_0^t e^{n^4 s} ds \right| = \frac{1}{n^4} \frac{e^{n^4 t} - 1}{n^4 t} \leq \frac{1}{n^4}$$

We have also from our Paper I, part 1, § 2, that for all $l_1, l_2, \dots, l_r > 1$ and all $t \geq 0$:

$$(23)\qquad \left| \frac{\overset{(n)}{a}_{l_1, \dots, l_r}}{l_1^2 l_2^2 \dots l_r^2} \right| \leq \frac{2\,M\,(r+1)^2}{n^2}.$$

Therefore for all $l_1, l_2, \dots, l_r \leq 1$ we have

$$(24)\qquad \frac{\left| \overset{(n)}{a}_{l_1, \dots, l_r} \right|}{l_1^4 l_2^4 \dots l_r^4} \leq \frac{\left| \overset{(n)}{a}_{l_1, \dots, l_r} \right|}{l_1^2 l_2^2 \dots l_r^2}$$

$$\leq \frac{2\,M\,(r+1)^2}{n^2}.$$

Thus from (21) we get on account of (22) and (24) for all t:

$$\sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(m)}{w_n}(t) | \leq \sum_{n=1}^{\infty} | d_n | + \sum_{n=1}^{\infty} n^4 \frac{1}{n^4} \frac{2\,M}{n^2} \times$$

$$\times \sum_{r=2}^{\infty} (r+1)^2 \left\{ \sum_{l_1, \dots, l_r}^{1 \dots \infty} | \overset{(m-1)}{w}_{l_1}(s) | \dots | \overset{(m-1)}{w}_{l_r}(s) | \right\}.$$

But since $\sum_{n=1}^{\infty} \frac{1}{n^2} = \frac{\pi^2}{6}$ and $\sum_n | d_n | = c$, we get

$$(25)\qquad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(m)}{w_n}(t) | \leq c + \frac{M\,\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} (r+1)^2 \left\{ \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(m-1)}{w_n}(t) | \right\}^r.$$

Now, for all t

$$(26)\qquad \sum_n | \overset{(o)}{w_n}(t) | = \sum_n | d_n e^{-n^4 t} |$$

$$\leq \sum_n | d_n | = c.$$

Substituting this in (25) and taking $m = 1$, we get

$$(27)\qquad \sum_{n=1}^{\infty} | \overset{(1)}{w_n}(t) | < c + \frac{M\,\pi^2}{3} \sum_{r=2}^{\infty} (r+1)^2 c^r.$$

Moreover, from (10) we have:

$$(12) \qquad p_r(x,t)\, u^r = \sum_{n=1}^{\infty} \sin nx . \frac{2}{\pi} \int_0^{\pi} p_r(y,t) \left\{ \sum_{j=1}^{\infty} v_j(t) \sin jy \right\}^r \times [\sin ny\, dy,$$

$$= \sum_n \overset{(r)}{Z}_n(t) \sin nx,$$

where

$$(13) \qquad \overset{(r)}{Z}_n(t) = \sum_{l_1, l_2, \ldots, l_r} \overset{(n)}{a}_{l_1, l_2, \ldots, l_r}(t)\, v_{l_1}(t)\, v_{l_2}(t) \ldots v_{l_r}(t),$$

and

$$(14) \qquad \overset{(n)}{a}_{l_1, \ldots, l_r}(t) = \frac{2}{\pi} \int_0^{\pi} p_r(y,t) \sin l_1 y \ldots \sin l_r y \sin n y\, dy.$$

We assume, what will be proved later, that the series $\sum_n n^4 v_n(t)$ and $\sum_n \frac{d v_n}{dt}$ are also absolutely and uniformly convergent for all t; then we get on substituting (10) and (12) in the differential equation (1):

$$(15) \qquad \sum_{n=1}^{\infty} n^4 v_n(t) \sin nx + \sum_{n=1}^{\infty} \frac{d v_n}{dt} \sin nx = \sum_{n=1}^{\infty} \sum_{y=2}^{\infty} \overset{(r)}{Z}_n(t) \sin nx.$$

So that for all positive integral n, we have

$$(16) \qquad \frac{dv_n}{dt} + n^4 v_n(t) = \sum_{r=2}^{\infty} \overset{(r)}{z}_n(t).$$

A solution of this equation which satisfies the condition (11) is

$$(17) \qquad v_n(t) = c_n e^{-n^4 t} + \int_0^t e^{-n^4 (t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \overset{(r)}{z}_n(s)\, ds,$$

$$= c_n e^{-n^4 t} + \int_0^t e^{-n^4 (t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1, \ldots, l_r}^{1 \ldots \infty} a^{(n)}_{l_1, \ldots, l_r}\, v_{l_1}(s) \ldots v_{l_r}(s)\, ds.$$

We set

$$(18) \qquad w_n(t) = n^4 v_n(t), \qquad d_n = n^4 c_n,$$

and get from (17) for all $n \geq 1$

$$(19) \qquad w_n(t) = d_n e^{-n^4 t} + n^4 \int_0^t e^{-n^4 (t-s)} \sum_{r=2}^{\infty} \sum_{l_1, \ldots l_r,} \frac{\overset{(n)}{a}_{l_1, \ldots, l_r}}{l_1^4 l_2^4 \ldots l_1^4}\, w_{l_1}(s) \ldots w_{l_r}(s) ds.$$

This is an infinite system of non-linear integral equations for the determination of $w_n(t)$, and we solve this by the method of successive approximations developed in our paper II. For this purpose we write,

$$(20) \qquad \overset{(o)}{w}_n(t) = d_n e^{-n^4 t},$$

"ON A FOURTH ORDER PARTIAL DIFFERENTIAL EQUATION"

BY

RAZIUDDIN SIDDIQUI

We consider the non-linear partial differential equation

$$(1) \qquad \frac{\partial^4 u}{\partial x^4} + \frac{\partial u}{\partial t} = P(x, t; u),$$

and try to determine a solution $u(x, t)$ which is regular in the domain

$$(2) \qquad o < x \leq \pi, \qquad o \leq t,$$

and which satisfies the boundary conditions

$$(3) \qquad u(o, t) = u(\pi, t) = o \text{ for all } t > o$$

and

$$(4) \qquad u(x, o) = f(x) \text{ for all } x \text{ in } o \leq x \leq \pi.$$

In order that conditions (3) and (4) should be consistent, it is necessary that

$$(5) \qquad f(o) = f(\pi) = o.$$

We assume further that $\frac{d^4 f}{dx}$ exists, and can be represented as an indefinite integral. These conditions are sufficient for $f(x)$ to be capable of being expanded in a Fourier Series of the from

$$(6) \qquad f(x) = \sum_{n=1}^{\infty} c_n \sin nx$$

such that $\sum_n n^4 \mid c_n \mid$ is convergent :

$$(7) \qquad \sum_n n^4 \mid c_n \mid = c,$$

where c is an absolute constant.

We take $P(x, t; u)$ to stand for the power series

$$(8) \qquad P(x, t; u) = \sum_{r=2}^{\infty} p_r(x, t)\, u^r$$

and assume that the co-efficients, $p_r(x, t)$ and their derivatives $\frac{\partial p_r}{\partial x}$, $\frac{\partial^2 p_r}{\partial x^2}$ are continuous and uniformly bounded in the domain (2):

$$(9) \qquad \left| p_r(x, t) \right|, \left| \frac{\partial p_r}{\partial x} \right|, \left| \frac{\partial^2 p_r}{\partial x^2} \right| \leq M, \; (r = 2, 3, \ldots).$$

For the solution we write

$$(10) \qquad u(x, t) = \sum_{n=1}^{\infty} v_n(t) \sin nx,$$

and assume for the present that the series on the right converges absolutely and uniformly in the domain (2). The solution (8) satisfies already the condition (3). In order that it may satisfy condition (4) also, we must have, on account of (6),

$$(11) \qquad v_n(o) = c_n \qquad (n = 1, 2, \ldots)$$

(2) FALL II (C) AT NAOKI.

This occurred near the centre of the field of Massaji (Revenue Survey No. 45), which is situated at about 2,280 paces to the south-west of the inhabited part of Naoki. The fall was witnessed by one Okerya, from a distance of 15 paces, by Hanoomaji, shepherd, from a distance of 25 paces and by Dagroba, shepherd from a distance of 19 paces. These people were grazing their cattle at the time. (The stone was dug out by Atthia, who gave it to Shaikh Mohiuddin, a resident of Arandesar, who in turn passed it on to Arab Abdullah of Nander.)

(3) FALL III or N (S) AT KAWAGAON

One stone fell in Mohnaji shepherd's field, Survey No. 7, situated about half a mile to the west of the inhabited part of Kawagaon.

The Circle Inspector, writing about this fall to the District Superintendent of Police, Purbhani, says that 'Mohnaji son of Kishnaji, shepherd, gave evidence that he owned a field (Survey No. 7) in Kawagaon. He heard 3 loud reports on 29th September 1928 at 5 p.m. and forthwith saw black stones fall from the sky at a distance of 12 paces from him. He dug up one stone immediately from the wet soil, which was afterwards handed over to the Police authorities. He further writes that several people have seen such stones being carried by rail to Nander and Hyderabad also. Later, the District Superintendent of Police, Purbhani, forwarded one stone to the Director-General and wrote that the 1st Taluqdar had retained some stones.'

The writer of this account has seen two of these stones, one in the possession of Mr. Ghulam Ahmad Khan, now 1st Talukdar of Aurangabad and the other in the possession of Professor Hosain Ali Khan. The latter stone weighs 10,320 grams (or nearly 22·7 lbs.) with specific gravity 3·49 and is composed mainly of nickel-iron grains and troilite, olivine and enstatite. Its greatest length is about $11\frac{3}{4}$ inches and greatest breadth $6\frac{1}{2}$ inches, greatest lengthwise perimeter $23\frac{1}{2}$ inches and greatest breadth-wise perimeter 20 inches. Its surface (where it is unbroken) is covered with the usual thin black crust of stone meteorites and is pitted. The inner portions are much lighter in colour and very friable (vide photographs 1, 2, 3.) The former stone appears to be of the same texture but is somewhat smaller.

It may be of interest to note that the specific gravity of a complete specimen of stone meteorite which fell at Holbrook, Arizona on July 19th 1912 is 3·48 and of a similar specimen which fell at Forest City, Iowa on May 2nd 1890 is 3·69, as examined by the present writer.

Mr. Mills in his letter to Dr. Fermor writes that the people who saw the splashing of mud by the fall of the meteorites could not say whether it was the sound of something hot falling into water and that they did not observe any luminous phenomena.

It is now an almost established fact that stone meteorites reach the earth as comparatively cold bodies. The 'ball of fire' stage of meteorites (of ordinary size) whether iron or stony, ceases at a height of above five miles from the ground. Iron meteorites retain some of the heat they develop during their flight in the higher regions of the atmosphere but the stony varieties fall mostly as comparatively cold masses. Two well-known specimens (Dhurmsala meteorite which fell on July 14th 1860 and the Alfianello meteorite which fell on February 16th 1883—specimens of both of which are now in the possession of the writer, picked up by people soon after their fall, were found to be ice-cold. The heat evidently had no chance of penetrating into their interior owing to poor conductivity of the material and was quickly radiated during their fall in the lower layers of the atmosphere.

It is a pleasure to acknowledge with thanks the courtesy of Mr. Armstrong in allowing the use of his office file and of Professor Hosain Ali Khan in lending the meteorite to have it photographed.

PLATE I

Fig. 1
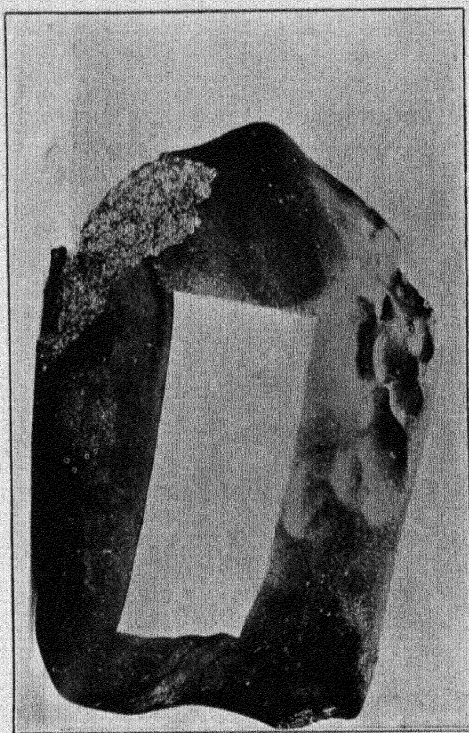
Fig. 2
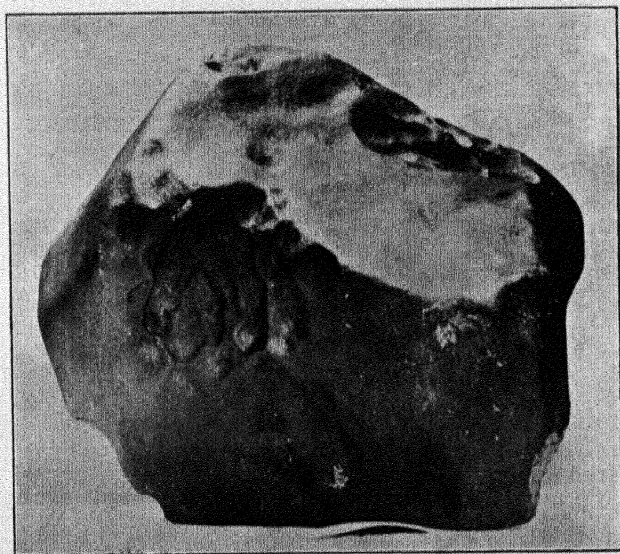
Fig. 3

THE METEORITE FALL OF 1928 NEAR PURNA

BY

MOHD. A. R. KHAN

A shower of meteorites occurred at about 5 p. m. on 29th September 1928 in the fields of Naoki, Kawagaon and Malegaon, Purbhani District, in the Dominions of His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad, on an area of about 2½ square miles, when it was raining slightly and the sky was covered with thick clouds. In due course it was reported by the District Police authorities to the Director-General of Police but the undersigned came to know of it only recently. On referring to the Director-General, Mr. J. E. Armstrong, O. B. E., C. I. E., he very kindly lent his office file which shows that the District Superintendent of Police, Purbhani described the fall of one stone at Naoki and of two (or more stones) at Kawagaon. These are designated here as I (s), II (s) and N (s) respectively.

There is also the Circle Inspector's report which describes the fall of altogether 4 stones, two at Naoki, one at Kawagaon and one at Malegaon, designated here as I (c) and II (c); III (c); and IV (c) respectively,

It seems that I (s) and I (c) are identical, II (s) and IV (c) are identical and N (s) and III (c) are identical with the difference that the Police Superintendent's report implies fall N (s) to consist of more than one meteorite, whereas the Inspector's report represents fall III (c) to consist of only one.

Mr. S. S. Mills, Deputy Director-General of Police, brought the matter to the notice of Dr. L. L. Fermor, Director, Geological Survey of India, Calcutta, and it appears from the file that the Police Department sent 3 stones to Dr. Fermor, one on 28th October 1928, described by Mr. Mills as 'measuring 6″ x 6″ x 4″, surface of blackish colour as though it has been burnt and its section of slaty grey colour and rough texture, very heavy', the 2nd on 19/22 November 1928 and the 3rd on 3rd January 1929 (recovered from Abdullah bin Mahroos, an Arab of Nander).

(1) FALL I (C) OR I (S) AT NAOKI.

About 265 paces towards the north of the inhabited part of Naoki is situated the field of one Pandoji, son of Mohnaji, a shepherd, Survey No. 76. One stone fell on the border of this field near a brook. Sadhu son of Rama, and Dharmaji son of Raiji, after grazing their cattle, were returning to their homes through the field of Pandoji at about 5 p.m. while it was raining slightly. All of a sudden they heard three loud reports like the firing of guns. They looked in surprise round about them but saw nothing. Suddenly at a distance of some 145 paces from them they saw something black fall in the wet ground, splashing the mud to a height of about 5 feet and penetrating into the soil (as was found out afterwards) to a depth of about half a yard. They reported this matter to the village people: Bapu Rao, son of Lalia, Deo Rao and Khopraji etc., who went out the next day at about 8 or 9 a.m, and, noticing the depression in the ground, dug out a black stone, which was sent later by the Police Muntazim of Purna to the District Superintendent of Police, Purbhani.

For 2 days after the fall (while the sky was still cloudy and rain was falling heavily) the village people were so frightened that they abandoned the road 'for fear of being struck by stones falling from heaven'.

(gold), 17,000 paolî (gold), 400 adhelî (half) and 8,000 whole silver paolî, 140 horses, 300 camels, 400 oxen and 38 elephants (*Later Mogols*, vol. I., p. 270).

The escheat of decased nobles' property was in accordance with the time-honoured practice of the Mughal Government. Moreover, this measure was necessary, in this case, in view of the fact that Fîrûz Jang shortly before his death had taken big sums of money from the State. As the Râjputâna expedition was dropped, eleven lakhs of Rupees were to be refunded to the State, which were given to him for the purposes of the expedition against Râjâ Ajit Singh of Mârwâr. This measure was meant to ensure the payment of the money drawn from the Government treasury. But certain foreign writers seem to have been misled by the appearance of this custom. The Government could not lay hold on all the possessions and effects of the defunct nobles and officials, as they seem to have conceived.[1] The firmân of the Emperor Aurangzîb, dated 24th July, 1666, addressed to the provincial Dīwāns of the realm, expressly lays down that only the property and effects of those deceased officials should be attached who owed anything to the crown.[2]

Fîrûz Jang died at the age of sixty two (lunar) years. His remains were carried to Delhi and buried in a tomb which he had had built during his lifetime in the neighbourhood of the Ajmerî gate, not far from the resting place of Shâh Wajîhuddîn. (*Ma'âthsir-ul-Umarâ*, vol. 2., p. 878).

Fîrûz Jang was the leader of the Tûrânî Mughals. He was a very able and efficient general. He had acquired a most powerful influence in the Deccan. This is why his presence there was represented to Bahâdur Shâh as dangerous. All his life he remained faithful to the Crown. Envious persons tried to misrepresent him to the Emperor Aurangzîb, but he always had the greatest confidence in him and remained fond of him, as is shown by the letters of the Emperor addressed to him.[3] His character is well described by Khâfî Khân in the following words: 'He was a man born to victory, and a disciplinarian who always prevailed over his enemy. An aristocrat of such rank and power and yet so polite and good-natured has rarely been seen or heard of among the men of Tûrân' (vol. 2., p. 671).

After the death of his first wife Safia Khanum, who bore him Qamruddîn (Nizam-ul-Mulk Âsaf Jah) he married two daughters of Hifzullāh Khan, son of S'adullah Khan, one after the other and left no issue by them.

[1] Manucci's *Storia do Mogor*, vol., II. p. 417; (*Bernier's Travels*, pp. 163, 211 and 212).

[2] The Firmân is worded thus:

'Whereas if a servant of the Emperor dies leaving no heir and owing nothing to the State, all his possessions should be deposited in charge of the store-keeper of the Bait-ul-Mâl. If the deceased owes anything to the Crown then only the amount due should be taken and the rest should be deposited in the Bait-ul-Mâl. If he leaves an heir who has a claim on his property, then in that case the effects of the deceased should be attached after waiting for three days. If the property exceeds the amount of the debt he owes to the State, then in that case only the amount due should be subtracted and the balance delivered to the lawful heir after the latter had legally established his right. If the claims of the State exceed the worth of the property, then everything should be attached. If the deceased owes nothing to the Crown after legal proof, the whole property should be rendered to the heir' (*Mir'ât-i-Ahmedî*, vol. I., pp. 266, 67; Sir J. Sarkar is the first to point out this firman. *See Mughal Administratioa*, p. 168.

[3] *Ruq'ât-i-'Ālamgīrī*.

of Mir'ât-i-Ahmedî, was confirmed in the post of Waq'âe-î-nigâr (*Mir'ât-i-Ahmedî*, vol. I, p. 383).[1]

Intelligence was brought to Bahâdur Shâh that Râjâ Ajit Singh of Jodhpur was in open rebellion for some time and refused to recognise the authority of the Emperor, and that he, after defeating Jafar Qulî, the deputy faujdâr of Jodhpur, had taken possession of Ajmer and other Imperial territory. The Emperor directed Fîrûz Jang to march against Râjā Ajit Singh and restore order in the disturbed area in Râjputâna. Fîrûz Jang, on receiving the Imperial orders, enlisted three thousand cavalry and five thousand infantry, besides the troops of his old establishment, on the salary of Rs. 35 monthly to the cavalry soldiers and Rs. 4 to infantry troops. This amounted to monthly expense of 1 lakh 35 thousand rupees. In accordance with Imperial orders, Abdul Hamîd Khân, and Shari'at Khân, Provincial Dîwâns, entrusted the sum of eleven lakhs of Rupees to Fîrûz Jang, for payment to local militia during eight months and 24 days. The Emperor also directed the Dîwâns to provide Fîrûz Jang with fifty wheeled field-pieces, one hundred and fifty camel-guns, three thousand rockets, one thousand maunds of lead, one thousand maunds of powder and one hundred maunds of squibs from the Imperial artillery and to send two hundred diggers, one hundred axe-men and one hundred water-carriers along with the army (*Mir'ât-i-Ahmedî*, vol. I, p. 306).

On the eve of his departure for the Râjputâna expedition, Fîrûz Jang felt ill but recovered after a few days. He celebrated his recovery by treating sumptuously the nobility, the learned and the Syeds of the place. The celebrations continued for three nights consecutively. Illuminations were held on the banks of the Sâbarmatî river and fireworks were displayed (*Ibid.*).

Fîrûz Jang set out from Ahmedâbâd in the direction of Mârwâr. His first halt was at the village of Achir on the Sâbarmatî river. Here he received presents and tribute from the landholders. His next halt was at Ider. Here Fîrûz Jang received the fifty spies sent by the Emperor at his request in order to keep him well-informed concerning the movements of Râjâ Ajit Singh. The spies also demanded their pay in advance like the soldiery. The matter was represented to the Emperor by urgent messengers, and he directed the Bakshî of Ahmedâbâd to accede to their demand.

When Fîrûz Jang reached Danta he had a relapse of dropsy. Very soon he grew weak and was compelled to return to Ahmedâbâd for treatment. After a short illness he expired (1710). On hearing the news of his death, the Emperor sent a firmân to the Dîwān, directing him to escheat the property of the late Fîrûz Jang. The Emperor was informed that 'Iwaz Khân, collector of Fîrûz Jang, started distributing large sums to the troops and did not allow the property of the deceased noble to be attached. He also realised large sums of money for himself on the pretext of paying off the debts of Fîrûz Jang. Jai Kishan, Dîwân of Kârkhâna had forged several State documents in order to appropriate certain sums in his charge (*Mir'ât-i-Ahmedî*, vol. I., p. 391).

Bahâdur Shâh directed Muhammad Beg Khân, deputy of Fîrûz Jang and faujdar of Patan and Amânat Khân (later known as Shahâmat Jang) collector of the port of Sûrat, to attach all the property and effects of the deceased Subedâr. He noted down the detailed description of each article so that everything could be checked at the capital. Jai Kishan, Almâs, and Nîkrûz (all the three eunuchs) were arrested, and responsible men took charge of the treasure and stores. His estate consisted of 1½ lakhs of rupees in bills on bankers, 133,000 gold muhars, 25,000 huns (gold) and nim-paolî

[1] The other appointments are: Mu'tamad Khân, Qiledâr of the fortress of Japavir; Mir Abul Baqâ, Kotwâl and Inspector of cloth-store (Gathapārchā); Mir Abu Qâsim, Amîn, in place of Sheikh Najmuddîn; Muhammad Hâtim Beg, Dârogha of scarf-weavers (chira bâf Khâna); Khwâja 'Iwaz Khân, Dârogha of the city-treasury; Sheikh Nûrullâh, Dârogha of provincial treasury! I'timâd Khan, collector (Mutasaddî) of Khambâyat in place of Amânat Khan, and Thānedar of Kajna in place of Syed 'Alî Khân. (*Mi'rât-i.Ahmedî*, vol. I., p. 304).

his nominee, before starting on his march to North India, and thus prevent him from taking any other course which might prove suicidal for his interest in the Deccan on account of the presence of Kâm Bakhsh in that part of the country. It was safer to leave Fîrûz Jang behind as a friend than as a foe.

According to *Ma'athir-ul-Umarâ*, when Zulfiqâr Khân joined Â'zam, in the neighbourhood of Aurangâbâd, he asked Zulfiqâr Khân for advice, who is reported to have replied thus: "It would be wiser and more prudent to leave your family at Daulatâbâd, as your father, the Emperor Aurangzîb, did when he was marching against Dârâ Shikûh, in similar circumstances. The soldiers are in great distress. You should pay them for two months in advance from the treasure you possess, in order to conciliate them before they enter into the struggle on your behalf. It is better to advance from the pass of Deval Ghât instead of Fardâpur, so that you may pass near the headquarters of Fîrûz Jang. This will afford him an opportunity to join you.' The prince in his usual overbearing manner replied: 'It would certainly have been advisable to leave the family behind at Daulatabâd, if the enemy was like Dârâ Shikûh. We know what Mu'azzam is? His men are only taught courtesies. They have no idea of warfare, while I expect great things from my men. As for Fîrûz Jang, I do not deem it advisable to leave the direct route for the sake of a blind man like him.' (vol. II, p. 877–78).

The battle of Jâjaû, fought in the neighbourhood of Agra, decided the fate of the Imperial throne in favour of Mu'azzam. A'zam and his son Bîdâr Bakht were killed and Mu'azzam proclaimed himself king with the title of Bahâdur Shâh. He adopted a policy of general conciliation and forgiveness of offences. All those who had joined Â'zam or Kâm Bakhsh, who had rejected Bahâdur Shâh's overtures, were treated in a most generous manner. When certain envious persons brought to the notice of the new Emperor that it was dangerous to repose confidence in the followers of Â'zam, he replied that if his own sons had been in the Deccan at that time, the exigencies of the situation would have left no other alternative for them but to join their uncle (*Khâfî Khân*, II, p. 600).

The Emperor invited the leading nobles of the realm to the court. A similar invitation was sent to Fîrûz Jang, who was much in dread of Bahâdur Shâh because, during the siege of Golconda, it was on his report that the Emperor disgraced the latter and put him into confinement. But the letters sent by Mun'im Khân, chief minister of Bahâdur Shâh, reassured him. In the words of Irâdat Khân, 'that experienced statesman, opening his eyes on the vicissitudes of life, saw that it was his interest, if his Majesty would forget the past and not molest him in his fortune, to bow his head in submission. . . . He embraced the promises of the Minister and thankfully accepted the Subedarî of Ahmedâbâd (Gujerât). He accordingly crossed the Narbada and left the Deccan without trouble, but his fears prevented him from coming to the court' (p. 52).

Fîrûz Jang obtained exemption from the duty of waiting on the Emperor in person. He excused himself on account of his disability (being blind for nearly eighteen years), saying that even the Emperor Aurangzîb out of regard for his past services had not required him to wait in person.

According to the orders of the Emperor, Fîrûz Jang undertook the administration of Gujerât. Abdul Hamîd Khân Dîwân of the province, Mehr 'Alî Khân Bakhshî and Muhammad Beg Khân received the new Subedâr. The first thing Fîrûz Jang did was to appoint new faujdârs and thanedârs in different localities of the province. He appointed Syed 'Âquil Khân as the Mutasaddî (collector) of the estates of prince Jehândâr Shâh. He was also given the Thanedârî of Pethapur which used to be held by his brother Mîr 'Abdul Wahhâb who was killed in a battle against the Mahrâttâs. Muhammad 'Âli Khân, the father of the author

Fîrûz Jang, during his campaigns against Nemâjî Sindhiâ in Mâlwâ, did not get much help from the local Mughal authorities who, terrified by the presence of vast Mahrâttâ forces in their territory, hid themselves in their fortresses instead of taking the field against their inroads. When the Emperor was apprised of this state of affairs in the local administration of that province, he took strict measures by dismissing Nawâzish Khân from the faujdârî of Mandû and transferring him to Khândesh, but he was reinstated later. Thinking minor official changes to be ineffective, the Emperor appointed Bîdâr Bakht as the Governor of the province of Mâlwâ in place of Abu Nasr Khân, son of Shâistâ Khân who was transferred to Bengal, then a comparatively peaceful province (*Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. I., p. 293).[1]

Fîrûz Jang, continuing his pursuit of Nemâjî, set out from Bhâmgarh on 10 February, 1704, to proceed against Chatrasâl, via Chandêrî, and Dhamunî towards Garha. His general, Khanjar Khân, who was leading the vanguard, succeeded in dispersing the columns of the enemy by his surprise attacks. After this Fîrûz Jang returned to Burhânpur and from thence to Berâr, as his presence was urgently required there.

Nemâjî Sindhiâ had captured Mughal outposts on the Narbada. For several months, the highways between North India and the Deccan were held up by the Mahrâttâs. In the beginning of March 1704, some 355 bags of official correspondence and 55 baskets of fruits sent for the Emperor by the Subedārs of Kabul and Kashmir, were lying on the bank of the Narbada, as the faujdârs on the way could not supply adequate escort to take them to their destination (Sarkar, vol. v., p. 386).

At the time of Aurangzîb's death which occurred on the 3rd March, 1707, Fîrûz Jang was at Ellichpur as the governor of the Berâr province. Almost all the chief nobles in Deccan made their submission to prince Â'zam. Some espoused his cause because they really liked him, while others from inability to oppose prudently joined him and submitted to his authority. Chin Qalich Khân (Nizâm-ul-Mulk) and his cousin Muhammad Amîn Khân also joined A'zam in his march to Aurangâbâd. Â'zam bestowed the title of Khân-i-Daurân on Chin Qalich Khân, in order to conciliate him and through him the Tûranî soldiery. But they soon felt disgusted at the haughty and slighting behaviour of the prince towards his chiefs and nobles. Â'zam constantly treated the old veterans with contempt. He removed Tarbiat Khân from the command of the artillery in the most insulting manner and conferred that post on a young man of low rank and no experience (*Irâdat Khân*, p. 12). The prince was filled with such an overwhelming pride and arrogance that Chin Qalich Khân and Muhammad Amîn Khân felt sick of his behaviour and decided to leave him and remain neutral in the impending contest that was going to take place between the sons of Aurangzîb to secure the throne. Both of them, with their troops, left the prince and took possession of several districts in the neighbourhood of Aurangâbâd (*Khâfî Khân*, II, p. 572).

Â'zam knew that Fîrûz Jang also did not desire to take any active part in the internecine warfare that was going to ensue after the death of the Emperor. Although enraged with Fîrûz Jang, he thought it advisable to put him in charge of Burhânpur, as

[1] The Emperor wrote the following strong-worded despatch to Abu Nasr Khân: "In spite of the going of Fîrûz Jang, rightly so named, in pursuit of the marauders (i.e. Mahrâttâs), why were you sitting down in your fortress gazing at the show? If you wish to remain in my service, then, now that Fîrûz Jang, after defeating Nemâ near Sironj, is chasing him and the latter is fleeing towards Bundelkhand and Garha (Mandla), you should issue forth, take the militia, assemble the faujdârs and the captains posted there, and attack, expel, slay and bind the scattered bands of the enemy roving without leaders and the rebel Afghans,—who seeing the field empty are molesting the peasantry. Send Nawâzish Khân to Burhânpur. Take Mandû as your own Jâgîr and entrust Dhar to the new qiledâr appointed.

Nawāzish Khân was addressed thus: 'At the request of Nusrat Jang (the Imperial paymaster) you have been retained in service, but you have not been your own self. What do you mean by vacating Mandû and hiding yourself in Dhar? Come to Burhânpur and serve under Bîdār Bakht. I shall give you Jâgirs in the Deccan or if you prefer an annual stipend of 20,000' (*Kalimât-i-Tayyibât*, Asafia No. 112. Inshâ').

to be one of the most important military stations on account of its strategic position.[1] The Emperor showed consideration for the disability of Fîrûz Jang (his blindness) and desired him to stay in one place instead of moving about in different directions like other Imperial generals.

A year after this, the Emperor, on his way back from Bahâdurgarh, happened to pass near Islâmpurî. According to his usual practice, he came down to inspect Fîrûz Jang's camp. He was surprised to see his retainers in such a well-equipped condition. The camp was splendidly kept. The soldiery were undergoing the best discipline. He had a huge force of artillery at hand, the like of which no other Imperial general possessed. Fîrûz Jang offered many presents to the Emperor who accepted only one small poniard (*nimcha*) and gave it the name of 'Ghâzîbacha' (son of Ghâzî). The Emperor also took some of the ordnance along with him and issued orders that the nobles and generals should not be allowed to keep more than a fixed quota of artillery. A despatch was immediately sent to prince Bîdâr Bakht saying: 'Fîrûz Jang who is only a "haft-hazâri" (master of seven thousand) spends his own money on all manner of armaments, including cannon, matchlocks, and small cannon, and possesses a large quantity of all necessary equipments. For this he does not get anything extra from the Imperial treasury except what is fixed for him. You, who get so much more than he does, squander money needlessly. You spend for things for which you should not.' (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 469).[2]

For nearly two years Fîrûz Jang did not move out from Islâmpurî. But during this time he continued to show interest in the administration of Berâr. It was through his recommendation that the Emperor appointed Rustam Khân, in whom he had complete confidence, as the deputy governor of Berâr (*Ibid*, p. 493). The Emperor again sent Fîrûz Jang to take charge of the governorship of Berâr and to check the advance of Nemâjî Sindhiâ who had defeated and captured Rustam Khân. This general led the Mahrâttâ counter-offensive in Berâr and Mâlwâ. He, besides other Mahrâtta chiefs, had enlisted a huge army in order to ravage Mughal provinces. He had established himself in Central India during the regency of Târâbâî, who had taken the reins of power in her hands in the name of her son Shîvâjî who was not yet ten years of age. The Imperial armies were getting dispirited on account of the repeated reverses they met at the hands of Nemâjî Sindhiâ and Dhanâ Jâdav, who had thrown all their energies into the task of marshalling the forces of their people to overthrow the Mughal domination.

Nemâjî Sindhiâ, after inflicting a crushing defeat on Rustam Khân crossed the Narbada river and carried his predatory raids as far as Mâlwâ. He negotiated terms with Chatrasâl of Bundelkhand, to join forces against the Mughals (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 483). Fîrûz Jang pursued Nemâjî Sindhiâ who came out to offer battle in the neighbourhood of Sironj. The Mahrâttâs were severely beaten and their armies fled and dispersed. It is said that Fîrûz Jang forced his way to the elephant on which Nemâjî Sindhiâ was riding, but the latter leaped down and took to flight on a horse. The Imperial armies took back all the baggage and effects which Nemâjî Sindhiâ had seized from Rustam Khân in Berar. He was compelled to take refuge in the forests of Bundelkhand with Chatrasâl. As a recognition of these services in the Imperial cause, Fîrûz Jang was honoured with the title of Sipâh-i-Sâlâr (Commander-in-Chief), an increase of two thousand horse in his Mansab and a reward of one crore dâm in cash (*Ibid*, p. 481). Dilêr Khân who was one of the chief officers of Fîrûz Jang was also raised to the rank of 7,000 personal, 7,000 horse.

[1] The original name of this place was Brahampurî. Aurangzîb gave it the name of Islâmpurî and made it the base-camp for his armies which were busy checking the Mahrâttâ counter-offensive between Bîjâpur in the south and the Manjira river in the north. Islâmpurî served as a point, joining a series of points, from whence military operations originated.

[2] Saif Khân was directed not to advance any further sums of money to Bîdâr Bakht without the Imperial permission. See *Farâmîn-i-'Âlamgîrî*, Asafia Lib. Persian MS., No. 1275 (Tarîkh).

commanded by Santâjî Ghorpâde, Parsojî Bhosle and Sindojirâo Nimbalkar respectively. The activity of these columns had begun to cause a great deal of harassment to the Emperor. The Mahrâtta free-booters were disturbing the whole of the Deccan, Konkan and Western Carnatic. Santâjî had seized several fortresses from the Mughals in the neighbourhood of Balgâon, while other Mahrâttâ columns were also making themselves felt by the Imperialists. Of these Maharâttâ generals, Santâjî had become a terror for the peaceful populace as well as the Mughal armies. After harassing the Imperial forces under the command of Zulfiqâr Khân in the Carnatic, Santâjî started his surprise attacks in the Western Deccan. Qâsim Khân was directed to march against him. He was severely defeated by Santâji and compelled to surrender the fortress of Dodderi. Himmat Khân who was sent by the Emperor to reinforce Qâsim Khân was met by Santâji's forces on the way and slain in action.

Santâjî had reached the height of his power when he quarrelled with Dhanâ Jâdav who felt wronged on the promotion of the former to the post of Commander-in-Chief. Dhanâjî Jâdav resolved to decide the issue between himself and his rival at the point of the sword and started raising fresh troops. On his part Santâjî could not allow his rival to raise fresh soldiery and thus become a danger to his existence. He followed him into the Mahrâttâ land. In March, 1697, their armies met in the neighbourhood of Bîjâpur. The Emperor had also given orders to pursue Santâjî whose ravages had wrought havoc in this part of the country. Fîrûz Jang got intelligence that Santâjî, at the head of twenty-five thousand horse, was only eighteen miles from Bîjâpur. Fîrûz Jang thought it advisable to avoid a direct clash with him and to proceed in the direction of Bîjâpur in order to enlist re-inforcements. Meanwhile, he was informed by his agents that Dhanâ Jâdav and Hanumant Râo had formed a strong combination against Santâjî and that they were going to be engaged in a bloody battle. He marched in that direction and was informed that Santâjî had suffered a severe defeat and that he had taken to flight. His army was corrupted and most of his men joined the opponents' camp. Santâjî was left isolated and the few who remained loyal to him were dispersed in various directions. He was captured and slain by Nâgojî Mânê who had been in the Imperial service for some time but subsequently joined his own people. He had a grievance against Santâjî who had his brother trampled to death for some military offence. Santâjî, being a man of over-bearing temperament, ready to take the most extreme measure for some small neglect or offence, was unpopular among a certain class of Mahrâttâ soldiery.

According to Khâfî Khân, Santâjî, worn out and tired was bathing in a stream when he was captured and killed by Nagojî Mâne, who cut off his head and, putting it in a bag, fastened it behind his saddle. On his way back to Dhanâ Jâdav, the bag got unfastened and fell down without his noticing it. As chance would have it, Fîrûz Jang's scouts, who were in pursuit of Santâjî, passed that way. They picked up the bag and recognised the head of Santâjî; they immediately carried it back to Fîrûz Jang. The head was sent to the Emperor who gave the messenger, Khwâja Bâbâ-i-Tûrânî, the title of 'Khush Khabar Khân' (Lord Good News). The head was exhibited in the principal cites of the Deccan. (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 448; *Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 402).

Now the Emperor, along with his campaigns against the Mahrâttâs in the Deccan and the Carnatic, undertook to consolidate the territories that had fallen to him after the dismemberment of the Adil Shâhi and the Qutub Shâhi kingdoms. He sent Fîrûz Jang to Berâr to organise the administration there. He stayed there for nearly two years. Then he was summoned to court in 1700 when his advice was sought in connection with the revival of the Mahrâttâ activity. Fîrûz Jang was directed to relieve Jumdat-ul-Mulk Asad Khân in command of the camp of Islâmpurî, which was considered

him by granting him the faujdarî and fief of Morâdâbâd. But the responsibilities of this office were to be discharged by a deputy, because the Emperor had ordained that so long as Siddî Mas'ûd was alive he was to remain in the service of Fîrûz Jang (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 316). His sons, when they reached the royal presence with the golden keys of the fortress of Adonî, were duly honoured with favours and presents. An increase of 1,000 personal, 1,000 horse was made in the rank of Fîrûz Jang.[1]

As the Emperor had reached Bîjâpur, Fîrûz Jang joined him there after settling the administration of Adonî and its neighbourhood. The Emperor honoured him with presents. Intelligence was received that Sambhâjî and his lieutenants were creating great disturbances in the direction of Bahâdurgarh and Gulshanâbad, the Emperor directed Fîrûz Jang and Sheikh Nizâm (Muqarrab Khân), who after deserting the cause of Abu'l-Hasan had joined the Imperial service, to proceed there with a suitable force in oder to re-establish Mughal supremacy in those districts. While the Mughal forces were busy in Golconda, Sambhâjî and his famous general Santâjî were raiding the Mughal territory. They had raised fresh troops and had considerably increased their military strength.

When preparations were being made to start a vigorous offensive against the Mahrâttâs, the plague epidemic broke out in November, 1688, in the royal camp at Bîjâpur. It was so virulent that very few who were infected with it could manage to survive. The queen-consort, Aurangâbâdî Mahal, Mahârâjâ Jaswant Singh's son who was only thirteen years old and who was brought up with the Imperial family and Fâzil Khân, sadr, besides many other nobles and officers died. Nearly a hundred thousand souls perished in this terrible pestilence. The Emperor had to move his camp from Bîjâpur to Aklûj in the Sholâpur district. Fîrûz Jang also caught the infection at Bîjâpur before his departure for Bahâdurgarh and lost his eye-sight (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, pp. 318–19). On account of his ill-health he could not undertake the expedition against the Mahrattâs, and the credit of capturing Sambhâjî went to Sheikh Nizâm (Muqarrab Khân) who was honoured with the title of Khân-i-Zamân Bahâdur, Fateh Jang, a gift of fifty thousand Rupees cash, a special robe of honour, a horse with jewelled trappings, an elephant with gold-mounted trappings, a jewelled poniard and an increase of five thousand to his present rank. His elder son Ikhlâs Khân was raised to the rank of 5,000 personal, 5,000 horse with the title of Khân-i-'Âlam, and his younger sons, Sheikh Mîran and Sheikh 'Abdullâh were given the titles of Munawwar Khân and Ikhtisâs Khân respectively.

The Emperor was now determined to reduce all the strongholds of the Mahrâttâs. He started his offensive in right earnest. I'tiqâd Khân, later known as Zulfiqâr Khân Nusrat Jang, invaded the Konkan and reduced the famous fort of Raigarh in October, 1689. Shîvajî's widows, Sambhâjî and Râjâ Râma's wives, daughters and sons were captured and sent to the Imperial presence. Zulfiqâr Khân Nusrat Jang received a gift of three thousand Rupees cash, a special robe of honour, a jewelled quiver and a bow. His rank was increased to 3,000 personal, 2,000 horse (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 332).

These repulses determined Râjâ Râm, brother of Sambhâjî, to re-organise the military forces of the Mahrâttâs and to drive out the Mughals from their country. The post of Senâpati or Commander-in-Chief was given to Santâjî Ghorpâde. He enrolled fresh soldiery to the number of hundred thousand. Twenty thousand were kept actively engaged with the Imperial forces in Western Deccan ; ten thousand were in the escort of Râjâ Râm ; the remainder were divided in three flying columns of twenty thousand each,

[1] According to Khâfî Khân, Siddî Mas'ûd requested the Emperor through Fîrûz Jang, asking to be excused from going to his presence and to be allowed to send his sons instead. (Vol. II, p. 272).

A'zam, in order to remove the reason for jealousy among the nobles and high officers. Moreover, Fîrûz Jang had received two arrow wounds while he was leading the assault in presence of the Emperor himself, who riding a horse accompanied the party right up to gun-shot distance from the walls and bastions of the fortress. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 295 ;*Khâfi Khân*, vol. II, p. 354).

On the 16th May, 1687, Fîrûz Jang resolved to take the fort by an escalade, during the night. A ladder was fixed against the bastion and a few of the veterans ascended the ramparts. As chance would have it, a 'pariah' dog that was loitering about nearby saw them and started barking loudly. This roused the garrison from sleep. Immediately the assailants were put to the sword and others who were mounting up were killed by explosive shells.

When Hâji Mehrâb, a favourite servant of Aurangzîb, came to know of Fîrûz Jang's escalade, he went off to the Emperor early in the morning, without exactly finding out the upshot of the affair, to report the success of Fîrûz Jang's daring enterprise. The Emperor was still sitting on his prayer-carpet, reciting his prayers. He anxiously asked what brought him so early in the morning. The Emperor on hearing the happy news ordered the drums of victory to be beaten. The Emperor as well as others were sorely disappointed when the truth was known. (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 242.)

Mirzâ Muhammad Ni'amat Khân, whose poetical sobriquet was 'Alî, found this tragic event a fit subject for his cynical writings, both in prose and poetry. (*Waqâ'î Niamat Khân-i-'Âlî.*)

In September, 1687, Rûhullâh Khân managed to open secret negotiations with 'Abdullâh Khân, a confidential officer of Abu'l-Hasan who was in charge of one of the gates of the fortress, through Ranmast Khan. According to their understanding, 'Abdullâh Khân left the gate open in the last watch of the night of the 21st September, 1687 and the Mughal forces entered the fortress. The drums of victory were beaten and the fortress was captured. Abu'l-Hasan was taken captive and sent to Daulatabâd to be kept in internment. He was put in charge of Jân Sipâr Khân who escorted him to Daulatabâd. The captors seized the spoils which amounted to 8,51,000 huns, 20,050,000 Rupees, besides jewellery, gold and silver plate of great value (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 367).

After the reduction of the fortress, Fîrûz Jang was raised to the rank of seven thousand Zât, and seven thousand horse. He was also awarded a robe of honour, a special suit of armour, and a jewelled staff (*Ma'âthîr-i-'Âlamgîrî*, p. 296).

Now, the Emperor directed that large roving parties under his chief generals should be sent out to annex the territories of the kingdoms of Golconda and Bîjâpur. In January, 1688, Fîrûz Jang was dispatched with twenty-five thousand horse to reduce the fortress of Adonî, situated on the south of the Tungabhadrâ, which was occupied by Siddî Mas'ûd, a slave general of Sikander 'Âdil Shâh. During the operation of the siege of Bîjâpur, he had managed to carry off with him much jewellery and treasure to the fortress of Adonî (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 308).

On reaching the neighbourhood of Adonî, Fîrûz Jang sent a message to Siddî Mas'ûd asking him to capitulate without bloodshed. But, as he refused to yield without a trial of strength, Fîrûz Jang started sinking mines, digging trenches and bombarding the fortress. Those who came out to offer resistance, were put to the sword. After some time, Siddî Mas'ûd, feeling that he would not be able to resist longer and that his fall was near, capitulated. He came out of the fortress, reiterating his pleas for forgiveness. The fort was occupied by the Imperial garrisons and renamed Imtiâzgarh. The Emperor was highly pleased to hear the news of the capture of Adonî. He ordered the royal band to play the notes of victory. Siddî Mas'ûd was treated with consideration by Fîrûz Jang, and his sons were brought to Aurangzîb. The Emperor, purposely, did not want to humilate Siddî Mas'ûd by ordering him to be brought to his presence. In his absence the Emperor granted him the rank of 7,000 personal, 7,000 horse and further honoured

he intended to dispatch a force of forty thousand men under Khalîlullah Khân to re-inforce the Bîjâpurîs. The plan was that his force would proceed from the left flank and Sambhâjî's army would come from the right flank and give battle to the Imperial armies (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 260). On hearing this, Aurangzîb sent a large army under the command of Shâh 'Âlam to effect the conquest of Hyderâbâd. When the Imperial forces reached Malkhed, prince Shâh 'Âlam tried his best to settle terms with Khalîlullah Khân and to avoid war but failed. The prince stopped at Malkhed for two months, waiting for the cessation of the rains. The Emperor, feeling dissatisfied with the progress of Shâh 'Âlam's forces, wrote him a strong letter of rebuke. On receiving this letter the prince advanced in the direction of Hyderâbâd. The Imperial forces defeated Sheikh Minhâj and Rustam Râo who offered resistance. After this the prince continued his march to Hyderâbâd unopposed. When intelligence was brought to Abu'l-Hasan of his army's defeat he was greatly alarmed and fled with a few servants by night to the Golconda fort. Great disorder prevailed in Hyderâbâd. The Imperial army attacked the city and occupied it. Shâh 'Âlam appointed officers to prevent plunder and punish miscreants. After a few days negotiations, Abu'l-Hasan agreed to pay one crore and twenty lakhs of huns annually, and to dismiss Madanna and Akanna from the service (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 208). The Imperial armies then evacuated the territory of Abu'l-Hasan.

After the capture of Bîjâpur, Aurangzîb again directed his attention towards Golconda. On the pretext of paying his respects to the tomb of Gisûdarâz at Gulbarga, he advanced into the territory of the Golconda kingdom, and dispatched Fîrûz Jang to effect the conquest of Udghîr or Ibrâhîmgarh, which was situated on the way to Hyderâbâd.[1] In recognition of his service, Fîrûz Jang was awarded a robe of honour and an elephant. The men who were in his escort, namely, Dilêr Khân, Sharzâ Khân, Jamshêd Khân, Mâlojî Gopâl Râo, Kamâluddîn, Râo Dalpat, Saf Shikan Khân, Aqâ 'Alî Khân, 'Abdul Qâdir Khân, Jehângîr Qulî Khân, Sûfî Khân, Audat Singh Bahdâria and Sarbarâh Khân Chêlâ were all given robes of honour, horses, elephants, titles and promotion (*Ma'âthir-i-'Alamgîrî*, p. 284). Fîrûz Jang joined the Emperor not very far from Golconda. The latter made him Commander-in-Chief and sent him in advance to take possession of the fortress of Golconda. Fîrûz Jang, in spite of the resistance offered by the Qutub Shâhî armies, managed to reach the foot of the fortress and wanted to take it by a sudden assault. Qalich Khân, under the command of his son, led the storming party and was struck by a cannon-ball. He expired after three days. Fîrûz Jang laid regular siege which turned out to be a long, arduous affair. The besieged under the direction of Sheikh Nizâm and Abdul Razzâq showed great skill and perseverance. Fîrûz Jang directed Saf Shikan Khan to carry the trenches towards the moat and erect mounds with high batteries to bombard the fortress. The Emperor's presence also inspired the soldiery to action. When everything was ready for bombarding the besieged, Saf Shikan Khân feeling jealous of Fîrûz Jang, who had gained greater distinction in the eyes of the Emperor for his efficient siege operations, resigned from the post of chief of the artillery (*Mîr-i-Âtish*). Salâbat Khân and, after him, 'Izzat Khân were appointed to the post. The occasional but daring raids of the besieged had succeeded in demolishing the batteries. 'Izzat Khân was even taken prisoner by the enemy. Meanwhile the heavy rains had destroyed the mound which was made after painful and patient efforts of Fîrûz Jang and his men. In the words of Khâfî Khân, 'they had completed the work of one year in one month and a few days' (vol. II, p. 336).

The mutual jealousy of the officers was responsible for the delay in the reduction of the fortress. The state of affairs irritated the Emperor. He better consulted the interest of his cause in giving the general command of his forces to prince Muhammad

[1] This fortress was later known as Fîrûzgarh (*Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. II, p. 875).

rare privilege of touching the feet and hands of the Emperor (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 265).

They set out with twenty thousand bullock-loads of grain in the direction of Bîjâpur, 'riding on the horses of wind and lightning, to bring as quickly as possible succour to the prince'. At Indî they fought a severe action with the forces of Sharzâ Khân and 'Abdul Ra'ûf, which barred their way to Bîjâpur. The escort under Fîrûz Jang numbered less than one-tenth of the number of the enemy who were nevertheless repulsed and compelled to disperse in different directions. Meanwhile, Pem Nâyak, Zemindâr of Wakinkherâ joined the Bîjâpurîs, with six thousand soldiers, swelling their number to about fourteen thousand. Fîrûz Jang undaunted by the superior numbers, gave them battle, resulting in his final victory and the rout of the enemy. Fîrûz Jang re-established the military outpost of Indî, which was situated on a strategically important site between Sholâpur and Bîjâpur, and appointed I'tiqâd Khân as the Thanedâr. Saif Khân was also posted there. (*Ibid.*, p. 266).

With the arrival of Fîrûz Jang, the whole outlook at Bîjâpur underwent a change. The disheartened soldiery revived in the stimulating presence of this hero. When prince Â'zam approached Fîrûz Jang, he embraced him. The marvellous feat of Fîrûz Jang had turned scarcity into plenty. On hearing this news the Emperor felt highly delighted and is reported to have said: 'As God almighty has saved the honour of the house of Timûr through the exertions of Fîrûz Jang, so may He guard the honour of his descendants till the day of resurrection.' (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 319.)

After the siege of Bîjâpur had already dragged on for fifteen months, the Emperor decided to proceed there in person and conduct the operations under his own leadership. He set out from Sholâpur on 14 June, 1686, and reached Rasûlpur, a suburb of Bîjâpur, on 23 July. The presence of the Emperor encouraged the besiegers and they set heartily to work at digging trenches and filling up the moat. Ghâziuddîn Khan Fîrûz Jang had drawn up a plan of action to reduce the fortress which was brought to the Emperor's notice and approved. The Emperor sent him an emerald ring through Siâdat Khân. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 269.)

The presence of the Emperor disheartened the besieged who were extremely hard-pressed on account of lack of provisions. Their men and horses had perished in great distress. Meanwhile, the exertions of Fîrûz Jang and other veterans had brought the besieged to bay and had compelled them to surrender the fortress. On 10 September, 1686, Abdur Ra'ûf and Sharzâ Khân waited on Fîrûrz Jang and concluded the terms on behalf of Sikander. Next day they were introduced to the Emperor who received them with consideration. On the 19th September, the Emperor entered the fort with pomp and display.

When Sheikh Hidâyat Kaish, reporter-general of news (*Waqâ'inavîs-i-kul*), showed the Emperor the account of the siege and victory, in order to preserve it in the Imperial records office, the latter with his own pen added this sentence: 'Through the effort of the noble and dear son, (farzand arjumand) Ghazîuddîn Khân Fîrûz Jang, the siege was brought to a successful termination.' (*Khâfî Kkân*, vol. II, p. 322). Thus to his other titles Fîrûz Jang received the rare distinction of being addressed as 'dear son,' by the Emperor. The same words were mentioned by the Emperor in his despatch addressed to Amîr Khân, Subedâr of Kabul. Somebody composed the chronogram of the capture of the fortress in the following words: 'Sadd-i-Sikander giraft' (The sill of Sikander is taken). (*Ibid.*, p. 322).

Aurangzîb had not forgiven Abu'l-Hasan for actively helping the Bîjâpuris by sending a Golconda force under the command of Ambâjî Pandit. Moreover, the enormous wealth and resources of the Golconda kingdom could not have escaped the notice of the Emperor. During the siege of Bîjâpur, the Mughal police had intercepted a letter of Abu'l-Hasan addressed to his agents in Aurangzîb's camp, telling them that

onferred the title of Fîrûz Jang on Shihâbuddîn Khân and also bestowed the right of laying kettle-drums. One hundred and fifty robes of honour were sent for his companions. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 252.)

Knowing full well that this struggle with the Mahrâttâs was going to be very rotracted one, Aurangzîb, after inflicting severe defeats on the enemy, undertook the onquest of Bîjâpur. He therefore transferred his headquarters to Ahmednagar in 'ovember, 1683. The excuse for war with Bîjâpur was not far to seek. The Emperor had invited Sikander Âdil Shâh, King of Bîjâpur, to join him in his crusade gainst the Mahrâttâs, to supply provisions to his troops from his territory and to allow assage to his armies through his realm without any restrictions whatsoever. This aughty demand of Aurangzîb exasperated Sikander who sent a spirited reply, asking he former to remove the outposts that his generals had established in Bîjâpur territory ithout any previous notice or permission. He also demanded the Emperor to return im the tribute that had been unlawfully exacted from his predecessors, by the Mughal overnment. Intelligence was also brought to Aurangzîb that Sikander was secretly elping the cause of the Mahrâttâs, so he decided to annex the kingdom in order to rengthen the Imperial resources for the impending struggle for supremacy in the Deccan.

Prince Â'zam was sent to lay siege to Bîjâpur in March, 1685, and a large rmy was despatched under his command. Sikander entrusted the defence of his kingdom o Syed Makhdûm, surnamed Sharzâ Khân, who was a military expert and a man of onsiderable influence. He also invited his vassal Pem Nâyak, chief of the Berad clans, o harrass the Mughal armies. The Mughals routed the Bîjâpuris under the command f Sharzâ Khân on the bank of the Tungabhadrâ river and inflicted heavy loss. The Mughal armies under Â'zam were constantly kept harrassed by Bîjâpuri contingents. Advancing slowly, they laid siege to Bîjâpur and established outposts to keep up their ommunications with the Emperor at Sholâpur. These communications were cut off by he armies of Pem Nâyak and Siddî Mas'ûd, who, in response to Sikander's appeal, came o offer help against the Mughal advance which they considered to be dangerous for their wn existence as well. Abu'l Hasan of Golconda also sent a contingent under Ambâjî Pandit, in spite of the warning sent to him by Aurangzîb on this occasion. These forces ccupied the country in the neighbourhood of Bîjâpur and prevented all provisions from eaching the besieging army of prince A'zam. The Emperor was anxious on account of he famine prevailing in Â'zam's army. Grain became very dear and the hungry soldiery elt too dispirited to continue the siege for long. On hearing this the Emperor advised is son to raise the siege. The prince considered retreat to be beneath his dignity; he eld a council of his experienced officers asking their advice what to do. He also showed hem the letter he had received from the Emperor. He especially asked the opinion of Hasan 'Alî Khân 'Âlamgîrshâhî who was a veteran and had great experience of warfare. The latter is reported to have said: 'In the interest of our men, it is advisable to etire'. Others also seconded this opinion. Then the prince addressed them thus: You have had your say, now hear mine. I, with my wife and two sons here, am ot going to leave this place so long as breath is left in us. . . . You are free to do as ou like'. On hearing this they all agreed to continue the siege and put up with any ardship or calamity that might befall them (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 264).

When news was brought to Aurangzîb at Sholâpur, that prince A'zam was etermined to continue the siege whatever might happen, he summoned Ghâzîuddîn Khân Fîrûz Jang, considering him to be the most suitable person to undertake any hazardous task, and directed him to march to Â'zam's relief. His brother Mujâhid Khân, and Tîr Andâz Khân, Khanjar Khân and others agreed to accompany him. Before Fîrûz Jang started on the expedition, the Emperor presented him with a robe of honour, a fish standard, (Mâhî Marâtib), four flags and an elephant. He was also given the

invasion through the Aravalli passes. After the flight of Muhammad Akbar, the Mahârânâ best consulted his own interest by coming to terms with the Emperor, whom he could resist no longer. The Emperor also welcomed the opportunity, as he wanted to leave in person for the Deccan to direct the operations there. The Rânâ promised to refrain from offering any support, moral or material, to the rebellious Râthors. He sent his Vakîls with tribute and a declaration of obedience to the Imperial authority. The Emperor agreed to withdraw his forces from the territory of Mewâr and to give the Rânâ the rank of five thousand. In return, the Rânâ ceded the sub-divisions of Mandal, Pur and Bednor to the Emperor, in lieu of the payment of Jizi'ya (*Sarkar*, vol. III, p. 422).

After this the Emperor started from Ajmer for the Deccan and reached Burhânpur on 13th November, 1681, from thence he left for Aurangâbâd where he arrived on 22 March. He organised roving parties of his troops, in order to give battle to the Mahrâttâs in different parts of the country. Prince M'uazzam, now dignified with the title of Shâh 'Alam, was sent to conquer the Konkan territory, and prince Â'zam was directed to proceed towards Khândesh and Buglâna. Shihâbuddîn Khân, though quite a young man, had acquired such a standing with the Emperor that he was also given the command of a party of troops to proceed in the direction of Junner (North Konkan) and to subdue the Mahrâttâ chiefs of that region. During his absence on this expedition, the Emperor was pleased to confer on him the post of Superintendent of mace-bearers, in place of Mukarram Khân. Syed Ughlân Khân was made his deputy. (*Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. II, p. 874). After his successful operations, the Emperor directed him to reduce the fort of Râmsej which was situated on the summit of a hill. Here Shihâbuddîn Khân met a severe resistance from the besieged. All his exertions failed to produce any impression on the place. The besieged resisted with great perseverance and skill. The Qiledâr of the fortress was a man of considerable experience. Having no iron cannon, he had wooden ones made. He used leather for missiles and drove back the assailants with showers of stones and burning grass. In the words of Khâfî Khân, 'each wooden cannon equalled ten iron ones' (Vol. II, p. 282). After these repulses Shihâbuddîn Khân was recalled and Shâh Jehân Bahâdur Kokaltâsh was sent to lay siege to the fortress. He too, after many attempts to reduce it, failed to achieve any substantial result.

In 1683, Shihâbuddîn Khân was despatched with a force towards Poona and Supâ in order to establish military posts there. Before his departure, the Emperor presented him with a quiver, a bow, ten thousand rupees cash and two maunds of gold to defray the expenses of the army. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 242). It seems that he came back to the presence and was again, after a few months stay at the court, directed to march for the relief of prince Shâh 'Âlam in the direction of the Konkan (*Ibid.*, p. 248). The Emperor recognised his services by sending him a robe of honour, five bridles and food from the royal household, as a token of his favour. Most probably he received the title of Ghâzî-uddîn Khân also on this occasion (*Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. II, p. 874).

Ghâzîuddîn Khân (Shihâbuddîn Khân) encountered a large Mahrâttâ force under the command of Sambhâjî at Pachad in the neighbourhood of the fortress of Râigarh. He inflicted a severe defeat on the enemy who were compelled to seek shelter inside the fortress. As he was not fully prepared to lay siege, he retired after setting fire to the outer portion of the fortress. In this expedition many Mahrâttâ leaders were killed and several captured, including Bidâjî, Akojî Malhar and Râo Subhânchand, whom he sent to the court and, as they whole-heartedly identified themselves with the cause of the Emperor they were duly given robes and other presents (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 249). Ghâzîuddîn Khân collected a vast booty on this occasion. When the news of this victory was sent to the Emperor, by means of Syed Ughlân and Shâh Muhammad, Chobdâr, he felt extremely delighted. The former of the messengers was presented with an elephant while the latter obtained a robe of honour and two hundred rupees cash. The Emperor

of Hasan 'Alî Khân were saved from disaster. This general was reinforced and freshly provisioned, and after a few weeks he was in a position to inflict a severe defeat on the Mahârâna of Udaipur (22 January, 1680), crushing his power completely and compelling him to flee to the Aravalli hills.

Soon afterwards Shihâbuddîn Khân was directed to proceed towards Sirohî, (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 199) in order to check the movements of Durgadâs who contemplated attacking Ajmer to contest the Imperial throne in favour of prince Muhammad Akbar. Shihâbuddîn Khân succeeded in sowing seeds of disaffection in the army of the prince. The first thing he did was to send secret intelligence to his brother, Mujâhid Khân, about his movements. Mujâhid Khân although exalted to a high position by the prince, waited for an opportunity to escape and join the Imperial forces. He went to prince Muhammad Akbar and succeeded in persuading him to give him (Mujâhid Khân) leave to go and bring over his brother, Shihâbuddîn Khân, to his side. After obtaining permission from the prince, he took as much money and valuables as he could carry with him and joined his brother with the intention of never returning. His desertion was followed by that of many others of all ranks and conditions, very few remaining with the prince. The prince had also sent Mîrak Khân, in whom he had the greatest confidence, to go and persuade Shihâbuddîn Khân to join him. (*Ma'âthir-i-'Âlamgirî*, p. 199.)

When prince Akbar's armies approached Ajmer and made preparations for general action next day, most of his men went over to Shihâbuddîn Khân's side during the night. Only a few men under the command of Ziâuddîn Muhammad Shujâî and the Râthor soldiery remained with him (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 275). The prince feeling dispirited resolved to take to flight and seek an asylum with Sambhâjî who received him well, gave him a house to dwell in near the fort of Râhîrî and fixed an allowance for his maintenance (*Ibid*, p. 277).

Shihâbuddîn Khân having achieved his purpose without any shedding of blood, repaired to Ajmer. The Emperor was highly pleased to welcome him. He was anxiously awaiting fresh reinforcements in view of the preparations made by prince Muhammad Akbar and his Râjput coadjutors, and had entrenchments dug around the camp and batteries fixed up on the hills around. The arrival of Shihâbuddîn Khân reassured the Emperor who invested him with a robe of honour on account of his feat of covering the distance of 120 miles (60 Kiroh) from Sirhoî to Ajmer and on his winning over the prince's soldiery to his side, and appointed him to the post of 'Dârogha-i-'Arz-i-Mukarrar' which was reserved only for the nobles in whom the Emperor reposed the greatest confidence. The occupant of this post was charged with the duty of revising royal orders and placing them for the second time for Imperial sanction. Two hundred men of his party also received honours. Mîrak Khân, who had left all his belongings in the camp of the prince was given a robe of honour, two thousand rupees in cash and the rank of 200 Zât, 50 horse.

Aurangzîb concluded a treaty with the Rânâ of Udaipur in June, 1681, through the intermediary of Shiâm Singh of Bîkâner, in order to march towards the Deccan to break the dangerous alliance between prince Muhammad Akbar and Sambhâjî, who intended to set up the former as a rival claimant to his father and also to rally the Râjputs under his banner. (Orme's *Fragments*, p. 108.) The Emperor, from the very beginning of his operations in Rajputana had tried to conciliate Mahârânâ Jai Singh of Mewâr. He sent him a message telling him that the measures he had been compelled to adopt against the Râthors, were directed by sheer political necessity, no other alternative being left open to him. He had reassured him as to the future of his kingdom and asked him to help the Imperial forces to crush the spirit of revolt in Mârwâr (*Âdâb-i-'Âlamgîrî*; Asafia Library, Pers. MSS.) But Durgadâs succeeded in gaining the ear of the Mahârânâ. He made him realise, somehow or other, that after the occupation of Mârwâr territory, the autonomy of Udaipur would be threatened, which would be then exposed to

2

Shihâbuddîn was born in Samarqand about the year 1649 A.D. After his father left for India, he entered into the employ of Subhân Qulî Khân, ruler of Bokhârâ. He desired to join his father in India, but the ruler of Bokhârâ grew so fond of him that he would not let him depart. One day Subhân Qulî had gone out for recreation and Shihâbuddîn and two courtiers, Khwâja Yâqûb and Rustam Bey also accompanied him. Shihâbuddîn succeeded in getting round the two courtiers to persuade the king to give him permission to proceed to India and join his father. It is difficult to find out whether they agreed to do this, because they wanted to please him, or whether feeling jealous at the increasing influence the young man was acquiring with their patron, they desired to clear the way for their own ambition. Anyhow they mentioned the whole matter to Subhân Qulî Khân at a favourable opportunity when his disposition was in a most agreeable state. For 'those who desire to get something done by their lords, have to wait for a suitable occasion'. They, however, suceeded in getting permission for their young friend to go to India. Then the king summoned the young Shihâbuddîn and recited the first sûra of the holy Qurân, which is done when some dear one departs, and addressed him thus; 'Thou goest to India, thou shalt become great'. In truth his words came true. Shihâbuddîn acquired such rank and distinction in India as could well be the object of envy for the lords of Balakh and Bokhârâ. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 91; *Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. II. p. 872.)

Shihâbuddîn arrived in India in the 12th year of Aurangzîb's reign (1669), when he was hardly twenty years of age. He was well received by the Emperor who conferred the rank of 300 Zât, 70 horse on the promising young man. The Emperor evinced further interest in the young man by getting him married to Safia Khânam, daughter of Sadullah Khân, the chief Minister of the Emperor Shâh Jehân. (*Târikh-i-Fathiah.*)[1]

For nearly ten years he worked as an apprentice, probably with his father. When the Emperor summoned his highly-trusted officials and noblemen from different parts of the country to Râjputâna, Shihâbuddîn also joined him at his headquarters at Ajmer. His courage and skill as a soldier were first noticed when he took part in the expedition led by Hâmid Khân (son of Murtuzâ Khân) to chase the Râthors in their mountain fastnesses. He was complimented for his services, by getting a robe of honour and a she-elephant, from the Emperor. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîr î*, p. 194.)

After his return from this expedition, Shihâbuddîn was summoned at midnight by the Emperor who asked him to bring speedy information from Hasan 'Alî Khân, from whom no intelligence had arrived since a long time. All communications with him had been cut off and he was left isolated in the defiles north-west of Udaipur. This had caused great anxiety to the Emperor. Shihâbuddîn, not even knowing the topography of that part of the country, full of forests and wild beasts and infested with robbers, agreed to undertake the mission. At the risk of his life he started immediately and by forced marches brought back intelligence in two days' time. In recognition of this service, the Emperor bestowed on him the title of 'Khân' and is reported to have foreseen his greatness and said: 'One who, like the ruby, goes through afflictions patiently, becomes the decoration of the wreath of fortune's crown'. It was mainly due to the enterprising courage of Shihâbuddîn Khân that the Imperial forces under the command

and 'Âlam Ali Khân. He was raised to 5,000 Zât and 5,000 horse, and obtained the title of Nasir-ud-Daulah Salâbat Jang in 1132 H. Nizâm-ul-Mulk sent him as Governor of Burhânpur, superseding Marhamat Khân. After the victory over Mubâriz Khân, he was promoted to the rank of seven thousand. After the death of A'izz-ud-Daulah, he was appointed governor of Aurangâbâd. After the invasion of Nâdir Shâh, when Nizâm-ul-Mulk obtained permission from the Emperor to go to the Deccan to quell the rebellion of his son, Nâsir Jang, Abdur Rahîm welcomed him at Burhânpur and got the title of Mubâriz Jang. He died in Aurangâbâd in 1156 H. He was a distinguished caligraphist and a great patron of arts. His nom-de-plume was 'Faiâzraqam'. His son Mujâhid Khân did not achieve any fame. (*Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. III, p 837).

[1] According to the author of the *Târîkh-i-Khurshîd Jâhî* the name of the daughter of the chief Minister was Wazîr-un-Nisâ. (p. 370.) I have not been able to ascertain his source of information.

Minister that he soon hoped to be fit and to be able to resume his duties in the service of the Emperor. According to his wont he was all the time amusing the surgeons by admiring the beauty and charm of their looks. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 289.) No treatment prevailed against the hand of death. Qalich Khân died after three days and was buried at *Âsafnagar* in the neighbourhood of the Golconda fort. His right arm which was carried away by a canon ball is said to have been buried in the village of Qismatpur. It was recognised by his signet-ring and buried where it was found. The anniversary of Qalich Khân is still observed by the Sarf-i-Khâss.

Qalich Khân was held in high esteem by Aurangzîb. During his three days' illness, the Emperor wrote to his son, Ghâzîuddîn Khân Fîrûz Jang, saying:

'I wanted to come down to inquire after the health of that devoted well-wisher of the State. But I said to myself that I might not be able to bear the sight of his painful condition. This is why I sent down Jumdat-ul-Mulk to see him with my eyes and to tell him the secret of my heart. The only fruit now obtainable is grapes but the Ûnânî physicians think they will not agree with the condition of that pillar of the State, than whom there is no one who knows the royal disposition better. I have resolved not to eat the grapes myself. God willing, we both will eat together, after he is restored completely. A distich:

O God! my desire is so lovely,
Would that I might fulfil it!'

(*Ruqât-i-'Âlamgîrî.*)

Once writing to prince A'zam, Aurangzîb puts forward the name of Qalich Khân as an example to be followed by other leaders. He says:

'I have received information to the effect that Qalich Khân is extremely considerate towards his soldiery. He offers them coffee, has breakfast served them at the time of breakfast and meals at the time of meals. When the soldiers leave his place, he offers them scent and betel-leaf. He sends all kinds of food to the houses of the soldiers so that their women-folk and children may not complain and be sad on account of their men eating everything by themselves, and on account of our niggardliness to grudge to let them partake of our meals.' Further on, Aurangzîb relates an anecdote of some holy man to whom somebody complained of the bad times. The holy man replied that one should be grateful that worse had not yet come. Aurangzîb purported to convey that his age was not so bad as people said since it had men like Qalich Khân living in it. (*Ibid.*, p. 20.)

Qalich Khân left five sons. The eldest, Shihâbuddîn Khân, later known as Ghâzîuddîn Khân Fîrûz Jang, earned the position of highest distinction possible for any Mughal noble. The latter had two real brothers, Mujâhid Khân[1] and Muhâmid Khân[2]; the others being, Hâmid Khân[3] and Abdur Rahîm[4].

[1] His name was Muhammad 'Ârif. For some time he was appointed Faujdâr of Khairâbâd. In the 18th year of Aurangzîb's reign 'Inâyat Khân succeeded him (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 141). In the 24th regnal year he received a robe of honour and an increment of his Mansab (*Ibid*, p. 199), in recognition of his services in Râjputâna by leaving prince Muhammad Akbar and joining the Imperial party.

[2] He does not seem to have acquired any distinction in his career. He led a mediocre existence.

[3] He was a half-brother of Ghâzîddîn Khân Fîrûz Jang. In the 29th year of Aurangzîb's reign he was complimented by obtaining a title and a she-elephant as Imperial gifts. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 263.) He was put in charge of the treasure sent to Mâlwâ for the expenses of prince Â'zam's army. (*Ibid.*, p. 263.) In the 48th regnal year he was raised to 1,500 Zât, and 500 horse. Next year he quarrelled with his half-brother Fîrûz Jang and came to the Imperial presence and was promoted to 2,000 Zât, 1,000 horse. (*Ibid.*, p. 495.) In the reign of Farrukhsiyar he was raised to the rank of 5000 and was considered to be a distinguished person in the court. He was especially appointed by this Emperor to quell the rebellion of the Jâts living between Agra and Delhi. Later the title Mu'izzud-Daulah Salâbat Jang was bestowed on him, during the reign of Muhammad Shâh. Nizâm-ul-Mulk appointed him his deputy in Gujerât but recalled him and made him Subedâr of Nânded in the Deccan. He died in Gulbarga on his way to the Carnatic and was buried near the tomb of Syed Muhammad Gisûdarâz. Nizâm-ul-Mulk was one of those who carried the coffin all the way to the grave, on their shoulders. (*Târikh-i-Fathîah*, MS).

[4] Later he was known as Nasîr-ud-Daulah Salâbat Jang. He obtained the title of Khân in Aurangzîb's reign. Bahâdur Shâh conferred on him the title of Chin Qalich Khân and appointed him faujdâr of Jaunpur. When Nizâm-ul-Mulk retired from the world, he also accompanied him. He took active part in the battles against Dilâwar 'Ali Khân

lived in Ajmer for some time as governor of the province, he was considered to be in the best position to know the men and affairs of that part of the country. Several Râjput chiefs, Inder Singh, Râm Singh and Subhân Singh also accompanied the party. Fifty thousand gold coins were given to Shâh 'Âlam personally and fifty thousand were given to the party for the expenses of the expedition. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 203.) In recognition of his services he was awarded a robe of honour and a horse with golden trappings, and the title of Qalich Khân.

It seems that Qalich Khân did not see eye to eye with the prince Shâh 'Âlam on certain religious matters, the prince being inclined towards Shâfite sect while the former was a man of orthodox views. As his views ran counter to those held by the prince, he left him without even asking his permission, and joined the Imperial party. When Aurangzîb came to know of this affair, he ordered Ihtimâm Khân, Kotwâl, to put Qalich Khân in internment. Later he was put in charge of Salâbat Khân and in view of his ability, however, he was pardoned and released after a few months. This was a disciplinary measure. Aurangzîb did not even spare his sons if they did anything against his will.

Having regained the confidence of the Emperor, Qalich Khân was re-appointed to the post of Sadr-i-kul in 1681, after the death of Rizvî Khân. Next year he was directed to accompany prince A'zam in his campaigns in the Deccan where prince Muhammad Akbar had taken refuge at the court of Sambhâjî, son of Sîvajî. In his place Sharîf Khân was appointed as Sadr-i-kul by royal orders. (*Ma'âthir-i-'Alamgîrî*, p. 219.) When taking leave from the Emperor, Qalich Khân was given a robe of honour, a horse and the right of playing kettle-drums. This latter right was a special favour granted only to the nobility of the rank of 2,000 upwards. It was not to be exercised in the presence of the Emperor, nor within a prescribed distance from the place where he happened to be residing. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 214.)

In the 29th year of Aurangzîb's reign Qalich Khân was appointed to the governorship of Zafarâbâd (Bîdar), and was again given a robe of honour, a suit of armour and an elephant. Najâbat Khân and Asâlat Khân, sons of Syed Muzaffar Hyderâbâdî,[1] and Ikrâm Khân, Nâsir Khân and Syed Hasan Khân were appointed to work under his orders. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 263.)

When the Emperor resolved to march in person to effect the conquest of Bîjâpur Qalich Khân joined him at Sholâpur and accompanied him throughout the campaign in 1685–86. He was in command of the entrenchments and received a bow and a quiver from the Emperor. After the conquest of Bîjâpur he obtained a horse and a dagger as a royal present.

In 1687, Qalich Khân took a conspicuous part in the siege of Golconda. Being the leader of the storming party, he was leading a charge when heavy cannonade from the enemy overtook him. His right shoulder was struck by a musket-ball, inflicting a deadly wound. Lutfullah Khân came to his rescue and took him to the camp. He refused to dismount, riding back all the way to the camp, in spite of the shattered condition of his right arm. Aurangzîb was much grieved to hear of this mishap. He sent down his surgeons to treat him. Next day Asad Khan (Jumdat-ul-Mulk), the chief Minister, came to inquire after his health, on behalf of the Emperor. On reaching Qalich Khân's camp, he was surprised to see him sitting with perfect composure, taking coffee with the left hand while the surgeons were busy taking out bits of iron and bone from his wound in the right shoulder. With the usual smile on his face, he told the chief

[1] Najâbat Khân and Asâlat Khân joined Sheikh Nizâm Hyderâbâdî, deserting the cause of the Emperor, prior to the first siege of Golconda. Qalich Khân, reposing full trust in them sent them to serve as guides for the forces of prince Shâh 'Âlam and Khân Jehân. The roving parties of Qutbu'l-Mulk's generals under the command of Sheikh Nizâm harrassed the Imperial forces, creating greater confusion by winning over the two brothers (Najâbat Khân and Asâlat Khân). (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 269.)

by the State. In 1665 A.D. (1075 H.) Khwâja 'Âbid was raised to the rank of 4,000, and 1,500 horse and an elephant was given to him. (*'Âlamgîr-Nâma*, p. 855). He held the office of Sadr-i-kul for nearly six years.

In 1668 A.D. (1078 H.) he was replaced in this office by Rizwî Khân, son of Sheikh Mîrak, and was sent to Ajmer as governor of the province. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 62.) He remained there for nearly three years, and was transferred thence to the governorship of Multân where he discharged the duties of his office for four years. (*Ibid*, p. 110.) During all this time he enjoyed the full confidence of Aurangzîb, as is shown by the fact that in the thirteenth year of his reign (1671), Aurangzîb distributed especial robes of honour to those in whom he reposed the greatest trust; and Khwâja 'Âbid was one of the recipients, the others being Asad Khân (later known as Jumdat-ul-Mulk, chief Minister of Aurangzîb), Murtuzâ Khân, Hasan 'Alî Khân and Tâhir Khân. Early in 1676, Khwâja 'Âbid was summoned by the Emperor to repair to the capital where he was entrusted with the leadership of the Hajj party going to Mecca. (*Ibid*, p. 143.) The leader of the Hajj party was every year appointed by the Emperor. He used to take the royal presents to Mecca and Medina. At the time of his departure, he received a especial robe of honour from the Emperor, a sign of great distinction. Generally the persons appointed for this mission were those who enjoyed a high reputation for their learning and piety. (*Ma'âthir-i-'Âlamgîrî*, p. 143.)

After his return from Mecca, Khwâja 'Âbid repaired to the court and joined the Emperor. He must have remained at the court till August 1679, when the Emperor marched to Râjputâna to restore order and establish his authority in that part of the country.

The death of Râja Jaswant Singh at Jamrûd, who had been reinstated in his rank at the intercession of Mirza Râja Jai Singh and had been appointed to the command of frontier outposts, occasioned a rising in Râjputana which ended in a long-drawn-out war. Râja Jaswant Singh had left no son, therefore, the Emperor decided to annex the Mârwar State. He refused to recognise Ajit Singh, his posthumous son, born at Lahore. But Ajit Singh's cause was espoused by Durgadâs, son of Râja Jaswant's minister Askaran, a Râthor veteran of great courage and faith. The serious nature of the Râjput rebellion could well be realised from the fact that the Emperor called up reinforcements from all parts of the Empire and made Ajmer his headquarters. He summoned prince Â'zam from Bengal, prince Mu'azzan from the Deccan and dispatched his own army under the command of prince Akbar to invade the Râjput territory from all sides. The Rânâ of Udaipur, who had actively joined the Râthor rebels, on hearing of the Imperial advance fled into the mountain fastnesses, with treasure, family and followers. (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 263.) Jodhpur was reoccupied and all considerable towns in the plains were captured and Mughal civil and military posts were established.

When the Rânâ and the followers of Durgadâs felt hard pressed they thought of creating disunity in the ranks of the Emperor, by pretending to offer their allegiance to prince Mu'azzam provided he joined them. But the prince, made of harder stuff paid no heed to these tempting messages. When disappointed, they tried the same game with prince Muhammad Akbar. Durgadâs, considered to be a very persuasive spokesman, called on the prince, pledging on behalf of his followers as well as the Rânâ of Udaipur to accept his suzerainty. He succeeded in leading the inexperienced prince astray, who ascended the throne, struck coins in his own name and advanced on Ajmer to fight a decisive battle with his father. Tahawwar Khan was given the rank of seven thousand and the title of Amîr-ul-Umarâ. Mujâhid Khan, son of Khwâja 'Âbid, also received distinguished honours which he feigned to have accepted, desiring all the time to go over to the Imperial side at a suitable opportunity. (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 366.)

Early in 1680, Khwâja 'Âbid was appointed to pursue prince Muhammad Akbar, along with the prince Shâh 'Âlam (later known as Bahâdur Shâh). As he had already

cause proved extremely useful, in that he succeeded in rallying his countrymen round the standard of Aurangzîb, during the fateful months that followed.

Aurangzîb reached Burhânpur on 19th February, 1658 and remained there for a month, biding his time. Meanwhile, Dârâ Shikûh had acquired virtual supremacy in the State, had taken pledges from Ministers to support his claims for the throne and had closed the roads leading to Bengal, Ahmedâbâd and the Deccan against messengers and travellers. (*Khâfi Khân*, vol. II, p. 4). Aurangzîb succeeded in winning over Murâd to his side, who promised him definitely to join him at Ujjain before attacking the common foe. During his stay in Burhânpur, Aurangzîb granted to Khwâja 'Abid the rank of 3,000 zat, 500 horse, and the title of Khân. (*Ma'âthir ul-Umarâ*, vol. III, p. 121). On the way towards Ujjain he honoured him with a robe of honour, a steed and a jewelled dagger with pearl-inlaid strap. (*'Âlamgîr Nâma*, p. 45.)

On receiving intelligence of the designs of Aurangzîb and Murâd, Dârâ Shikûh directed Râja Jaswant Singh of Mârwar and Qâsim Khân to march to Mâlwa, in order to check their movements. Murâd had joined Aurangzîb at Ujjain. Their combined armies attacked Râja Jaswant Singh who drew up his army on the river Sîpra, in the neighbourhood of Ujjain. After a bloody battle the Râjputs, under command of the Râja, were defeated and dispersed in different directions. The Râja fled and retired to Jodhpur, his capital.

After the successful termination of the battle Khwâja 'Âbid (Khân) was promoted to the rank of four thousand personal, and seven hundred horse, in recognition of his services and the prominent part he played in the campaign. (*'Âlamgîr-Nâma*, p. 76; *Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. III, p. 121). Aurangzîb showed his confidence by asking him, along with Hazbar Khân and Zû'l-Qadar Khân, to remain beside him during his march towards the capital. (*'Âlamgîr-Nâma*, p. 63.)

Khwâja 'Abid was with Aurangzîb when the battle of Samugarh was fought in June, 1658 A.D. which resulted in the defeat of Dârâ Shikûh and the annihilation of his cause. He must have been one of those on whom Aurangzîb bestowed presents 'favouring them with his commendation and eulogy'. (*Khâfî Khân*, vol. II, p. 29). The men who had gained great influence on Aurangzîb, by proving their worth during the battle, were Khwâja 'Âbid, Mukhlis Khân and Munim Khân. They were consulted about every proceeding concerning the impending operations that Aurangzîb undertook to clear the way of his rivals and achieve his aim.

Khwâja 'Âbid served Aurangzîb with distinction, during the first four years of his reign, mainly spent in consolidating and restoring quiet in his newly acquired possessions. He took part in the expeditions sent against Dârâ, Shujâ' and Râja Jaswant Singh and established his reputation as a soldier (*'Âlamgîr-Nâma*, pp. 248, 307). In the fourth year Khwâja 'Âbid was entrusted with the office of Faujdar of Behrat, in the neighbourhood of Alwar, inhabited by turbulent tribes of Meos, whose depredations extended at times to the walls of Delhi. He discharged the duties of this office for nearly a year when he was given the post of Sadr-i-kul (head of religious endowments) in place of Sheikh Mîrak[1] who retired on account of old age. This was an important office as the Sadr-i-kul was considered to be one of the members of the King's ministry through whom passed all the work concerning the charitable grants of lands conferred

[1] Miran Syed Jalâl Bokhârî, better known as Sheikh Mîrak, came to India from Khorâsân, during the reign of Jehângîr. He joined at Lahore, the circle of disciples of Mullâ Abdul Salâm, who was a distinguished man of learning and imparted lessons on *Fiqh* and *Hadîth* for nearly fifty years. Sheikh Mîrak was engaged by Shâhjehân as teacher of the princes. In the 28th year of Shâhjehân's reign he was raised to the rank of 500 zât, 50 horse. When Aurangzîb ascended the throne, he raised him to the rank of 3,000 and in the second year of his reign appointed him to the post of Sadr-i-kul, in place of Syed Hidāyatulla Qādri. Being too old, he could not properly discharge the duties of his office. He retired in 1662 A.D. (1071 H), after two years of official life and died the same year. (*Ma'âthir-ul-Umarâ*, vol. III, p. 519).

IMMEDIATE ANCESTRY OF NIZAM-UL-MULK ASAF JAH I.

BY

YUSUF HUSAIN KHAN

KHWÂJA 'Âbid, grandfather of Nizâm-ul-Mulk, was born in 'Âlî Âbâd, in the neighbourhood of Samarqand, in the kingdom of Bokhârâ. Moving from his native place, he established himself at Bokhârâ, where his talent had greater opportunity of recognition. He was the son of 'Âlam Sheikh, a celebrated man of letters and a well-known Sûfî of his time. The King of Bokhârâ had bestowed on the latter the title of 'Âzam-ul-Ulamâ, which testifies to his being one of the most learned men of the realm. Khwâja 'Âbid's mother was from the family of Mîr Hamdân, a distinguished Syed of Samarqand. 'Âlam Sheikh originally came from Suhraward, a small town in Kurdistân, and traced his descent to Sheikh Shihâbuddîn Suhrawardy, a great spiritual teacher and author of eminent works on Tasawwuf, who in his turn called himself a descendant of Abû Bakr, the First Caliph.[1]

'Âlam Sheikh was reputed to be endowed with spiritual powers. He had numerous disciples all over the kingdom of Bokhârâ to whom he used to prescribe rules of discipline and devotion. He gave religious education to his son Khwâja 'Âbid, who after the death of his father moved to Bokhârâ. His intelligence and ability soon attracted the attention of men in authority there, and he was offered the post of chief Qâzî, which he accepted. A little later he was made Sheikh-ul-Islâm, a very important office in the realm.

Khwâja 'Âbid came to India in 1065 H. (1654–55 A.D.), on his way to Mecca in the twenty-ninth year of the reign of Shâhjehân. He presented himself at the Imperial court where he was received with distinction, invested with a robe of honour and given a purse of six thousand rupees. He was also offered a post in the Imperial service, which he promised to accept after his return from Mecca.

Khwâja 'Âbid came back from the Hajj in 1067 H. (1657 A.D.). He went straight to Aurangzîb in the Deccan, hearing of the dangerous illness of Shâhjehân and the preparations for war made by his sons to contest the throne. Shujâ' and Murâd had already assumed royal titles, but Aurangzîb conducted himself in a more cautious, diplomatic manner. He immediately moved to his northern frontier, leaving the territory of Bîjâpur to be conquered later on, pretending to act in accordance with orders received from the Emperor. This abrupt withdrawal had dispirited his Mughal (Tûrânî) troops who considered themselves to have been deprived of the fruits of their long and arduous exertions. Several Mughal officers, dissatisfied with their lot, deserted him.

At this moment Khwâja 'Âbid desired to join his service. Aurangzîb, considering him an asset, gave him high command over his own men, the Tûrânî soldiery, a very important element in the Imperial army. Khwâja 'Âbid, besides being a learned man, was well-versed in the arts of war. His adhesion to Aurangzîb's

[1] The names in the pedigree are :—

1. Sheikh Shihâbuddîn.
2. Abû Muhammad Hifz.
3. Sheikh Qutb-ul-Aqtâb Zainuddîn.
4. Sheikh 'Ala'uddîn.
5. Sheikh Tajuddîn.
6. Sheikh Fatehullah.
7. Sheikh Najîbullah.
8. Sheikh Jawîd *alias* Sarmast.
9. Sheikh Fatehullah II.
10. Sheikh Jawîd II.
11. Muhammad Darwesh.
12. Sheikh Muhammad Momin.
13. Mîr Muhammad 'Âlam Siddiqi.
14. 'Azizân-i-'Âlam.
15. Khwâja Mîr Ismâîl *alias* 'Âlam Sheikh.
16. Khwâja 'Âbid.

PLATE II
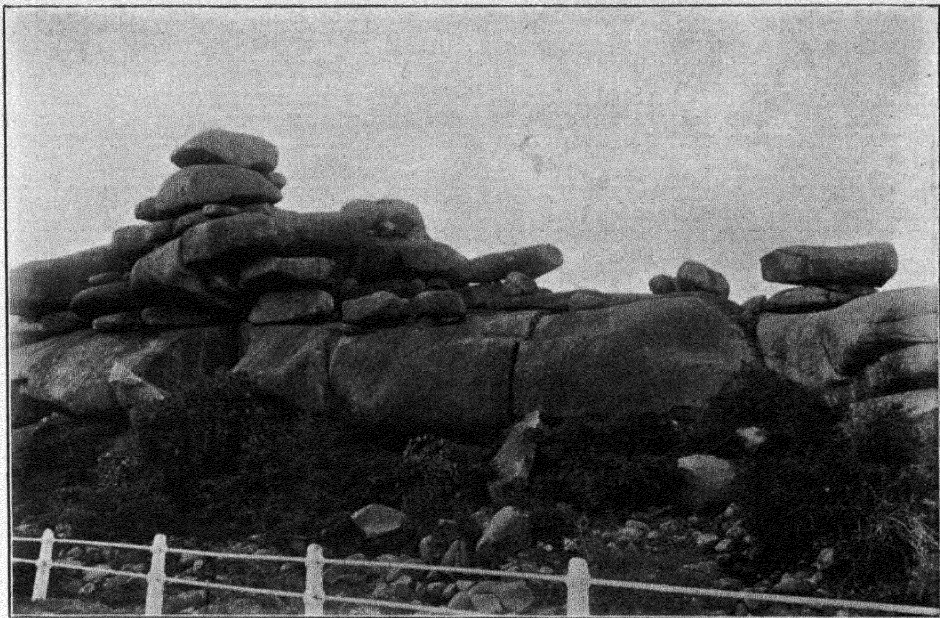
Fig. 1
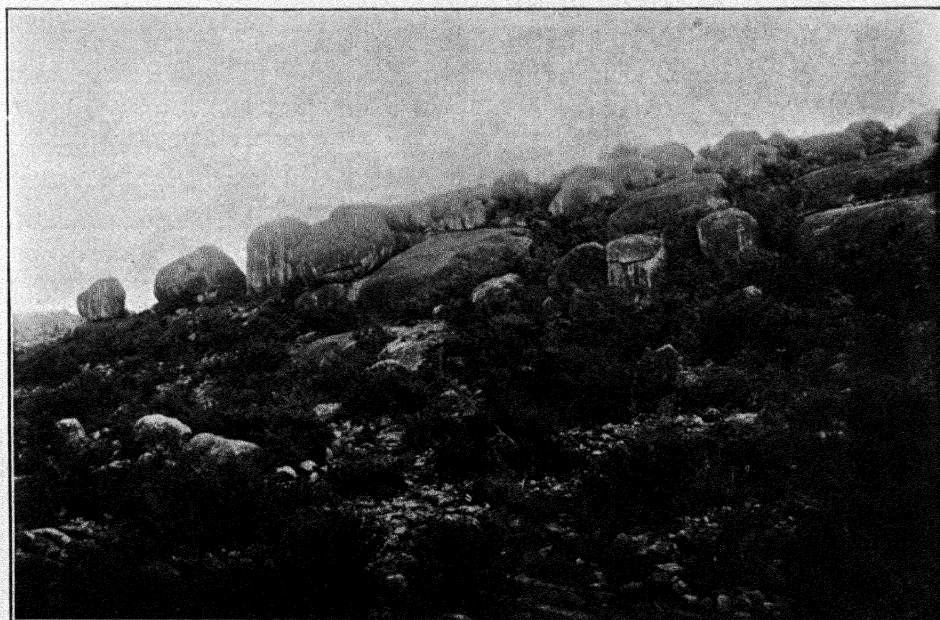
Fig. 2

PLATE I

Fig. 2 Fig. 1
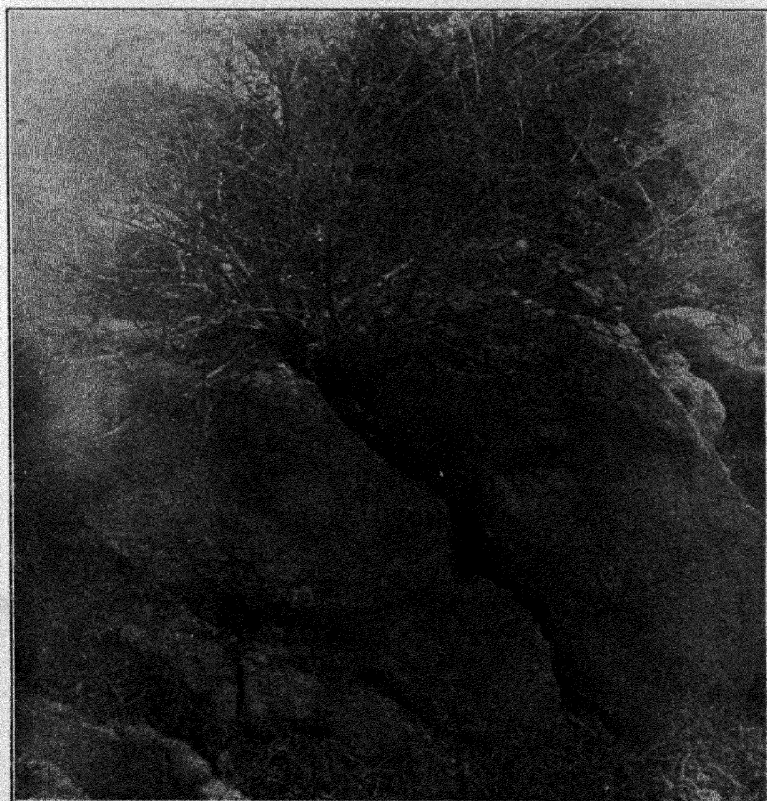
Fig. 3

Specimen (2). Undecomposed trap rock: Sp. gr. 2·6391; colour dark on the whole; quartz and hornblende particles in plenty.

Specimen (3). Somewhat disintegrated rock: Sp. gr. 2·6110; some black undecomposed hornblende and some brown or yellow partially decomposed hornblende with white quartz.

Specimen (4). Much disintegrated rock: Sp. gr. 2·5859; few black particles of undecomposed hornblende, but mostly white quartz and some grey disintegrated hornblende.

It was from such microscopic examination and specific gravity determinations that the action of roots was first surmised (vide *Current Science* vol. I, No. 3, Sept. 1932).

To see how far *Carissa carandus* or the other plants mentioned in Vol. I of this Journal could thrive on the ingredients of the Hyderabad trap rock, on November 3rd 1933, some fresh seedlings of *Carissa carandus* were planted in a pot containing pure pulverized trap rock. They were watered with ordinary tap water. Plate I, figure (1) shows their condition as photographed on 31st May 1934. There can be no doubt whatsoever that the growth has been quite healthy and vigorous.

Figure (2) shows the condition of three somewhat smaller seedlings of the same plant, planted in a pot containing ordinary garden soil on 16th November 1933. The same tap water was used for them also and the two pots were kept always side by side under the same conditions of shade and sunshine. Although it may not be justifiable perhaps to remark from these data that the plant can thrive better on pure pulverized trap rock than in ordinary soil, it would be certainly correct to conclude that the plant will fare no worse.

We bring this paper to a close after illustrating some remarkable cases of the action of roots on igneous rocks. Plate I, figure (3) shows a big granite boulder rent asunder by a sharifa plant (*Anona squamosa*) and altered noticeably in texture and composition. The left portion of the rock seems to have been subject to the action of the roots of plants, now defunct, for a considerable number of years, and is more or less completely altered. The right portion is only partially altered; and one feels almost tempted to state that in due course, when the plant will have used up all the available mineral food from it the rock itself will be reduced completely to sandstone like its left portion. A number of such rocks with their 'tell-tale' looks may be seen occasionally among the hills of Hyderabad.

Plate II, figure (1) depicts the barren and wild-looking rocks close to the 8-mile stone on the way from the Char Minar to Himayat Sauger, leading towards the southern extremity of the lake bund. The plants whose roots were responsible for 'rounding off' the corners of these rocks and for shaping them into their present weird forms, appear to have been washed away by the floods of bygone ages; and one may venture to state that the present configuration would endure for several centuries, unless some of our modern troglodytes take a fancy to the spot and carve out their fashionable abodes among its boulders!

Plate II, figure (2) shows the hill scenery on the opposite side of the road. It is possible that, owing to the same agencies at work, these hills also, if left to themselves, may, in course of time, become as barren and wild as the rocks of figure (1). It would be interesting if, at a centenary meeting of the Osmania University, a future investigator were to refer to the present discourse and examine as to how far the scenery of figure (2) would tend to approach that of figure (1) in general character.

I take this opportunity of thanking Dr. Syed Husain of the Chemistry department for his chemical analysis of the rock specimens above referred to.

FURTHER INVESTIGATIONS CONCERNING THE DISINTEGRATION OF IGNEOUS ROCKS BY THE ACTION OF THE ROOTS OF PLANTS

BY

MOHD. ABDUR RAHMAN KHAN

(With two plates)

I

IN the paper on disintegration of igneous rocks published in Vol. I of this Journal last year it was stated that further investigation was being carried on with reference to the chemical composition of rocks in various stages of disintegration, along with their microscopic examination, etc. The following is a summary of some of the results thus obtained.

CHEMICAL ANALYSIS

(By DR. SYED HUSAIN)

Ingredients	Undecomposed rock		Much decomposed rock (easily breakable)	
	Sample (1)	Sample (2)	Sample (1)	Sample (2)
SiO_2 ...	74·29	74·33	77·02	77·05
$Fe_2O_3 + Al_2O_3$ ...	16·39	16·38	15·96	15·96
CaO ...	2·62	2·60	2·06	2·05
MgO ...	4·98	4·99	4·34	4·35
Alkalies as K_2O ...	1·62	1·59	0·55	0·57
	99·90	99·89	99·93	99·98

Assuming the decomposed rock to have been originally of the same composition as the undecomposed rock the above figures show that there has been a loss of about.—

21·26 per cent of CaO,
12·83 ,, ,, ,, MgO, and
65·11 ,, ,, ,, Alkalies (as K_2O).

This is on the whole what one would expect under the circumstances.

MICROSCOPIC EXAMINATION AND DENSITY, ETC.

(By MOHD. A. R. KHAN)

Specimen (1). Undecomposed trap rock: Sp. gr. 2·6657 (allowing for the usual corrections of buoyancy and temperature); colour, on the whole, reddish black; powder examined under the microscope showed presence of (white) quartz, (black) hornblende and (pink) felspar.

Prof. Zahir-uddin Ahmed, Doctor's Diploma (Cairo)
,, Syed Gulam Mohi-uddin, M.A. (Osmania), Ph.D. (London)
,, Ibne Hasan, M.A. (Allahabad), Ph.D. (London)
,, Mohammed Said-uddin B.Sc. (Bombay), M.A. (Edin.)
,, B. K. Das, D.Sc. (London)

THE BOARD OF RESEARCH, OSMANIA UNIVERSITY COLLEGE.

Chairman

Principal Mohammed Abdur Rahman Khan, B.A. (Madras), A.R.C.S., B.Sc. (London), F.R.A.S.

Hon. Secretary

Prof. Syed Abdul Latif, B.A. (Madras), Ph.D. (London)

OTHER MEMBERS

Prof. Qazi Mohammed Husain, M.A., LL.B. (Cantab.)
,, Mirza Husain Ali Khan, B.A. (Oxon.), *Bar.-at-Law*
,, Abdul Haq, B.A., (Aligarh)
,, Haroon Khan Sherwani, M.A. (Oxon.), *Bar.-at-Law*
,, Rai Kishen Chand, M.A. (Cantab.)
,, Muzaffer-uddin Quraishi, M.A. (Punjab), Ph.D. (Berlin)
,, Mohammed Abdul Qadir Siddiqi, Moulvi Fazil
,, Husain Ali Mirza, *Bar.-at-Law*
,, Mohammed Nizam-uddin, Ph.D. (Cantab.)
,, Abdul Haq, B.Litt., D.Phil. (Oxon.)
,, Wahidur Rahman, B.Sc. (Calcutta)
,, Khalifa Abdul Hakeem, M.A. (Punjab), Ph.D. (Heidelberg)
,, Syed Husain, M.A. (Alig.), Ph.D. (London)
,, Mir Siadat Ali Khan, M.A., LL.B. (Osmania), B.C.L., Ph.D. (Oxon.)
,, R. Subba Rao
,, T. R. Rama Rao, B.A. (Madras)
,, Syed Jaffer Husain, Ph.D. (Heidelberg)
,, C. N. Joshi, M.A. (Bombay)
,, Mir Vali-uddin, M.A. (Alig.), Ph.D. (London), *Bar.-at-Law*
,, Syed Mohammed Ali Khan, B.A. (Osmania), A.R.C.S., B.Sc. (London)
,, Mohammed Razi-uddin Siddiqi, M.A. (Cantab.), Ph.D. (Leipzig)
,, Qari Syed Kalimullah Husaini, M.A., LL.B. (Osmania), Ph.D. (London)

FOREWORD

While issuing the Second Volume of the Journal of the Osmania University College, I may, on behalf of the Board of Research, express our sense of gratification at the very hearty and generous reception given to the First Volume by scholars both in India and abroad. We trust that this Volume also will be received with equal appreciation.

The members of the Board have during the last three years endeavoured to serve the cause of research in the different branches of learning with the material that has been at their disposal, so far, within the walls of the Osmania University. As years will advance, and further resources will accumulate, it is hoped that the Journal will be a means of dissemination of knowledge worthy of the aims with which the University was founded.

In bringing the Journal to this standard, my colleagues Moulvi Abdul Haq, Professor of Urdu, and Dr. Syed Abdul Latif, Professor of English, have given me invaluable help as its joint issuers. Dr. Latif has been the Honorary Secretary of the Board from the time of its formation. He has applied to the regular work of the Board, consisting of the selection of candidates for research scholarships and the control of their work, his pleasing vigilance, and to the conduct of the Journal his own love of research and his sense of discrimination. I take this opportunity to place on record the willing co-operation I have had from these two colleagues.

MOHD. ABDUR RAHMAN KHAN.

A note on the Ancient Mariner 59

By E. E. Speight, B.A. (London), *Professor of English.*

"The Reduction of Carbonic Acid by means of Nascent Hydrogen" .. 67

By M. Qureshi, M.A., (Punjab), Ph.D. (Berlin), *Professor of Chemistry, and N. H. Effendi.*

The Veda and the Geeta 74

By G. Dhareshver, B.A. (Madras), *Assistant Professor of Sanskrit.*

CONTENTS

PAGE

Foreword by the Principal v

List of Members of the Board of Research vii

Further Investigations Concerning the Disintegration of Igneous Rocks by the Action of the Roots of Plants 1

By Mohd. Abdur Rahman Khan, A.R.C.S., B.Sc. (London), F.R.A.S., *Principal.*

Immediate Ancestry of Nizam-ul-Mulk Asaf Jah I 3

By Yusuf Husain Khan, D.Litt. (Paris).

The Meteorite Falls of 1928 near Purna 22

By Mohd. Abdur Rahman Khan, A.R.C.S., B.Sc. (London)., F.R.A.S., *Principal.*

"On a Fourth Order Partial Differential Equation 24

By Raziuddin Siddiqui, M.A. (Cantab), Ph.D. (Leipzig), *Assistant Professor of Mathematics.*

The Pragmatist Elements in the Philosophy of Bergson 31

By Mir Valiuddin, M.A. (Alig.), Ph.D. (London), *Assistant Professor of Philosophy.*

Percarbonates 39

By Rangnath Rao Kamtikar, and Syed Husain, M.A. (Alig.), Ph.D. (London), *Professor of Chemistry.*

A Nitrogen Derivative of the Cyclopentane Series. Synthesis and Constitution of Ethyl-5-Cyclopentane-Spirodicyclopentane-1: 2-Dicarboxyimide-3-Ketimino-4-Carboxylate 41

By Kazi Moinuddin.

'Ibn-i-Sina 47

By Mu'Tazid Wali-'ur-Rahman, M.A., *Assistant Professor of Philosophy.*

On the Equalisation of the Interval of Liquid Drops falling through Two Capillary Tubes 56

By S. M. A. Khan and K. S. Iyengar.

JOURNAL

OF

OSMANIA UNIVERSITY COLLEGE

ISSUED

ON BEHALF OF THE COLLEGE RESEARCH BOARD

BY

MOHAMED ABDUR RAHMAN KHAN

MOULVI ABDUL HAQ

SYED ABDUL LATIF

VOLUME II

PUBLISHED

BY

THE OSMANIA UNIVERSITY COLLEGE RESEARCH BOARD

HYDERABAD-DECCAN

1934